شمع فروزاں

(تیسرا حصہ)

اردو کے سب سے کثیر الاشاعت روز نامہ ''منصف'' حیدرآباد اور ملک کے دوسرے معروف اردو اخبارات میں شائع ہونے والے مقبول عام وخاص کالم کے تین سال (9-2007) کے مضامین کا مجموعہ، جس میں ملکی وبین ملکی پس منظر میں نئے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل پر بصیرت افروز گفتگو کی گئی ہے، دلآویز اُسلوب، عام فہم زبان اور دلچسپ طرزِ بیان۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

بہ اہتمام : المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

ناشر : کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، ضلع سہارنپور (یوپی)

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ

طبع اوّل : ۲۰۱۰ء ، ۱۴۳۱ھ

نام کتاب : شمع فروزاں (تیسرا حصہ)

مصنف : حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ترتیب وکمپوزنگ : مفتی محمد عبداللہ سلیمان مظاہری

قبا گرافکس،فون:9704172672 - 91+

اشاعت : ۲۰۱۰ء

صفحات : ۲۹۰

قیمت : ....روپے

بہ اہتمام : المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد (انڈیا)

ملنے کے پتے

- المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد،تعلیم آباد،قبا کالونی، پہاڑی شریف روڈ،حیدرآباد
- مکتبہ نعیمیہ، دیوبند، ضلع سہارنپور (یوپی)
- دکن ٹریڈرس، مغل پورہ، حیدرآباد
- ہندوستان پیپر ایمپوریم، مچھلی کمان، چار مینار، حیدرآباد

فہرست مضامین

گردوپیش

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

راقم الحروف کو ۱۹۹۹ء سے روز نامہ ''منصف''میں ایک خصوص کالم ''شمع فروزاں'' کے عنوان سے لکھنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے، اس کالم میں یہ حقیر زیادہ تر بین الاقوامی، قومی وعلاقائی سطح پر پیدا ہونے والے نئے مسائل، نیز سماجی اور اخلاقی پہلوؤں کی مناسبت سے قابل توجہ موضوعات پر کتاب وسنت اور شریعت اسلامی کی روشنی میں لکھنے کی کوشش کرتا ہے، یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ اس کالم کو خاصی پذیرائی حاصل ہے، روز نامہ ''منصف'' کے علاوہ بمبئی سے روز نامہ ''انقلاب''اور دہلی سے روز نامہ ''ہندوستان ایکسپریس'' بھی اسے ہر جمعہ شائع کرتا ہے۔

شروع ہی سے قارئین کی طرف سے تقاضا رہا ہے کہ ان مضامین کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے، چنانچہ ۲۰۰۳ء تک کے مضامین ''راہ عمل'' کے عنوان سے پانچ جلدوں میں فرید بکڈ پو، دہلی سے شائع ہو چکے ہیں، پھر ۲۰۰۴ء — ۲۰۰٦ء کی تحریریں دو جلدوں میں ''شمع فروزاں'' ہی کے نام سے ''کتب خانہ نعیمیہ دیوبند'' سے طبع ہو چکی ہیں، اب ۲۰۰۷ء — ۲۰۰۹ء کے مضامین، ''شمع فروزاں'' کی تیسری اور چوتھی جلد میں شامل ہیں، —— البتہ سیرت نبوی، مسلم پرسنل لا اور جدید مسائل پر تفصیلی مقالات کو اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے، سیرت سے متعلق مضامین ان شاء اللہ راقم الحروف کے مجموعۂ مضامین ''پیام سیرت —— عصر حاضر کے پس منظر میں'' کا حصہ بنیں گے، جدید مسائل سے متعلق تفصیلی مقالات ''جدید فقہی مسائل'' میں شامل ہوں گے اور مسلم پرسنل لا سے متعلق مضامین اچھے خاصے ہو گئے ہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ مستقل کتاب کی صورت میں ان کی اشاعت عمل میں آئے گی، شمع فروزاں کی ان دونوں جلدوں کو لے کر ان مضامین کی نو جلدیں مکمل

ہو چکی ہیں، یہ بات خود میرے لئے بھی باعث حیرت ہے اور اس سے بڑھ کر مقام شکر۔

اللہ تعالیٰ جزاء خیر عطا فرمائے عزیزی مولانا محمد عبداللہ سلیمان مظاہری سلمہ کو — جنہوں نے المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں تخصص فی الفقہ کیا ہے اور اس کے شعبۂ تحقیق میں بھی خدمت انجام دی ہے — کہ انہوں نے ان مقالات کی کمپوزنگ بھی کی ہے اور انہیں ترتیب بھی دیا ہے، نیز یہ کام انہوں نے محبت، خوش سلیقگی اور بیدار مغزی کے ساتھ انجام دیا ہے، **فجزاه الله خير الجزاء** ۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ دوسرے مجموعوں کی طرح اسے بھی قبول فرمائے اور لوگوں کو اس سے نفع پہونچائے، **والله هو المستعان** ۔

خالد سیف اللہ رحمانی
بیت الحمد، قبا کالونی
شاہین نگر، حیدرآباد

۱۱ جمادی الثانیہ ۱۴۳۱ھ
۲۵/ جون ۲۰۱۰ء

شمع فروزاں

دعوت و تعلیم

مادری زبان کی تعلیم

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن صلاحیتوں سے نوازا ہے، ان میں ایک اہم اور امتیازی صلاحیت بیان واظہار کی ہے، دنیا کی دوسری مخلوقات آواز تو نکال سکتی ہیں؛ لیکن وہ اپنی آواز کو الفاظ کے پیکر میں ڈھالنے سے قاصر ہیں، الفاظ ہی کے مجموعہ کا نام ''زبان'' ہے، اللہ تعالیٰ نے دنیا کی چیزوں میں تنوع رکھا ہے، کوئی گورا ہے تو کوئی کالا اور کوئی سانولا، کسی کا قد اونچا ہے تو کسی کا درمیانہ تو کسی کا پست، مزاج و ذوق میں بھی فرق رکھا گیا ہے، اسی تنوع اور رنگارنگی سے کائنات کا حسن ہے، اگر سارے پھول گلاب ہی کے ہوتے تو گلستاں بے رونق نظر آتے، اگر تمام پھلوں میں آم ہی کی سی مٹھاس ہوتی، تو وہ لوگوں کے لیے بے لطف ہو جاتے، اور اگر ساری دنیا ایک ہی رنگ کا لباس پہنتی تو نگاہ کے لیے لطف ولذت کا کوئی سامان نہیں ہوتا، جیسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں رنگ وروپ کا تنوع رکھا ہے اور اپنی اس کائنات کو مختلف رنگوں سے سجایا ہے، اسی طرح انسان کی زبان میں بھی تنوع رکھا گیا ہے، آج دنیا بھر میں کئی سو زبانیں بولی جاتی ہیں، بہت سی زبانیں وہ ہیں جو ماضی کا افسانہ بن چکی ہیں، اور بہت سی آج زندہ ہیں اور ہوسکتا ہے کہ کل زندہ نہ رہیں۔

انسان کی ایک فطرت یہ ہے کہ جس چیز سے اس کا خاص تعلق ہو، اس کی محبت اس کے دل میں بڑھ جاتی ہے، پوری دنیا اللہ ہی کی بسائی ہوئی ہے؛ کیوں کہ انسان جہاں پیدا ہوتا ہے اور جہاں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گذارتا ہے، اس خطہ سے اسے خاص اُنس ہوتا ہے، یوں تو تمام انسان بھائی بھائی ہیں؛ لیکن جس سماج میں اس کی نشو ونما ہوتی ہے، جن رشتہ داروں اور عزیزوں کے درمیان اس کی زندگی گذرتی ہے، ان سے محبت کا خصوصی تعلق ہو جاتا ہے، یہی معاملہ زبان کا بھی ہے، جس زبان کو انسان بچپن سے بولتا ہے، اس زبان سے ایک خاص محبت ہوتی ہے، اس کا اندازہ خاص کر اس وقت ہوتا ہے، جب آپ کسی ایسے علاقہ میں چلے جائیں جہاں آپ کی زبان بولنے والے

لوگ نہ ہوں اور کوئی آپ کا ہم زبان مل جائے ، اس وقت ایسی مسرت اور خوشی ہوتی ہے کہ بعض اوقات اپنے قریبی رشتہ داروں سے ملنے میں بھی ایسی مسرت نہیں ہوتی ہے۔

اسلام نے کسی زبان کے ساتھ تعصب اور تنگ نظری کا معاملہ نہیں کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: زبانیں اللہ کی مخلوق ہیں ، پس جب اللہ کی مخلوق کے لیے توقیر واحترام کا حکم ہے اور تحقیر کی ممانعت ہے، تو یہی حکم زبانوں کا بھی ہوا کہ انسان کسی زبان کو حقیر نہ سمجھے اور اس کی بے توقیری نہ کرے؛ کیوں کہ زبان تو محض ذریعۂ اظہار ہے، اس کو معروف کی دعوت کا وسیلہ بھی بنایا جا سکتا ہے اور منکر سے روکنے کا ذریعہ بھی ، آپ ﷺ کی ہدایت پر آپ کے بعض رفقاء نے عبرانی زبان سیکھی ، بعض صحابہ نے فارسی زبان سیکھی ؛ اسی لیے مسلمانوں نے کسی زبان کے ساتھ تعصب اور بے توقیری کا معاملہ نہیں کیا ، جب ایران فتح ہوا تو وہاں کی زبان فارسی تھی ، مسلمانوں نے کبھی اس زبان کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی ؛ بلکہ اس کو صالح لٹریچر کی زبان بنا دیا ، ہندوستان میں کم وبیش ایک ہزار سال مسلمانوں کی حکومت رہی ، اس کے باوجود اس ملک میں جو زبانیں بولی جاتی تھیں وہ سب باقی رہیں اور انہوں نے ترقی کی منزلیں طے کیں۔

لیکن جیسے انسان پر اپنے خصوصی متعلقین کے حقوق نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں، اسی طرح ہر شخص پر اپنی اصل زبان کے حقوق نسبتاً زیادہ ہوں گے، اور اصل زبان سے میری مراد ہے مادری زبان، لوگوں نے مادری زبان کی مختلف تعریفیں کی ہیں ؛ لیکن ان میں جو تعریف سب سے زیادہ موزوں ہے، وہ یہ ہے کہ جس زبان کو کسی سے سیکھنا نہ پڑے ؛ بلکہ انسان خود بہ خود بولنے لگے، وہی اس کی مادری زبان ہے، اس زبان کی نسبت ماں (Mother) کی طرف اس لیے کی جاتی ہے کہ ماں کی گود ہی بچہ کی پہلی درس گاہ ہے، اس درس گاہ سے وہ اخلاق بھی سیکھتا ہے اور وہ پہلی زبان بھی جسے وہ استاذ اور کتاب کی مدد کے بغیر بولنے لگتا ہے ، ۲۱ رفروری کی تاریخ اقوام متحدہ کی طرف سے ''یوم مادری زبان'' کے طور پر منائی جاتی ہے، جو ابھی ابھی گذری ہے، دن منانے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنی مادری زبان کو بھول نہیں جائیں ، بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی زبان کا رشتہ علوم وفنون سے کٹ جائے یا معیشت اور روزگار سے اس کا تعلق باقی نہ رہے، تو لوگ اپنی زبان کو آپ بھلا دیتے ہیں، یہ دراصل خود فراموشی کی بات ہے!

مسلمانان ہند کو آج جو زبان مربوط رکھتی ہے، وہ بڑی حد تک ''اردو'' زبان ہے، ایک دو ریاستوں کو چھوڑ کر پورے ملک کے مسلمان اس زبان کو سمجھتے ہیں، اس زبان کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے؛ بلکہ شاید دنیا کی زبانوں میں سب سے کمسن زبان ہے؛ لیکن اس کے باوجود یہ دنیا کی دس سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں ایک ہے، اس کی پیدائش تو ہندوستان میں ہوئی؛ لیکن آج یہ ایک عالمی زبان کی حیثیت رکھتی ہے، ہندوستان کی ریاست جموں وکشمیر اور پڑوسی ملک پاکستان میں اسے سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے، برطانیہ، موریشس اور بعض اور ملکوں میں سرکاری تعلیم گاہوں میں ثانوی زبانوں کی حیثیت سے اس کی تعلیم ہوتی ہے، سعودی عرب اور عرب امارات سے اردو کے کثیر الاشاعت اخبارات شائع ہوتے ہیں، جو پورے خلیج میں پہنچتے ہیں، برطانیہ میں کم سے کم پانچ اردو روزنامے شائع ہوتے ہیں، ماہ نامہ وغیرہ اس کے علاوہ ہیں، امریکہ میں بھی سنا ہے کہ اردو رسائل وجرائد شائع ہوتے ہیں، ہندو پاک کے تارکین کی کثرت کی وجہ سے مغربی ممالک میں اردو بولنے اور سیکھنے والوں کی بڑی تعداد ہے؛ اس لیے اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اردو اب ایک عالمی زبان بن چکی ہے۔

یوں تو زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اہل نظر کو معلوم ہے کہ اردو زبان کا گرامر سب سے پہلے انگریزوں نے مرتب کیا، اردو لغت انگریزوں نے مرتب کی، اردو پریس انگریزوں نے قائم کیا، چک بست نسیم، آنند نرائن ملا، رگھو پتی سہائے فراق، کرشن چندر، راجہ کشن پرشاد، جگن ناتھ آزاد، وغیرہ جیسے اردو کے چوٹی کے نثر نگار اور شعراء ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زبان کی بھی اپنی ایک ثقافت ہوتی ہے، جو غیر محسوس طریقہ پر انسان پر اثر انداز ہوتی ہے، اردو زبان کی ثقافت اسلام سے مربوط رہی ہے، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ہمارے ہندو بھائی بھی جب اردو میں قلم اٹھاتے ہیں تو ''**ماشاء اللہ ، سبحان اللہ ، الحمد للہ ، السلام علیکم**'' ان کے نوک قلم پر ہوتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اردو چونکہ زبانوں کا گلدستہ ہے، گو اس کے قواعد زیادہ تر ہندی سے مطابقت رکھتے ہیں؛ لیکن الفاظ اس میں عربی، فارسی، سنسکرت، ترکی اور انگریزی وغیرہ کے بھی کثرت سے شامل ہیں، عربی الفاظ کی شمولیت کی وجہ سے قرآن مجید کی اصطلاحات وتعبیرات بھی

اصل صورت میں یا تبدیلی کے ساتھ بہ کثرت پائی جاتی ہیں، مثال کے طور پر سورۂ فاتحہ ہی کو لے لیجئے: حمد، رب، عالم، رحمت، مالک، یوم، دین، عبادت، اعانت واستعانت، ہدایت، صراط، انعام، غضب، ضلالت کے الفاظ اردو زبان میں مستعمل ہیں؛ اسی لیے قرآن مجید کو پڑھنے میں انہیں اجنبیت کم محسوس ہوتی ہے، اوراس کا سمجھنا بھی ان کے لیے آسان ہوتا ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے اس حقیر نے ایک موقع سے حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کا قول سنا کہ قرآن مجید کے ساٹھ فیصد الفاظ کسی نہ کسی انداز میں اردو زبان میں استعمال ہوتے ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ مزید جو چالیس فی صد الفاظ ہیں ان کو بھی کوشش کر کے اردو میں داخل کر دیا جائے؛ تاکہ قرآن کے صد فی صد الفاظ اردو میں آجائیں۔

تیسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اسلامی علوم — تفسیر وحدیث، فقہ وعقیدہ، تصوف واخلاق، سیرت نبوی، سیر صحابہ وتابعین، تذکرۂ اولیاء وصالحین وغیرہ — کا جتنا بڑا سرمایہ اردو زبان میں موجود ہے، عربی زبان کے بعد کوئی اور زبان اس سے مالا مال نہیں؛ اس لیے اردو زبان نئی نسل کو پڑھانے کا مطلب ان کو ایک عظیم اسلامی ورثہ سے جوڑنا ہے، اور اردو تعلیم سے ان کو محروم کرنا اپنے دینی ورثہ سے ان کا رشتہ کاٹ دینا ہے۔

اس لیے مادری زبان کے عنوان سے منائے جانے والے اس خصوصی دن کے پس منظر میں ہمیں اپنے بچوں کی اردو تعلیم کی طرف توجہ دینی چاہیے، اگر ہم لوگوں سے کہیں کہ وہ اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکولوں ہی میں پڑھائیں تو شاید موجودہ حالات میں لوگوں کے لیے اس پر عمل کرنا دشوار ہوگا؛ کیوں کہ بہت سے مقامات پر اردو میڈیم اسکول نہیں ہیں، اور جہاں ہیں وہاں خستہ سامانی کا شکار ہیں، ٹیچر کم ہیں، عمارت مخدوش ہے، فرنیچر ناقص ہے، کہیں کہیں تو بچھانے کے لیے فرش تک موجود نہیں، نصابی کتابیں دستیاب نہیں ہیں اور بہت سی جگہ ان ناقص سہولتوں کا فائدہ اساتذہ اس طرح اٹھاتے ہیں کہ طلبہ کی آنکھیں ان کو دیکھنے کے لیے ترستی ہیں، اس صورت حال میں لوگوں کو مشورہ دینا کہ وہ اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکول ہی میں پڑھائیں، ایک حقیقت ناشناس مشورہ ہوگا۔

لیکن ہم اپنی مادری زبان کا حق اس طرح ضرور ادا کر سکتے ہیں کہ گھروں میں اپنے بچوں کی

اردو تعلیم کا نظم کریں، ہم اپنے بچوں کو ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو زبان کے انتخاب کا مشورہ دیں، ہم روزمرہ بول چال کی زبان اردو کو بنائیں، ہم اردو میں اپنے خطوط اور نجی امور لکھا کریں، ہم اردو ذریعۂ تعلیم کے معیاری اسکول قائم کریں، جو انگلش میڈیم اسکول مسلمانوں کے زیر انتظام میں وہاں بھی اردو تعلیم کے لیے اچھے مدرس رکھیں، ہم اردو اخبارات و رسائل خریدا کریں، اردو کتابیں اور خاص کر دینی کتابوں سے اپنے گھر کی الماریوں کو سجائیں، اور گھر کے لوگوں کو ان کے پڑھنے کی ترغیب دیں، اس طرح ہم اپنی زبان کی حفاظت کر سکیں گے، اور زبان کے واسطہ سے نئی نسل کو اپنے دین اور اپنی ثقافت سے مربوط رکھ سکیں گے، ہمیں اسرائیل سے سبق لینا چاہیے کہ عبرانی زبان کتنے طویل عرصہ تک ایوانِ اقتدار سے باہر رہی، اس زبان کا تعلق علوم وفنون سے کٹ گیا، معیشت اور روزگار سے اس کا کوئی رشتہ نہیں رہا، اس کے باوجود اپنی مذہبی حمیت کی وجہ سے نجی طور پر یہودیوں نے اس زبان کو محفوظ رکھا اور آج یہ اسرائیل کی سرکاری زبان ہے!

۲۳/فروری ۲۰۰۷ء

تعلیم یا تخریب؟

لغت میں علم کے معنی اَن جانی باتوں کو جاننے کے ہیں، اس لحاظ سے تعلیم کے معنی ہوئے اَن جانی باتوں کو بتانا اور ان سے واقف کرانا، اس لحاظ سے ہر ایسی بات بتانے کا نام 'تعلیم' قرار پاتا ہے، جس سے وہ پہلے سے آگاہ نہیں رہا ہے، یہ بات اچھی ہو یا بری اور فائدہ مند ہو یا نقصان دہ؛ لیکن اصطلاح میں ہر بات سے واقف کرانے اور واقف ہونے کو تعلیم وتعلم نہیں کہا جاتا؛ بلکہ ایسی باتیں سیکھنے اور سکھانے کو تعلیم کہا جاتا ہے جس کا مقصد صالح ہو، جس سے انسان کا نفع متعلق ہو اور جس سے شخصیت کی تعمیر مقصود ہو، مثلاً کوئی شخص چوری کرنا اور ڈاکہ ڈالنا سکھائے تو اسے تعلیم نہیں کہیں گے، ہاں، اگر چوری کرنے اور ڈاکہ ڈالنے کے مفاسد بتائے جائیں؛ تاکہ لوگوں کو ایسے جرائم سے بچنے پر آمادہ کیا جائے تو اسے تعلیم کہنا درست ہوگا؛ کیوں کہ پہلی صورت تخریب پر مبنی ہے اور دوسری صورت تعمیر پر، اگر کسی درسگاہ میں انسانوں کو قتل کرنے کی تلقین کی جائے اور اس کے طریقے بتائے جائیں تو یہ علم پہنچانا اور علم حاصل کرنا نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ تو انسانی سماج کے لیے زہر ہے، اس کے برخلاف اگر قتلِ انسانی کے شرور ومفاسد واضح کئے جائیں اور انسان کو بتایا جائے کہ سماج کو ظلم وبربریت سے بچانا چاہیے، تو یہ یقیناً 'تعلیم' ہے، غرض کہ ہر کھوج اور تحقیق کا نام علم نہیں، ٹھیک اسی طرح جیسا کہ کھایا زہر بھی جاتا ہے؛ لیکن اسے کھانا نہیں کہتے۔

رسول اللہ ﷺ نے اسی حقیقت کو علمِ نافع اور علمِ غیر نافع کی جامع اور معنی خیز تعبیر سے واضح فرمایا ہے، آپ ﷺ نے محض علم کی دعا نہیں فرمائی، علمِ نافع کی دعاء فرمائی اور ایسے علم سے خدا کی پناہ چاہی جو نافع نہیں ہو، جو علم انسان کو سنوارنے کے بجائے بگاڑتا ہو، جو علم انسانیت کے چہرے کو آراستہ کرنے کے بجائے داغ دار کرتا ہو، جو علم صحت وشفاء کے بجائے بیماری کا

باعث بنتا ہواور جس علم سے سماج میں محبت کی شبنم برسنے کے بجائے بداخلاقی کے شعلے بھڑکتے ہوں، وہ علم علم نہیں، جہل ہے، اس کا سکھانا، پڑھنے والوں کو عالم ودانشور بنانا نہیں ہے؛ بلکہ جاہل وبے دانش بنانا ہے۔

اس وقت ہندوستان میں یونیسیف (Unicef) اور ورلڈ پاپولیشن فنڈ کی تحریک پر اسکول کے طلبہ کے لیے 'تعلیم برائے نوبلوغیت' شروع کی جارہی ہے، اس خوبصورت عنوان کے تحت اصل میں جنسی تعلیم دینا مقصود ہے، جنسیات کی تعلیم اصل پروگرام کے تحت KG سے لے کر انٹر تک کے طلبہ وطالبات کو دی جائے گی، تاہم پہلے مرحلہ میں چھٹی جماعت سے بارہویں جماعت تک کو ہدف بنایا گیا ہے اوراس کے لیے نصابی کتابوں کی ترتیب کا کام شروع ہو چکا ہے، حکومت کا ارادہ ہے کہ پہلے سنٹرل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن (CBSE) کے تحت چلنے والے آٹھ ہزار اسکولوں میں جون ۲۰۰۷ء سے یہ تعلیم شروع کردی جائے، نیز مرکزی وزارت فروغ انسانی وسائل ریاستی حکومتوں پر بھی زور دے رہی ہے کہ وہ اپنے تحت چلنے والے اسکولوں میں اس تعلیم کو جلد از جلد شروع کریں، یونیسیف کا کہنا ہے کہ اس تعلیم کا مقصد HIV اور ایڈس کی وباء کو روکنا ہے۔

اس تعلیم کے خد وخال کیا ہوں گے اور بچوں کے اخلاق پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اس کو جاننے کے لیے وہ کتابیں کافی ہیں جو''یووا''(نوجوان) کے نام سے مرتب کی گئی ہیں، اس کا پہلا حصہ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت میں شاملِ نصاب کیا گیا ہے، اس کتاب میں دہلی سے نکلنے والے ایک ماہنامہ کی رپورٹ کے مطابق چھٹی جماعت کے بچوں کے لیے خوبصورت چارٹ کے ذریعہ مرد وعورت کے صنفی اعضاء کو دکھایا گیا ہے، بلکہ طلبہ وطالبات سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی نوٹ بک میں اس تصویر کو اتاریں، ساتویں کلاس کے طلبہ وطالبات کو کنڈوم کے استعمال کا طریقہ بتایا گیا ہے، مرد وعورت کے صنفی تعلق کو واضح کیا گیا ہے اور غیر فطری طریقے بھی بتائے گئے ہیں، اوران کو ایسی تدبیروں کی رہنمائی کی گئی ہے کہ وہ بیماری سے بچتے ہوئے ان کا استعمال کرسکیں، آٹھویں جماعت کے طلبہ وطالبات کو رنگین چارٹ کے ذریعہ تولیدی نظام سمجھایا گیا ہے اور صنفی اعضاء کے نام یاد دلائے گئے ہیں، اس طرح کی بعض اور

ایسی باتیں ہیں جن کا ذکر بھی بار خاطر ہے، پھر اس مقصد کے لیے اساتذہ کو خصوصی تربیت دی جارہی ہے اور اس بات کی بھی تلقین کی جاتی ہے کہ یہ تعلیم مخلوط ماحول میں دی جائے ، طلبہ و طالبات کو ایک دوسرے سے قریب کر کے بیٹھایا جائے ، اوران مضامین کی وضاحت میں شرم و عار کو بالکل راہ نہ دی جائے۔

غور کیجئے یہ تعلیم انسانیت کی تعمیر کرے گی یا تخریب؟ اس سے طلبہ و طالبات میں بہتر اخلاق پیدا ہوں گے یا بد اخلاقی کا دور دورہ ہوگا؟ یہ ایڈس کو روکنے کا ذریعہ ثابت ہوگا یا مزید اس کے پھیلاؤ کا سبب بنے گا؟ اور کیا اس کو تعلیم کہنا بھی درست ہے؟؟ اس بات پر ساری دنیا متفق ہے کہ عفت و پاکیزگی ایڈس سے بچاؤ کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے، زنا اور غیر فطری طریقہ پر جنسی لذت اندوزی ایڈس کا بنیادی سبب ہے، مغربی تہذیب لذت پرستی میں اس قدر آگے بڑھ گئی ہے کہ اس نے فطرت کی ساری حدیں توڑ دی ہیں، نکاح کو بوجھ سمجھ لیا گیا ہے، آزادانہ جنسی تعلق کو ہر شخص کا حق تسلیم کر لیا گیا ہے، مسلّمہ مذہبی اور اخلاقی حدود کو فرسودہ اور از کار رفتہ قرار دے کر انہیں دقیانوسیت سمجھا جارہا ہے، وہ اس بے سمت سفر میں اتنا آگے جا چکے ہیں کہ ان کے لیے واپسی دشوار ہوگئی ہے، اب وہ اس موقف ہی میں نہیں ہیں کہ اپنی قوم کو عفت و پاکدامنی اور آبرومندی کی دعوت دے سکیں؛ اس لیے انہوں نے '' جائز جنسی تعلق'' پر اکتفا کرنے کی دعوت دینے کے بجائے ''محفوظ جنسی تعلق'' کا نعرہ لگایا ہے، اس کے لیے نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی جنسی افعال کے بارے میں تفصیل بتائی جاتی ہے اور پھر اس کو اس طریقہ پر انجام دینے کی تلقین کی جاتی ہے کہ بدکاری پر تو کوئی روک نہیں لگے؛ البتہ بیماری سے بچانے کی کوشش کی جائے، ہمارے لیے سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم اپنے سماج کو مغرب کے حیا باختہ سانچہ میں ڈھالنا چاہتے ہیں یا ہمیں یہ پسند ہے کہ آئندہ ہماری نسلیں شرم وحیاء کا لباس اتار پھینکیں اور آزادی و روشن خیالی کے نام پر عصمت وعفت کے تار تار بکھیر دیں؟

کسی بھی تعلیم کے مفید اور نتیجہ خیز ہونے کے لیے وقت کا انتخاب بڑی اہمیت کا حامل ہے ، اگر پرائمری اور مڈل سطح پر میڈیکل اور انجینیر نگ کی اعلیٰ تعلیم دی جانے لگے، تو یقیناً یہ بے وقوفی کہلائے گی، انسانی زندگی بھی مختلف ادوار سے گذرتی ہے اور ہر دور کے اپنے اپنے تقاضے

ہوتے ہیں، بچپن کو خدا نے ایک خاص طرح کی معصومیت دی ہے، بچوں کا ذہن سادہ اور جنسی تصورات سے خالی رہتا ہے، ایسی صورت میں جنسی تعلیم ان کے ذہن کو پراگندہ کردے گی، کسی چیز کی واقفیت اس کی حرص کو جگاتی ہے، جب چھوٹے بچے —— جن کا ذہن سادہ تختی کی طرح ہوتا ہے—— اگلی منزلوں کے بارے میں سنیں گے تو اس سے تجسس پیدا ہوگا، وہ ان معلومات کو تجربہ میں لانا چاہیں گے اور اس طرح برائی کا راستہ کھلے گا، اور جو طلبہ وطالبات جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے ہیں، جب وہ ایک ساتھ ان مضامین کو پڑھیں گے، ان کی تصویریں بنائیں گے، اس پر باہم مذاکرت کریں گے، تو آپ سے آپ حیا کی دیواریں منہدم ہوتی چلی جائیں گی اور پھر برائی کے لیے کوئی روک ٹوک باقی نہیں رہے گی، جیسا کہ اس وقت مغربی معاشرہ کی صورت حال ہے، پھر یہ مضامین پڑھانے والے مرد یا عورت اساتذہ ہوں گے اور پڑھنے والوں میں مخالف جنس کے طلبہ وطالبات ہوں گے، اس سے اندیشہ ہے کہ پیشۂ تدریس کا تقدس بھی پامال ہوکر رہ جائے اور اساتذہ اور شاگردوں کے پاکیزہ رشتہ کے مجروح ہونے کے واقعات بڑھ جائیں۔

جنسی افعال ایک فطری عمل ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ فطرت خود اسے سکھاتی ہے، جیسے کسی بچہ کو ماں کے سینے سے دودھ پینے، بھوک لگنے پر رونے اور خوش ہونے پر ہنسنے کی تعلیم نہیں دی جاتی؛ بلکہ معلم فطرت خود بچہ کو سکھا دیتا ہے، اسی طرح جنسی افعال عمر کی ایک حد پر پہنچنے کے بعد از خود انسانی شعور کا حصہ بن جاتے ہیں، اس کے لیے تعلیم وتعلم کی ضرورت نہیں، ہاں، جب لڑکے اور لڑکیاں جوانی کے قریب پہنچ جائیں تو انہیں اس طرح بعض امور کی تعلیم دی جاسکتی ہے کہ وہ تعمیر اخلاق کا سبب بنے، جیسے انہیں بے عفتی کے طبی، اخلاقی اور روحانی نقصانات بتائے جائیں، خلافِ فطرت افعال کے نقصانات سے ان کو آگاہ کیا جائے، صفائی ستھرائی کے سلسلہ میں اس طرح بتایا جائے کہ الفاظ کا پردہ تقاضۂ حیاء کو مجروح نہ ہونے دے۔

یہ مسئلہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں؛ بلکہ پوری انسانیت کا مسئلہ ہے، کیوں کہ بے حیائی اور بے عصمتی کے گناہ ہونے پر تمام مذاہب متفق ہیں اور عقل ومشاہدہ اور سائنس اس کی تائید کرتی ہے، نیز یہ خود فطرتِ انسانی کا تقاضہ بھی ہے، خوشی کی بات ہے کہ بعض ہندوفرقہ پرست

تنظیمیں سختی کے ساتھ اس کی مخالفت کر رہی ہیں ؛ لیکن مسلمانوں کی طرف سے اس سلسلہ میں کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہو رہی ہے ، حالانکہ ایک داعی اور دینِ حق کی حامل امت ہونے کی حیثیت سے ان پر اس کی زیادہ ذمہ داری ہے اور ان کا فرض ہے کہ وہ پوری قوت کے ساتھ اس طوفان کو روکنے کی کوشش کریں ، اس سلسلہ میں خاص کر مسلمان مذہبی ، رفاہی ، تعلیمی اور سیاسی تنظیموں کو میدان عمل میں آنا چاہیے اور غیر مسلم بھائیوں کو ساتھ لے کر اس کے خلاف مزاحمت کرنی چاہیے ، ورنہ مستقبل میں اخلاقی اعتبار سے یہ ایک ایسی تباہ کن سونامی ثابت ہوگی کہ پھر اس کی بلاخیزی کو روکنا ممکن نہیں ہوگا !

۱۵/ جون ۲۰۰۷ء

نئے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے!

اسلام سے پہلے مختلف قوموں میں عورتوں کو میراث نہیں ملتی تھی ، ان کا خیال تھا کہ جولوگ دشمن سے پنجہ آزمائی کرسکتے ہیں اور قوم کی حفاظت اور مدافعت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں ، انہیں کو میراث پانے اور خاندان کی املاک میں حصہ دار بننے کا بھی حق حاصل ہے ، غرض جسمانی طاقت اور مقابلہ کی قوت کو بڑی اہمیت حاصل تھی ، اسی کو قوموں کی سربلندی کا راز اور غلبہ واقتدار کا وسیلہ تصور کیا جاتا تھا اور بڑی حد تک اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے یہ بات درست بھی تھی ؛ لیکن آج حالات تبدیل ہو چکے ہیں اور اب قوموں کی تقدیر میدانِ جنگ کی للکار اور شمشیر و آہن کی جھنکار کے بجائے علم و تحقیق کے مراکز اور دانش گاہوں سے متعلق ہوگئی ہے ۔

جو قوم علم و فن سے عاری اور فکر و دانش سے محروم ہو ، خواہ کتنی ہی بڑی تعداد رکھتی ہو ؛ لیکن اس کی حیثیت مٹی کے ڈھیر کی ہے ، جو ہمیشہ پاؤں تلے روندا اور قدموں کے نیچے بچھایا جاتا ہے ، اس کی ایک کھلی ہوئی مثال جاپان اور خود ہمارا ملک ہندوستان ہے ، ہم آبادی کے اعتبار سے دنیا کی دوسری سب سے بڑی طاقت ہیں اور ہمارے ملک کا رقبہ بھی کچھ کم نہیں ، قدرتی وسائل جتنے اس ملک کو حاصل ہیں کم ہی اس کی مثال ملے گی ، جاپان آبادی کے اعتبار سے بھی اور رقبہ کے لحاظ سے بھی ہم سے بہت چھوٹا ملک ہے ، قدرتی وسائل میں بھی وہ ہمارا مقابلہ نہیں کرسکتا ؛ لیکن آج ہمیں جاپان کے سامنے دستِ سوال پھیلانا اور کشکولِ گدائی بڑھانا پڑتا ہے ، یہ صورتِ حال محض علم و دانش کا ادنیٰ کرشمہ ہے!

اسلام وہ مذہب ہے جس نے اپنی آمد کے اوّل دن سے علم پر زور دیا ہے ، پیغمبر اسلام ﷺ جس سماج میں پیدا ہوئے اور نبوت سے سرفراز کئے گئے ، اس میں کیا کچھ برائیاں اور بے حیائیاں نہیں تھیں ، شرک عام تھا ، سینکڑوں دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی ، طاقت کی حکمرانی تھی ، نہ

جان محفوظ تھی، نہ مال اور نہ عزت وآبرو، بے حیائی اور بے شرمی کی کوئی بات نہیں تھی جو سماج میں نہ پائی جاتی ہو، بظاہر خیال ہوتا ہے کہ ان حالات میں انسانیت کے نام اللہ تعالیٰ کا پہلا پیغام توحیدِ خداوندی کی دعوت اور شرک وبت پرستی کی تردید کا آنا چاہیے تھا کہ اسلام کی پوری تعلیم کا لب لباب اور خلاصہ یہی خدا کی وحدانیت کا تصور ہے، یا پھر پہلی وحی ظلم وجور کی مذمت وانصاف کی ترغیب کی بابت ہونی چاہیے تھی؛ کیوں کہ انسان سب سے زیادہ ضرورت مند ایسے سماج کا ہوتا ہے جو پرامن ہو، ظلم وزیادتی سے محفوظ ہو اور بقاءِ باہم کے اصول پر قائم ہو؛ لیکن غور فرمائیے کہ آپ ﷺ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی، اس میں صراحتاً ان باتوں کا کوئی ذکر نہیں؛ بلکہ فرمایا گیا کہ اپنے رب کے نام سے پڑھیے جو تمام کائنات کا خالق ہے، یعنی سب سے پہلے پیغمبر ﷺ کے ذریعے انسانیت کو جس بات کی دعوت دی گئی، وہ ''تعلیم'' ہے؛ کیوں کہ علم ایسا سرچشمہ ہے، جس سے تمام بھلائیاں پھوٹتی ہیں اور تمام مفاسد کا رد ہوتا ہے، اسی لیے امام مالکؒ نے فرمایا کہ علم روشنی ہے، ''**العلم نور** ''(حلیة الأولیاء :۶/۳۱۷)۔

اگر کوئی مکان اندھیرا ہو تو اس میں چور اور ڈاکو کا داخل ہونا بھی آسان ہوتا ہے اور وہ سانپ کیڑوں کی بھی آماجگاہ بن جاتا ہے، ان میں سے ہر ایک کا مقابلہ الگ الگ دشوار ہے؛ لیکن اگر چراغ جلا دیا جائے اور مکان روشن ہو جائے تو نہ چور اور ڈاکو کو گھر میں آنے کا حوصلہ ہوگا، نہ سانپ کیڑے اس مکان کو اپنا ٹھکانہ بنائیں گے، علم کو روشنی کہہ کر آپ ﷺ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے، ہر برائی کو الگ الگ دور کرنا اور ان کا علاحدہ مقابلہ کرنا آسان نہیں؛ لیکن تمام برائیوں اور مفاسد کا اصل سرچشمہ جہالت اور علم سے محرومی ہے، کسی سماج میں جب علم کی روشنی آجائے تو خود بخود سماج کی برائیاں دور ہوں گی اور علم ودانش کی آگ ان کو پھونک کر رکھ دے گی۔

رسول اللہ ﷺ کو اس کا اتنا پاس ولحاظ تھا کہ مکہ میں ہر طرح کی دشواری کے باوجود آپ ﷺ نے ''دارِ ارقم'' کو تعلیم وتربیت کا مرکز بنایا اور اوّل دن سے اپنے رفقاء کی تعلیم وتربیت کی طرف متوجہ رہے، مکہ کا جولٹا پٹا قافلہ مدینہ آیا، اس میں سینکڑوں بے گھر ودر تھے، خود آپ ﷺ کو کوئی ذاتی مکان میسر نہیں تھا اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر میں مہمان تھے؛ لیکن آپ ﷺ نے نہ اپنے لیے گھر کی فکر کی اور نہ اپنے ان ساتھیوں کے لیے، جو مستقل اقامت گاہ سے محروم تھے؛ بلکہ

سب سے پہلے مسلمانوں کے لیے ایک عبادت گاہ اور دینی مرکز کی حیثیت سے ''مسجد نبوی'' کی تعمیر فرمائی اور پہلی باضابطہ درسگاہ ایک چبوترہ کی شکل میں قائم کی، جسے ''صفہ'' کہا جاتا تھا، یہی چھوٹی سی جگہ جزیرۂ عرب کے کونے کونے سے آنے والے مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا مرکز تھی اور خود رسول اللہ ﷺ اس کے منتظم اور استاذ تھے، حضور ﷺ کا یہ عمل ہمیں بتاتا ہے کہ مسلمان گھر بار اور دوسرے اسبابِ آسائش سے بڑھ کر اپنے بچوں کی تعلیم پر اوّلین توجہ دیں کہ جو قوم اپنا گھر پھونک کر علم کا چراغ جلانا نہ جانتی ہو، سربلندی ودرخشانی کبھی اس قوم کے حصہ میں نہیں آسکتی۔

اگر تاریخ کے عجوبہ اور حیرت انگیز واقعات کو جمع کیا جائے تو اس میں ایک یہ بھی ہوگا کہ غزوۂ بدر میں ستر اہل مکہ مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار کئے گئے، اس وقت مسلمان سخت معاشی مشکلات سے گزر رہے تھے، نہ ان کو معقول غذا میسر تھی، نہ ضرورت کے مطابق لباس تھا اور نہ مناسب رہائش گاہ، اور تو اور خود آپ ﷺ کے یہاں ہفتوں چولہا سلگنے کی نوبت نہ آتی تھی، اس عہد میں شاید ہی کوئی مسلمان گھر ہو جو فاقہ مستی کی لذت سے ناآشنا رہ گیا ہو، یہ موقعہ تھا کہ آپ ﷺ فدیہ کے طور پر اہل مکہ سے زیادہ سے زیادہ پیسے حاصل کر لیتے اور مدینہ کی معیشت کو سہارا دیتے۔

لیکن آپ ﷺ نے ان اسیرانِ بدر کا پہلا فدیہ یہ مقرر کیا کہ جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے ہوں، وہ دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، آپ ﷺ کے اس عمل میں امت کے لیے اسوہ ہے کہ گو ہمیں بھوکے رہنا پڑے، ہماری کروٹیں فاقوں سے بے سکون ہوں اور دنیا کے اسبابِ راحت ہمیں کم سے کم میسر ہوں؛ لیکن ہر قیمت پر ہم اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کو اوّلیت دیں اور تعلیم سے محروم کر کے ہم ان کے اور پوری قوم کے مستقبل کو ضائع نہ ہونے دیں، آپ ﷺ کے اس عمل سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ اسلام نے تعلیم میں کسی تنگ ذہنی اور تعصب کو راہ نہیں دیا ہے، علم کا حصول بہر حال ایک نعمت ہے، چاہے وہ غیر مسلم سے حاصل ہو؛ بلکہ ان لوگوں سے حاصل ہو جن سے ہماری زندگی کے وجود کو بھی خطرہ لاحق ہے؛ بشرطیکہ ان سے ہمارے ایمان وعقیدہ اور ہماری مذہبی قدروں کو نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔

اسلام کسی بھی ایسے علم کا مخالف نہیں جو انسانیت کے لیے نافع ہو، نہ وہ کسی زبان کا مخالف ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعض رفقاء کو عربی زبان کے علاوہ بعض دوسری زبانوں کے سیکھنے کی

ہدایت فرمائی اورفرمایا کہ تمام ہی زبانیں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں،علم نافع کوآپ ﷺ نے بہترین عبادت قراردیا، (مجمع الزوائد:۲/۱۲۰) اورعلم کے حصول کو ہرمسلمان کا مذہبی فریضہ مقررفرمایا،آپ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کی موت کے بعدبھی تین چیزوں کا اجراسے پہنچتا رہتا ہے،من جملہ ان کے ایک ایسا علم ہے جس سےاس کے بعدبھی لوگوں کونفع پہنچتا رہے۔

افسوس کہ جس امت کوسب سے پہلے پڑھنے کی تعلیم دی گئی اوراس کے ہاتھوں میں قلم تھمایا گیا، وہی ہے کہ آج جہالت و ناخواندگی اورتعلیم سےمحرومی اس کے لیے وجہِ امتیاز بنی ہوئی ہے اوردبی کچلی قومیں بھی اس میدان میں اسے پیچھے چھوڑ چکی ہیں، ایک ایسی قوم کے لیے جس نے سینکڑوں سال تک اس ملک کےطول وعرض پرحکومت کی ہےاورآج بھی اس ملک کا کوئی خطہ نہیں، جہاں اس کی فرماں روائی اورعظمتِ رفتہ کےانمٹ اورقلب ونگاہ کومحوِ حیرت کردینے والانقش موجود نہ ہو،مگرعظمتِ رفتہ کے یہ نقوش آج ہمیں منہ چڑاتے ہیں اورزبانِ حال سےہم پرقہقہہ زن ہیں کہ یہ کیسی قوم ہے کہ جس کے حال کواس کے ماضی سےکوئی رشتہ نہیں؟؟

اس ذلت اور پستی سے نکلنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ مسلم محلوں اورآبادیوں کےگلی کوچوں میں تعلیم کی ایسی ہی تحریک چلائی جائے، جیسےالیکشن میں ووٹوں کے لیے مہم چلائی جاتی ہے،مسلمان پوری قوم کواپنا خاندان وکنبہ تصورکریں، وہ اپنے بچوں کی تعلیم پربھی توجہ کریں اوراپنے پڑوسیوں کی بھی خبرگیری کریں کہ کہیں ایسا تونہیں کہ کوئی طالبِ علم پڑھتے پڑھتے رک گیا ہو،معاشی ناہمواری نےاس کے بڑھتے ہوئے قدم تھام لئے ہوں، یا وہ نفسیاتی کم حوصلگی کا شکار ہوگیا ہو،ایسے بچوں کا حوصلہ بڑھائیں اوراجتماعی طورپرسماج کےایسے بچوں کی تعلیمی کفالت قبول کریں، ایسی درسگاہیں قائم کریں، جن کا نصب العین قوم کی خدمت ہو، جوتعلیم کوتجارت اورروپیوں کا ٹکسال نہ سمجھتے ہوں؛ بلکہ پوری امت کوایک خاندان سمجھ کران کی خدمت کے لیے میدانِ عمل میں اترے ہوں،جن کو ہوٹلوں اورمعمولی کارخانوں میں ان کمسن مسلمان بچوں کا برتن دھونا اورجھاڑو دینا تڑپا دیتا ہو،جن کے چہرے بشرے سے ذہانت ہویدا ہےاورجن کی آنکھیں ان کی اندرونی ذکاوت وفراست کی چغلی کھاتی ہیں۔

جب تک قوم کے سربرآوردہ لوگوں میں پوری قوم کے لیے درد اور کسک پیدا نہ ہو،

مسلمانوں کی پست حالی ان کی کروٹوں کو بے سکون اوران کی آنکھوں کو بے آرام نہ کردے، مسلم تعلیمی ادارے مکان کی تعمیر کے بجائے انسان کی تعمیر کی طرف متوجہ نہ ہوں، جوتعلیم وتعلّم کوتجارت کے بجائے عبادت کا درجہ دینے پرآمادہ نہ ہوں اور پوری قوم میں یہ احساس نہ جاگے کہ تعلیم ہی سے ہماری تقدیر وابستہ ہے، یہ ہماری شہِ رگ ہے اوراس سے محرومی کے بعد کسی قوم کے لیے باعزت طور پر زندہ رہنا ناممکن ہے، تب تک ہمارا خوابیدہ نصیب جاگ نہیں سکتا اور ہم روٹھے ہوئے ماضی کو منا کر واپس نہیں لا سکتے!!

۱۵/ جون ۲۰۰۷ء

بلند حوصلگی کی ضرورت

رسول اللہ ﷺ نے کچھ صحابہ ؓ کو ایک فوجی مہم پر روانہ کیا، یہ حضرات گئے، مقابلہ بھی بہادری کے ساتھ کیا؛ لیکن مقابلہ میں جم نہ سکے اور راہِ فرار اختیار کرنی پڑی، جب مدینہ واپس آئے تو مارے شرم کے چھپے پھرتے تھے اور آپ ﷺ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ پاتے تھے، کہتے تھے کہ ہم لوگ تو بھاگے ہوئے لوگ ہیں، ''نحن الفرارون''، آپ ﷺ داناؤں کے دانا اور حکیموں سے بڑھ کر حکیم تھے، موقع و محل کی خوب پہچان رکھتے تھے اور انسانی نفسیات سے خوب واقف تھے، آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ یہ موقع زجر و توبیخ اور شرمساروں کو مزید شرمسار کرنے کا نہیں؛ بلکہ ہمت بندھانے اور حوصلہ بڑھانے کا ہے، آپ ﷺ نے لطف و کرم کا لب ولہجہ اختیار کیا اور فرمایا کہ تم بھاگے نہیں؛ بلکہ تم اس لیے پیچھے ہٹے ہو کہ پیچھے آ کر دوبارہ حملہ کرو، تم نے اس لیے پسپائی اختیار کی ہے کہ نئی کمک ساتھ لے کر مقابلہ پر اترو، ''أنتم الکرارون ، أنتم العکارون''، یعنی اس واقعہ کو تم ''بزدلی'' کے بجائے ''تدبیر'' کا واقعہ بنادو، (مسند الشافعی: حدیث نمبر: ۳۸۸) گویا یہ ایک طرح کی فوجی تدبیر ہے کہ پیچھے ہٹ کر مقابلہ کیا جائے، یہ ایک جنگی چال ہے نہ کہ شکست و ہزیمت۔

انسان دنیا میں جو کچھ بھی کرتا ہے، اس کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے اور ایک کا اندر کی دنیا سے، باہر کی دنیا میں ضروری ہے کہ اس کام کے لیے مطلوبہ وسائل اختیار کئے جائیں، فوجی اور سپاہی ہے تو اسلحہ اور حملہ کرنے اور دفاع کرنے کے آلات سے لیس ہو، تاجر ہے تو تجارت کا تجربہ اور ضروری سرمایہ رکھتا ہو، طالب علم ہے تو اس کے پاس کتابیں ہوں اور اچھے اساتذہ سے اس کا ربط ہو، انسان کے اندر کی دنیا اس کا ''دل'' ہے اور اس کا سرمایہ حوصلہ و ہمت اور یقین ہے۔

کسی بھی اہم کام کے لیے حوصلہ اور یقین سب سے بنیادی ضرورت ہے، اس بات کا حوصلہ کہ وہ اس کام کو کر سکے،اس بات کا یقین کہ وہ اس کام کو ضرور اس کے انجام تک پہنچا کر رہے گا اور اپنے آپ پر اعتماد کہ وہ اس کام کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، راستہ کی مشکلات آسان کرتا ہے، منزل کی جستجو کو بڑھاتا ہے، ہمت وحوصلہ کی طاقت ظاہری وسائل کی کمی کا بدل ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے، تاریخ میں کتنے ہی واقعات آپ کو مل جائیں گے کہ ایک بے سروسامان شخص اٹھا، نہ اس کے پاس فوج تھی نہ حکومت اور نہ مادّی وسائل ؛ لیکن بلند حوصلگی، عالی ہمتی، اپنے مقصد پر یقین اور خود اعتمادی نے اس کو اتنی طاقت بہم پہنچائی کہ اپنے زمانہ کے فراعین کی گردنیں بھی اس کے سامنے خم ہوگئیں اور وہ طوفانوں کا رُخ موڑنے میں کامیاب ہوگیا، اور ایسی مثالیں بھی آپ کو ملیں گی کہ وسائل کی فراوانی ہے اور تعداد کی کثرت ہے ؛ لیکن پست حوصلگی اور کم ہمتی نے پوری پوری قوم کو غلامی میں پابہ زنجیر کردیا۔

مسلمانوں نے بھی بحیثیت قوم اس کا خوب تجربہ کیا ہے، غور کیجئے کہ وہ مسلمان ہی تھے جو عرب کے ریگزار سے اٹھے اور افریقہ و یورپ سے مشرقِ بعید تک ابر رحمت کی طرح چھا گئے، محض سولہ سال کے ایک نوجوان نے سمند پار اتر کر ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک کو اسلام اور اسلامی نظام کی نعمتِ عظمٰی سے ہم کنار کیا اور اسپین پر اپنی فتح مندی کے نقوش ثبت کئے اور وہ بھی مسلمان ہی تھے جنہوں نے دنیا کی مختلف زبانوں میں موجود علمی اور فنی لٹریچر کو عربی زبان میں منتقل کیا، تحقیق وریسرچ کا جو چراغ یورپ میں بجھ چکا تھا اور ہاں کسی سائنسی تحقیق اور نظریہ کا پیش کرنا بھی گردن زدنی جرم تھا، وہاں علم وفن کی نئی بزمیں آراستہ کیں اور تحقیق واکتشاف کی ایک نئی دنیا کو وجود بخشا، یہ دراصل اسی عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کا کرشمہ تھا۔

اور وہ بھی مسلمان ہی تھے کہ جب تاتاریوں کا فتنہ اٹھا تو چند تاتاریوں کا وجود پوری مسلمان فوج کی شکست کے لیے کافی ہوتا تھا اور ایک تاتاری عورت بھی دسیوں مسلمان مردوں کو تہہ تیغ کرسکتی تھی اور آج ہماری بدنصیب آنکھیں اس منظر کو دیکھ رہی ہیں کہ مسلمانوں کے پاس دنیا کے بہترین معاشی ذرائع ہیں، کثیر افرادی وسائل ہیں، ذہانتیں اور صلاحیتیں ہیں ؛ لیکن علم وتحقیق کے میدان میں ان کا درجہ صفر ہے اور عالمی سطح پر ان کا شمار پسماندہ اقوام میں ہے، اس میں بڑا دخل اسی

کم ہمتی کا ہے، جب کسی قوم میں پست حوصلگی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ہمت ہار دیتی ہے، تو پھر محنت کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے اور وہ دشوار گزار راہیں طے نہیں کر سکتی۔

ہندوستان میں اس وقت مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں، وہ کسی بھی باعزت قوم کے شایانِ شان نہیں، سیاسی اعتبار سے وہ ایک منتشر انبوہ ہیں، افرادی قوت کے لحاظ سے ملکی سیاست پر ان کا کوئی اثر نہیں، معاشی اعتبار سے ان کی پسماندگی ضرب المثل ہے، نہ تجارت میں ان کا قابل لحاظ حصہ ہے، نہ صنعت میں، سب سے افسوسناک بات مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور زبوں حالی ہے، جس نے ان کو سیاسی شعور سے بھی محروم رکھا ہے اور معاشی بدحالی سے بھی دوچار کیا ہے؛ اس لیے کہ اس دور میں ملازمت ہی نہیں، اعلیٰ درجہ کی صنعت وتجارت بھی تعلیم کی رہین منت ہے، مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ وہ خود کوئی سیاسی قوت نہیں ہیں، اس بات نے عام طور پر مسلمان قائدین کو بے سمتی کا شکار اور خوشامدی بنا دیا ہے، مسلمان تجارت میں اترنے کا حوصلہ نہیں پاتے، معمولی تجارتوں پر قانع ہیں، صنعت اور کاروبار آج مقابلہ کا اصل میدان ہے اور سخت محنت اور اعلیٰ صلاحیت کے بغیر کوئی اسے سر نہیں کر سکتا، اس میدان میں قدم رکھنے سے بھی مسلمان گھبراتے ہیں، یہی حال تعلیم کا ہے، مسلمان طلبہ ایک طرح کی احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں، اعلیٰ مقابلاتی امتحان میں شرکت کا تناسب مسلمان طلبہ کا بہت معمولی ہے۔

ملک میں جہاں مسلمانوں نے بہت سے فلاحی اور تعلیمی ادارے قائم کئے ہیں، وہیں ایک ایسے ادارہ یا ٹیم کی بھی ضرورت ہے جو مختلف میدانوں میں ان لوگوں کی اخلاقی مدد کرے اور حوصلہ افزاء مشورے دے، جن کی ہمتیں ٹوٹ جائیں اور وہ پست حوصلگی کے باعث میدانِ مسابقت چھوڑنے لگیں، کتنے ہی مسلمان طلبہ ہیں جو ساتویں جماعت کے امتحان میں شریک ہوتے ہیں، لیکن جماعت دہم تک نہیں پہنچ پاتے، کتنے مسلمان تاجر ہیں جو ابھرتے ہیں؛ لیکن کسی وقتی واقعہ کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لیے اس میدان کو خیرباد کہہ دیتے ہیں، یہی حال ہر شعبۂ زندگی کا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو ہمت دلائی جائے اور ان کو اپنا سفر جاری رکھنے پر آمادہ کیا جائے، ان کو اس تجربہ سے آگاہ کیا جائے کہ بعض طلبہ میٹرک میں فل ہو گئے؛ لیکن پھر مسلسل اور مردانہ وار کوشش نے

ان کو اس لائق بنادیا کہ انہوں نے اعلی مسابقتی امتحانات میں کامیابی حاصل کی، تجارتی نقصان نے ان کو دیوالیہ کردیا؛ لیکن بلند حوصلگی کے ساتھ محنت نے ان کو از سر نو کھڑا کردیا، اس طرح ان کو شکست اور بے یقینی کے دلدل سے نکال کر خود اعتمادی اور یقین سے بہرہ ور کیا جائے کہ شکست کے احساس اور پست ہمتی کے ساتھ کوئی قوم آگے نہیں بڑھ سکتی۔

۲۲/ جون ۲۰۰۷ء

زکوۃ کا ترجیحی مصرف

اسلام کا تیسرا اہم رکن زکوۃ ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں تقریباً جو بیس مواقع پر نماز کے ساتھ ہی زکوۃ کا ذکر آیا ہے، (البقرة :۴۳، ۸۳، ۱۱۰، ۱۷۷، ۲۷۷، النساء :۷۷، ۱۶۲، المائدة :۱۲، ۵۵، التوبة :۵، ۱۱، ۱۸، ۷۱، الأنبياء:۷۳، الحج :۴۱، ۷۸، النور :۳۷، ۵۶، النمل :۳، لقمان :۴، الأحزاب :۳۳، المجادلة :۱۳، المزمل :۲۰، البينة :۵) رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد خلافت صدیقی میں کچھ لوگوں نے زکوۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے جہاد کا اعلان فرمایا، اور ارشاد ہوا کہ ’’جو لوگ نماز اور زکوۃ کے درمیان فرق کریں گے، میں ان سے ضرور ہی جہاد کروں گا‘‘ (صحيح البخارى ، كتاب الاعتصام بالكتاب ، تحت باب قول الله تعالىٰ (وأمرهم شورى بيهم) ۔

قرآن مجید میں ایک تو عمومی انفاق کا حکم ہے، ان کے لئے مصرف متعین نہیں ہے، مسلمان ہو یا غیر مسلم، اللہ تعالی کا مطیع وفرماں بردار بندہ ہو یا نافرمان وگنہگار، رشتہ دار ہو یا اجنبی، دین کا کام ہو یا دنیا کا، ہر مد میں خرچ کرنا درست ہے؛ بلکہ خرچ کرنا چاہئے اور یہ باعث اجر وثواب ہے، سوائے اس کے کہ ایسے کام میں تعاون نہ کرے جو معصیت اور انسانی مضرت کا ہو؛ لیکن زکوۃ کے لئے خود قرآن مجید نے مصارف متعین کر دئے ہیں، (التوبہ :۶۰) یہ کل آٹھ مصارف ہیں: ان میں چھ میں عمومی حاجت مند بھی ہیں —— جن کو فقراء ومساکین کہا گیا ہے —— اور وہ لوگ بھی ہیں، جو خصوصی حالات اور غیر معمولی واقعات کی وجہ سے عارضی طور پر حاجت مند ہو گئے ہیں اور اپنی کسی ضرورت کو پورا کرنے میں زکوۃ کے محتاج ہیں۔

دو مصارف وہ ہیں، جن کا تعلق اسلام کی سر بلندی، دین کی حفاظت و مدافعت اور دعوت واشاعتِ حق سے ہے، جن کو قرآن میں ’’فی سبیل اللہ‘‘ اور ’’مؤلفۃ القلوب‘‘ سے تعبیر کیا گیا ہے،

''فی سبیل اللہ'' سے مراد وہ لوگ ہیں، جو مملکت اسلامی کی سرحدوں کی حفاظت میں لگے ہوئے ہیں؛ گویا ان کی توجہ حفاظت دین کی طرف ہے، '' مؤلفۃ القلوب'' سے مراد وہ نومسلم ہیں، جن کو تعاون کے ذریعہ اسلام پر ثابت قدم رکھنا مقصود ہو، یا وہ غیر مسلم کہ تعاون کی وجہ سے ان کے ایمان لانے کی توقع ہو؛ گویا اس مد کی روح اشاعت دین ہے، قرآن مجید میں ان دونوں مصارف کی شمولیت فی الجملہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ زکوۃ کا ایک اہم مقصد اسلام کی حفاظت واشاعت کے کام کو تقویت پہونچانا بھی ہے، اور اس کی مزید اہمیت اس سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید میں ان دونوں مصارف کو بیان کرتے ہوئے اس پر حرف ''فی'' کا استعمال کیا گیا ہے، وہ عربی زبان کے قواعد کے لحاظ سے زیادہ مؤکد واہم ہیں، اور ''فی'' کا لفظ ان مدات کی تاکید اور اہمیت کے اظہار کے لئے آیا ہے۔

قرآن مجید کے ان ہی احکام کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ جو علماء زکوۃ کے مستحق ہیں اور تعلیم ودعوت کے کام میں لگے ہوئے ہیں، ان کو زکوۃ دینا زیادہ باعث اجر وثواب ہے۔ (دیکھئے: ردالمحتار: ۲/۶۹) امام غزالیؒ جو اسلامی تاریخ کے منتخب ترین مفکرین اور فلاسفۂ اسلام میں ہیں، انہوں نے اپنی مایۂ ناز تالیف ''احیاء علوم الدین'' میں زکوۃ کے مصارف پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، اس میں ایک بحث یہ بھی ہے کہ کن حضرات کو زکوۃ دینا افضل ہے؟ اس میں امام غزالیؒ نے چھ ترجیحی صفات لکھے ہیں، ان میں پہلا وصف یہ ہے کہ وہ صاحب تقوی اور دین دار لوگ ہوں؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نیک لوگ ہی تمہارا کھانا کھائیں، ''**لا یأکل طعامک إلا تقی**'' (سنن أبي داؤد ، کتاب الأدب ، باب من یؤمر أن یجالس ، حدیث نمبر: ۴۸۳۴، سنن الترمذی ، کتاب الزهد ، باب ما جاء في صحبة المؤمن ، حدیث نمبر: ۲۳۹۵، عن ابی سعیدؓ) یعنی دین داروں ہی پر خرچ کرنا واجب تو نہیں ہے؛ لیکن ان پر خرچ کرنا افضل ہے، دوسری صفت یہ ہے کہ اس کا تعلق علم دین سے ہو، چاہے وہ تعلیم دیتا ہو یا تعلیم حاصل کرتا ہو؛ کیوں کہ بقول امام غزالیؒ صحیح نیت کے ساتھ علم تمام عبادتوں میں اشرف ترین عبادت ہے، مشہور بزرگ امام عبداللہ بن مبارک کا حال یہ تھا کہ اپنی رقم اہل علم ہی پر خرچ کیا کرتے تھے، جب لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ انبیاء کے بعد علماء سے بڑھ کر کسی کا درجہ ومقام نہیں ہے، تیسرے: وہ لوگ ہیں، جو حقیقی معنوں میں توحید پر عمل پیرا ہوں

، چوتھے نمبر پر ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو اپنی ضرورت دوسروں کے سامنے پیش نہیں کرتے ہوں ، پانچویں: وہ لوگ ہیں، جو قید میں ہوں یا بیمار ہوں، چھٹے: اپنے قرابت دار؛ کیوں کہ ان کو زکوۃ دینے میں دوہرا ثواب ہے، صدقہ کا بھی اور صلہ رحمی کا بھی۔(إحیاء علوم الدین :۱/۲۲۰،۲۱۹)

امام غزالیؒ کی ان ترجیحات کو دیکھئے، تو پہلی تینوں ترجیحات ان حضرات سے متعلق ہیں، جو دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہوں اور علم دین کی اشاعت کا فریضہ انجام دیتے ہوں، قرآن مجید نے ایک اور موقع پر اس حقیقت کو ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:

> ''اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے، جو اللہ کے کام میں گھرے ہوئے ہیں، جو (کسب معاش کے لئے) زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے، (یعنی: دینی مشاغل کی وجہ سے کوئی اور مشغلہ اختیار نہیں کرتے) ان کے سوال سے احتیاط کرنے کے باعث ناواقف ان کو مالدار خیال کرتے ہیں، تم انہیں ان کے چہرے بشرے سے پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے اور تم جو بھی مال خرچ کرتے ہو، بے شک اللہ اس سے باخبر ہے'' (البقرہ :۲۷۳)

یہ آیت بھی صاف بتاتی ہے کہ جن لوگوں نے اپنا مشغلہ خدمتِ دین کو بنالیا، یہ مصروفیت انہیں تجارت، کاشت کاری اور دوسرے کاموں کی اجازت نہیں دیتی ہے اور ان کی حیاء ان کو اپنی ذات کے لئے دست سوال دراز کرنے سے روکے ہوئے ہے، ان پر خرچ کرنا افضل ہے۔

قرآن و حدیث کے ان ہی ارشادات اور فقہاء کے اجتہادات و استنباطات نیز سلف صالحین کے طریقۂ کار اور معمولات کو سامنے رکھ کر ہندوستان میں چند بالغ نظر اور زمانہ آگاہ علماء ربانیین نے بہت ہی غور وخوض کے بعد فیصلہ کیا کہ مدارس کا ایسا نظام قائم کیا جائے جو حکومت کے تعاون کے بجائے عام مسلمانوں کے تعاون سے چلا کرے اور مسلمانوں کو ترغیب دی جائے کہ خاص کر وہ اپنی زکوۃ کی رقم ان اداروں کو دیا کریں، یہ فیصلہ کس پس منظر میں کیا گیا؟ وہ بھی قابل ذکر ہے، ایک طویل عہد ایسا گزرا ہے جس میں مسلمان حکمرانوں میں بڑی حد تک دین داری رہی ہے، وہ اقتدار کی رسہ کشی میں قتل وخون کا بازار تو گرم کرتے رہے؛ لیکن شعائر دین کی عظمت کے

جذبہ سے وہ محروم بھی نہیں تھے؛ اسی لئے یہ لوگ بہت سی کمزوریوں کے باوجود دینی غیرت اور ایمانی حمیت رکھتے تھے، اگر کوئی واقعہ دین کی بے توقیری کا سامنے آجاتا تو ان کے اندر کا ضمیر جاگ اٹھتا، وہ مساجد و مدارس کی تعمیر، خانقاہوں کی اعانت اور علم دین کی اشاعت پر خرچ کرنے کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے۔

لیکن حکومت اور چرچ کی طویل خانہ جنگی کے بعد جب مغرب میں چرچ نے شکست فاش کھائی اور حکومت کا ستون اقتدار پوری طرح مضبوط ہوگیا تو نہ صرف عیسائیت؛ بلکہ مطلق مذہب اور اخلاقی قدروں سے نفرت، ان سے آزادی حاصل کرنے اور اپنی زندگی سے مذہبی تصورات کو نکال باہر کرنے کی ایک ایسی لہر چل پڑی، جس نے یورپ کو تو متاثر کیا ہی، جب وہ عالم اسلام پر حملہ زن ہوئے اور انہیں آزاد کرتے ہوئے اپنے تابع کٹھ پتلی حکومتیں قائم کیں تو ان کے ذہن کو بھی پوری طرح اسی سانچہ میں ڈھال دیا، مصطفی کمال پاشا، جمال عبدالناصر، انورالسادات، حافظ الاسد رضا شاہ پہلوی اور انڈونیشیا کے صدر سوہارتو وغیرہ اسی طرح کے لوگ تھے، جو صرف اپنی عوام کے خوف سے اسلام کا نام لیتے تھے، اور حقیقت میں ان کے قلوب شعائر اسلامی کی عظمت سے خالی تھے، وہ اسلام کے نشر و اشاعت کا فریضہ تو کیا انجام دیتے، خود بدترین قسم کی اسلام دشمنی میں مبتلا تھے۔

یہ حالات نقش دیوار کی طرح علماء کی نظر میں تھے؛ اس لئے انہوں نے ہندوستان میں حکومتوں کے اثر سے آزاد عوامی مدارس کی بنیاد رکھی، جن میں پڑھنے اور پڑھانے والوں کا مقصد خالصۃً اسلام کی خدمت و اشاعت ہے؛ اسی لئے ان اداروں میں حکومتوں کا تعاون قبول کرنے سے احتراز کیا گیا ہے، اس بات کی کوشش کی گئی کہ فضلاء میں خدمت دین کے بجائے کسب معاش کا جذبہ غالب نہ ہوجائے، تربیت کا ایسا نظام رکھا گیا کہ ان کی فکر میں استقامت ہو، اور وہ صرف علم ہی کی دولت ساتھ نہ لے جائیں؛ بلکہ اس سے بڑھ کر دینی حمیت کی سوغات بھی ان کے ساتھ ہو؛ اسی لئے ان مدارس سے نکلنے والے فضلاء نے نہ سرکاری ملازمتوں کی فکر کی، نہ سیاسی عہدوں کے لئے طالع آزمائی کی اور نہ دولت مندوں کی چوکھٹوں پر جبین سائی کو قبول کیا؛ بلکہ ہمیشہ انہوں نے اسلام کی اشاعت وحفاظت کو اپنا مشن بنایا۔

اس میں دو جہتیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں ، ایک جہت اسلام کی حفاظت کی ہے ، اس ملک میں ؛ بلکہ دنیا میں جہاں کہیں بھی مخالف اسلام فتنے اٹھے ، علماء ہی ان کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے ، عیسائیت کا تبشیری مشن ہو ، قادیانیت ہو ، الحاد اور کمیونزم ہو ، آریہ سماجیوں کی طرف سے مسلمانوں کو مرتد بنانے کی تحریک ہو ، حدیث کا انکار ہو ، شریعت اسلامی کے تحفظ کا مسئلہ ہو ، اہل مغرب کی طرف سے کئے جانے والے اعتراضات کا مدلل جواب دینا ہو ، اسلام کو عقل اور فطرت کی ترازو پر سمجھانا اور نئے ذہنوں کو مطمئن کرنا ہو ، دفاعِ اسلام کی ان تمام مہمات کی کمان ہمیشہ مدارس میں پڑھنے اور پڑھانے والوں کے ہاتھوں میں رہی ہے اور اس کا اثر صرف ہندوستان یا برصغیر تک محدود نہیں رہا ؛ بلکہ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پوری دنیا میں یہ تحریکیں علماء کی قیادت میں کام کرتی رہی ہیں اور انہوں نے اسلام کے خلاف اٹھنے والے بڑے بڑے طوفانوں کا رخ موڑ دیا ہے۔

بلکہ خود مسلمانوں کی حفاظت و مدافعت کے پہلو سے بھی علماء نے اتنا کھل کر کام کیا ہے کہ شاید کسی اور طبقہ نے کیا ہو ، اور اس کی وجہ ظاہر ہے ، جو لوگ حکومت کے ملازم ہوں ، جن لوگوں کو ایوان سیاست میں اپنی جگہ باقی رکھنی ہو اور جنہیں اپنی معاشی اور کاروباری زندگی میں حکومت کی طرف سے خوف ہو اور جن کی زندگی سرکار کے لقموں پر پلتی ہو ، وہ کیسے کھل کر اسلام اور مسلمانوں کے حق میں اپنی آواز بلند کر سکتے ہیں اور حکومت وقت سے ٹکراؤ مول لے سکتے ہیں؟ اس لئے زیادہ تر ان طبقات نے ملی مسائل میں بھی فرار کا راستہ اختیار کیا ، یا کچھ دور اس مہم میں ساتھ رہ کر پھر اپنے مفادات کا سودا کرلیا ، ہندوستان کی جنگ آزادی ہو یا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کردار کا مسئلہ ہو ، یا اردو زبان کا معاملہ ہو ، ہر جگہ اگر آپ گہرائی میں اتریں تو محسوس کریں گے کہ غریب مولویوں ہی نے ان تحریکات میں جان پیدا کی ، عوام میں ان کو مقبول بنایا ، اور انہوں نے خود کبھی اس کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

دوسرا پہلو امت کو اسلام پر باقی رکھنے کا ہے ، یہ خدمتِ دین کا نہایت اہم محاذ ہے ، خاص کر ایسے ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور جہاں ان کو اپنے ملی وجود کی لڑائی لڑنی پڑ رہی ہے ، مسلمانوں کو دین پر باقی رکھنے کا کام نہایت اہمیت اختیار کر جاتا ہے ، ہندوستان جیسے ملک میں

جہاں اسی فیصد آبادی دیہاتوں میں بستی ہے اور جہاں کے دیہات اب بھی ہر طرح کی شہری سہولتوں سے محروم ہیں، دیہات میں مسلمانوں کی آبادی بہت ہی کم ہے اور وہ آٹے میں نمک کے برابر ہیں، نیز شہر کے مسلمانوں سے ان کا رابطہ بہت کم ہے، ایسے لوگوں تک دین کی روشنی پہنچانا ایک دشوار کام ہے اور اسی لئے بہت سے دور ودراز قصبات وقریہ جات میں ارتداد کا فتنہ پھیل جاتا ہے اور اگر بروقت ان کی خبر گیری نہیں کی گئی تو اس کا تدارک دشوار ہو جاتا ہے۔

شہر میں گو دینی جماعتوں اور تحریکوں کی وجہ سے عام مسلمانوں میں بیداری پائی جاتی ہے اور دینی شعائر کا اہتمام بھی نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے؛ لیکن ہمارے جو بچے اور بچیاں انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھتے ہیں، اگر ان کی دینی معلومات کا جائزہ لیا جائے تو نہایت افسوس ناک نتائج سامنے آتے ہیں، یہ کیفیت جہاں عیسائی مشنریز کے تحت کام کرنے والے اسکولوں اور سنگھ پریوار سے قربت رکھنے والی ہندو انتظامیہ کے تحت چلنے والے اسکولوں کی ہے، وہیں ان اسکولوں کی بھی ہے، جو مسلمانوں کے زیر انتظام چل رہے ہیں، اکثر و بیشتر ان کے درمیان صرف نام کا فرق ہوتا ہے ورنہ تعلیم وتربیت اور اخلاقی ماحول میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا، ان اسکولوں سے پڑھ کر جو نوجوان نسل تیار ہو رہی ہے، ان کی غالب اکثریت دین سے بے بہرہ ہے اور ان کی دینی تعلیم و تربیت کے لئے جو کوششیں کی جا رہی ہیں، وہ ضرورت سے بہت کم ہیں۔

ان حالات میں مسلمانوں کو دین پر باقی رکھنے کی محنت میں دینی جماعتوں کے علاوہ علماء اور مدارس کا نہایت اہم کردار ہے، اور وہ مختلف جہتوں سے اس کی کوشش کر رہے ہیں، ان کوششوں میں ایک اہم حصہ ائمۂ مساجد کا ہے، رسول اللہ ﷺ نے امام کے مقام اور اس کی ذمہ داری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ’’امام ضامن ہے‘‘ (سنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب ما یجب علی المؤذن من تعاهد الوقت، حدیث نمبر: ۴۳۴، سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ما جاء أن الإمام ضامن ألخ، حدیث نمبر: ۱۹۱) فقہاء کے یہاں اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ امام کی نماز مقتدیوں کی نماز کے لئے ضامن کا درجہ رکھتی ہے، یعنی اگر امام کی نماز درست نہ ہو تو مقتدی کی نماز بھی درست نہیں ہوگی، چاہے اس نے اپنے طور پر کوئی غلطی نہیں کی ہو، اسی طرح اگر امام سے سہو ہو

گیا، تو امام کے ساتھ ساتھ مقتدی بھی سجدۂ سہو کریں گے اور اگر مقتدی سے کوئی سہو ہو گیا امام سے نہیں تو مقتدی کو سجدۂ سہو کرنے کی ضرورت نہیں، گویا امام کی نماز مقتدیوں کی نماز کے لئے اساس اور بنیاد کا درجہ رکھتی ہے، —— لیکن اگر اس حدیث کی مراد کو عام رکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ امام مقتدیوں کی پوری دینی زندگی کا ضامن ہے، مقتدیوں کے عقائد وافکار، ان کی عبادات، ان کے معاملات اور ان کی اخلاقی کیفیات پر امام کی فکر اور اس کی تعلیم وتربیت کے گہرے اثرات پڑتے ہیں؛ کیوں کہ پانچ وقت کی ملاقات اور پھر اس کے ساتھ موقع بہ موقع قرآن وحدیث کا درس اور تذکیری گفتگو مقتدیوں پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتی؛ اسی لیے مساجد کے ائمہ کے مزاج و افکار کا گہرا اثر اس مسجد میں نماز پڑھنے والوں پر پڑتا ہے۔

دوسرا اہم شعبہ جمعہ کے خطبات کا ہے، جمعہ میں اجتماعی عبادت کا انتظام، دعوت واصلاح کا غیر معمولی موقع فراہم کرتا ہے، جو لوگ عام نمازوں میں نہیں آتے، وہ بھی جمعہ میں اہتمام سے آتے ہیں اور اکثر مسجدوں میں خطبۂ جمعہ سے پہلے تقریباً نصف گھنٹہ وعظ وتقریر کا موقع رکھا جاتا ہے، سال بھر میں پچاس سے زیادہ جمعہ کے ایام آتے ہیں، جمعہ کے بیانات مسلمانوں کی اصلاح کا نہایت اہم اور موثر ذریعہ ہیں؛ کیوں کہ اس وقت جتنی یکسوئی کے ساتھ لوگ خطیب کی بات سنتے ہیں، شاید ہی کسی اور اجتماع میں ایسی یکسوئی کا ماحول پایا جاتا ہو؛ چنانچہ جس مسجد کا خطیب جس فکر کا حامل ہو، اس محلّہ کے لوگوں پر اس فکر کے غلبہ کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ دینی مدارس کے فضلاء کی کثرت کی وجہ سے اب بہت سے دیہاتوں میں بھی جمعہ سے پہلے تقریر و بیان کا سلسلہ جاری ہو گیا ہے اور یہ مسلمانوں کی اصلاح میں بہت معاون ثابت ہو رہا ہے۔

دین کا ایک اہم شعبہ حلال وحرام کے بارے میں رہنمائی کا ہے، کیوں کہ خدا نے ہمیں جو شریعت دی ہے، یہ ایک جامع اور مکمل شریعت ہے، جس کی ہدایات عبادات تک محدود نہیں؛ بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی رہنمائی موجود ہے اور ان کو نظر انداز کر کے کوئی شخص کامل مسلمان نہیں ہوسکتا، ان احکام کی رہنمائی کے لئے علماء نے دارالافتاء کا نظام قائم کیا ہے، جہاں سے مسلمانوں کی شرعی مسائل کے سلسلہ میں رہنمائی کی جاتی ہے اور مفتی حضرات ان کے سوالات کے جوابات دیتے ہیں، ایک زمانہ میں پورے ملک میں ایک دو دارالافتاء ہوتے تھے اور لوگوں کو اپنے

جواب کے لئے مہینوں انتظار کرنا پڑتا تھا؛ لیکن اب ملک میں سینکڑوں دار الافتاء قائم ہیں اور تحریری جواب کے علاوہ فون پر بھی اور بالمشافہ بھی احکام شرعیہ میں مستفتیوں کی رہنمائی کی جاتی ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ دار الافتاء کا نظام مسلم معاشرہ کا ایک منفرد نظام ہے اور مسلمانوں کو احکام شریعت پر باقی رکھنے میں ان کا نہایت اہم کردار ہے۔

قرآن مجید نے مسلمانوں کے آپسی نزاعات کا حل یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے مسائل کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دربار میں لے جائیں: ﴿إِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (النساء:۵۹) —— اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں لے جانے کا طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات ان لوگوں کے پاس لے جائے جائیں، جو قرآن وحدیث کی ہدایات کے مطابق فیصلے کرتے ہوں، اسی کو ''نظام دار القضاء'' کہتے ہیں، جن کے ذریعہ ہزاروں مقدمات فیصل ہوتے ہیں اور مسلمان سرکاری عدالتوں کی سرگرانی سے محفوظ رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان شرعی عدالتوں میں علماء ہی قضاء کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

اسلام کی دعوت واشاعت کا ایک اہم ذریعہ دینی مضامین اور دینی لٹریچر بھی ہیں، فکر سازی اور کردار سازی میں لٹریچر کی بڑی اہمیت ہے؛ اسی لئے دینی جماعتوں اور تحریکوں کے لئے دینی لٹریچر بنیادی غذا کا کام کرتا ہے، برصغیر میں اسلامیات کا اردو لٹریچر اتنی بڑی تعداد میں وجود میں آیا ہے کہ عربی زبان کے بعد کوئی اور زبان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، یہ لٹریچر نوے؛ بلکہ پچانوے فیصد علماء کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عام مسلمان دین کی تشریح وتوضیح کے سلسلہ میں علماء کی تحریروں کو ہی استناد واعتبار کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جو مصنفین اس گروہ سے تعلق نہیں رکھتے، کم ہی ان کی تحریروں کو قبولیت حاصل ہوتی ہے، تفسیر قرآن، تشریح حدیث، سیرت نبوی، فقہ اسلامی، تاریخ اسلام اور اسی طرح کے دوسرے موضوعات پر علماء کی ہزاروں تصنیفات ہیں، جو اہل ذوق کے لئے سرمۂ چشم بنی ہوئی ہیں، اسی طرح اردو اخبارات وجرائد کے دینی مضامین کو دیکھیں تو ان میں بھی غالب ترین مقدار انہیں علماء کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں اور اب تو انگریزی زبان میں بھی اس طبقہ کے بہت سے لوگ لکھنے لگے ہیں اور انگریزی صحافت میں بھی وہ داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں، جو یقیناً امت کے لئے دیر سے صحیح؛ لیکن نہایت ہی خوش آئند بات ہے۔

خود مسلمانوں کی جتنی دینی تحریکیں ہیں، ان کو وجود میں لانے، ان کو فکری سمت عطا کرنے اور انہیں عوامی سطح پر مقبول بنانے میں طبقۂ علماء کا جو حصہ ہے وہ محتاج اظہار نہیں، ہندوستان میں اس وقت جتنی تحریکیں اور مذہبی تنظیمیں کام کر رہی ہیں —— آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، تبلیغی جماعت، جمعیۃ علماء ہند، جماعت اسلامی، جمعیۃ اہل حدیث، وغیرہ —— ان سب میں علماء کا خون جگر شامل ہے اور جو تنظیم علماء سے جس قدر قریب ہے، اسی قدر اس کے کام کا دائرہ وسیع ہے اور عوام میں انہیں مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہے۔

غرض کہ امت میں دعوت و اصلاح اور مسلمانوں کو اسلام پر باقی رکھنے اور دین سے ان کا رشتہ استوار کرنے کی جتنی کوششیں جس جس انداز پر ہو رہی ہیں ان کا سر رشتہ دینی مدارس سے قائم ہے، ان مدارس سے نکلنے والے فضلاء ان تمام ذمہ داریوں کو قبول کر رہے ہیں اور حالات و وسائل کے لحاظ سے اسے انجام دے رہے ہیں؛ اس لئے مدارس کی حیثیت یقیناً پاور ہاؤس کی ہے، جس سے دین کے تمام شعبوں کو ایندھن ملتا ہے اور اس کا مقام امت کے قلب کا ہے، جس سے تمام اعضاء و جوارح کو خون کی رو پہونچتی ہے؛ اس لئے مدارس کا تعاون امت میں اشاعت دین اور حفاظت دین میں ہونے والی ہمہ جہت اور ہمہ پہلو کوششوں کا تعاون ہے۔

دعوت و اصلاح اور تربیت کا ایک اہم ترین ذریعہ ''تعلیم'' بھی ہے، دینی تعلیم کا ایک نظام تو وہ ہے جو براہ راست دینی مدارس و جامعات میں قائم ہے، دوسرا نظام وہ ہے جس کا تعلق عام مسلمانوں سے ہے، جیسے مسجدوں میں صباحی اور مسائی تعلیم، نوجوانوں اور بالغوں کے لئے تعلیم بالغان کا خصوصی نظم، عصری درسگاہوں میں اسلامیات کا درس وغیرہ، دینی تعلیم کے ان جزوی شعبوں سے ہزاروں طلبۂ و طالبات استفادہ کر رہے ہیں، اگر اس نقطۂ نظر سے پورے ملک کا سروے کیا جائے، تو ان کی تعداد لاکھوں میں ہوگی، یہ تعلیم ان بچوں اور نوجوانوں کو دین سے جوڑے رکھنے میں نہایت ہی مؤثر کردار ادا کرتی ہے، ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ اب دینی مدارس کے تحت عصری دینی تعلیمی اداروں کے قیام کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ہے، بہت سے مدارس میں پرائمری یا مڈل کی حد تک اسلامیات کے ساتھ تعلیم کا نظام ہے، ان طلبۂ و طالبات میں سے ایک اچھی خاصی تعداد اس شعبہ سے نکلنے کے بعد عصری درس گاہوں میں چلی جاتی ہے، اسی طرح بہت

سے مدارس میں میٹرک تک یا اس سے آگے اقامتی وغیرا قامتی عصری درسگاہیں قائم کی گئی ہیں، یہ طلبہ تعلیم تو سرکاری نصاب کے مطابق حاصل کرتے ہیں ؛ لیکن دینی مدرسہ کا ماحول ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی عام طلبہ سے مختلف ہوتی ہے۔

ہندوستان میں اردو زبان مسلمانوں کے لئے خصوصی اہمیت کی حامل ہے، ہمارا نہایت بیش قیمت مذہبی ورثہ اسی زبان میں ہے، اگر نئی نسل کا رشتہ اس زبان سے کٹ جائے تو یہ ان کے لئے بہت ہی بڑا دینی واخلاقی نقصان ہے، وہ نہ صرف دین سے کٹ جائیں گے ؛ بلکہ ان کا رشتہ اپنی تاریخ سے بھی منقطع ہوجائے گا، آزادی کے بعد اس زبان کے ساتھ مسلسل زیادتی روا رکھی گئی، ایک تو اسے سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا گیا، پھر ریاستوں کی لسانی تقسیم اور اردو زبان کے حلقہ کو ہندی زبان کا حلقہ قرار دیئے جانے کی وجہ سے سوائے کشمیر کے اردو کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں رہی، واحد اردو یونیوسٹی جامعہ عثمانیہ کی لسانی انفرادیت ختم کردی گئی، اردو رسم الخط کو بدلنے اور اسے دیونا گری میں لکھنے کا نعرہ لگایا جانے لگا، اور حکومت کی شہہ پر بعض اردو ادیبوں نے بھی اس کی تائید کردی، ان حالات میں اگر یہ دینی مدارس نہیں ہوتے تو شاید ہندوستان سے اس زبان کا نام ونشان مٹ چکا ہوتا اور یہ مشاعروں کی واہ واہ اور فلموں کے ڈائلاگ تک محدود ہوجاتی، اس زبان کو زندہ رکھنے میں دینی مدارس کا کردار نا قابل فراموش اور نا قابل انکار ہے۔

اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھنا چاہئے کہ ان مدارس کے ذریعہ غرباء کی کس قدر مدد کی جاتی ہے اور باعزت طریقہ پر ان کی ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں ؟ ان مدرسوں میں نوے فیصد ؛ بلکہ پچانوے فیصد طلبہ ضرورت مند یا نہایت ضرورت مند گھرانوں کے ہوتے ہیں، مدارس ان کے لئے طعام وقیام اور تعلیم کے علاوہ بہت زیادہ نادار اور یتیم بچوں کے لئے کپڑوں اور وظائف کا بھی نظم کرتے ہیں، مثال کے طور پر اگر ایک دینی درسگاہ میں تین سو غریب بچے زیر تعلیم ہوں تو گویا روزانہ نو سو ضرورت مندوں کے اور مہینے میں ۲۷ ہزار ضرورت مندوں کے کھانے کا نظم ہوتا ہے اور دوسری ضرورتیں اس کے علاوہ ہیں، پھر یہ انتظام پورے عزت واحترام کے ساتھ عمل میں آتا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان مدارس کے ذریعہ ضرورت مندوں کی کفالت اور یتیموں کی مدد کا کتنا بڑا انظام قائم ہے !

غرض کہ دینی مدارس اسلام کی حفاظت واشاعت کی جہت سے بھی اور غرباء کی ضروریات کی تکمیل اور حاجت روائی کی نسبت سے بھی اتنی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں کہ شاید بڑی بڑی حکومتیں بھی اسے انجام دینے سے قاصر ہوں ؛ اس لئے مدارس اور دینی خدمت انجام دینے والی تنظیموں ، تحریکوں اور اداروں کی زکوۃ یا دوسرے طریقہ پر اعانت دین وملت کی ہمہ گیر خدمت میں شریک ہونا ہے ، موجودہ عالمی اور ملکی حالات کے پس منظر میں یہ ایک ترجیحی مصرف ہے اور مسلمانوں کو اس پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے ۔

۲۱، ۲۸/ستمبر ۲۰۰۷ء

ازخوابِ گراں خیز!

اس وقت میرے سامنے اردو زبان کے مختلف مختصر؛لیکن دیدہ زیب پمفلٹس ہیں،ان کے عنوانات بھی جاذب قلب ونظر ہیں، جیسے: ''خدا محبت ہے''،''ہم سچ مچ کس طرح بچ سکتے ہیں''، ''اپنے دشمن سے محبت رکھو''،''کیا آپ خدا کے وجود کے قائل ہیں؟''اور''زندگی کا نصب العین'' وغیرہ—— ان ورقیوں کے بیان وزبان کو دیکھ کر کوئی بھی شخص یہی خیال کرے گا کہ یہ مسلمانوں کی کسی تنظیم کی طرف سے شائع ہونے والے رسائل ہیں، جن کا مقصود مسلمانوں کے فکر وعمل کی اصلاح ہے؛لیکن جب آپ ان رسائل کو پڑھیں گے اوران میں مذکور تعلیمات کا جائزہ لیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ رسائل کسی مسلم تنظیم کے شائع کئے ہوئے نہیں ہیں؛ بلکہ یہ عیسائی مشن کی طرف سے شائع شدہ ہیں، جن کا مقصد مسلمانوں کو عیسائیت کی طرف بلانا اور راہ حق سے دور کرنا ہے۔

عام طور پر ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ عیسائی مشنریز دلت ہندوؤں میں کام کرتی ہیں، یہ بات ایک حد تک درست بھی ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسائیت کی اشاعت کا کام زیادہ تر نچلی ذاتوں میں اور قبائیلیوں میں ہوا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک یہ بات ناقابل قیاس سمجھی جاتی تھی کہ مسلمان دین حق سے منحرف ہوکر عیسائیت یا کوئی اور مذہب قبول کرلیں؛لیکن جہالت و پسماندگی کی وجہ سے اب صورت حال خاصی بدل چکی ہے اور اب مسلمانوں کی جاہل وپسماندہ آبادیاں بھی فتنۂ ارتداد کی زد میں ہیں، عیسائی مشنریز مدتوں سے اس بات پر غور کررہی ہیں کہ مسلمانوں کو کس طرح مرتد کیا جائے؟ اس کے لئے عالمی سطح کی متعدد خفیہ کانفرنسیں ہو چکی ہیں، جہاں جہاں مغرب کی استعماری قوتیں اپنے قدم جماتی ہیں، وہاں وہ مذہبی اعتبار سے عیسائیت کو پھیلانے کی بھی کوشش کرتی ہیں، عالم عرب میں عیسائی غلبہ والی مملکت ''لبنان'' اس کی

واضح مثال ہے، افریقی ممالک میں شروع سے عیسائیت نے اسلام کو اپنا حریف سمجھا ہے، مشنریز افریقی ملکوں میں بے دریغ مادی وسائل کا استعمال کرتی رہی ہیں اوران کا ارادہ تھا کہ اسے بیسویں صدی کے ختم تک عیسائی براعظم بنا کر رہیں گے؛ لیکن اسلام کی کشش اور جاذبیت ہے کہ ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا اور آج افریقہ میں حقیقی معنوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

ایشیائی ملکوں میں سب سے بڑا مسلم ملک انڈونیشا ہے، یہاں بڑی قوت سے عیسائیت کی یلغار جاری رہی اور صدر سوہارتو کے زمانہ میں عیسائی مشنریز نے کھل کر نہ صرف کام کیا؛ بلکہ مسلم تحریکات اور علماء پر عرصۂ حیات تنگ کر کے رکھ دیا، عیسائی دنیا کا خیال تھا وہ جزیروں کی اس مملکت کو گزشتہ صدی کے اختتام تک عیسائی مملکت میں تبدیل کردیں گی، طویل عرصہ تک ارتداد کا فتنہ یہاں اس طرح پنپتا رہا کہ مسلمان بھی اس کا اندیشہ کرنے لگے؛ لیکن حالات بدلے، بہت سے لوگ جو مرتد ہوگئے تھے، تائب ہوئے اور اب مسلمانوں میں اپنے دین کی طرف واپس آنے کی ایک ایسی لہر پیدا ہوگئی ہے، جس نے عیسائی دنیا کو مایوس و ناامید کردیا ہے، اسی طرح بنگلہ دیش میں اس وقت عیسائی مشنریز نہایت ہی تیزی کے ساتھ سرگرم ہیں اور مغربی ممالک کی طرف سے بنگلہ دیش کی فراخدلانہ معاشی مدد میں اس پہلو کو بھی خاصا دخل ہے۔

روس کے بکھرنے کے بعد امریکہ ایک نئی استعماری طاقت کی حیثیت سے ابھرا ہے اور اس کا خاص نشانہ مسلم ممالک ہیں، ان استعماری عزائم کے پیچھے جہاں معاشی حرص و ہوس کارفرما ہے کہ عراق پر قبضہ کر کے خلیج کے تیل کو حاصل کیا جائے اور افغانستان کے راستہ سے بحر اخضر کے تیل تک رسائی حاصل کی جائے، وہیں اس کا فائدہ عیسائی مشنریز نے بھی اٹھایا ہے، جب کسی خطہ میں امن و امان نہ ہو، لوگ خوف و ہراس کے ماحول میں زندگی گزارتے ہوں، انفرا اسٹرکچر تباہ و برباد ہو چکا ہو تو وہاں خدمت خلق اور تعلیم کا تھوڑا کام بھی لوگوں کو بہت متاثر کرتا ہے، عیسائی مشنریز اس کا فائدہ اٹھارہی ہیں، مولانا فضل الرحمٰن (پاکستان) کے بیان کے مطابق افغانستان میں تقریباً ایک لاکھ افراد عیسائی بن چکے ہیں، عراق میں کردوں کی تیل سے مالا مال پٹی میں عراق میں آباد مختلف عیسائی فرقوں کے بکھرے ہوئے افراد جمع ہورہے ہیں اور وہاں بھی تبلیغ عیسائیت کی خفیہ مہم زوروں پر ہے، امریکی دباؤ کے تحت ''قطر'' میں ایک ایسا چرچ تعمیر ہورہا ہے، جو نہ صرف یہ کہ خلیج میں پہلا چرچ ہوگا؛

بلکہ وہ ایشیا کے چند بڑے چرچوں میں ہوگا؛ حالاں کہ قطر کی اصل آبادی صد فیصد مسلمان ہے، پڑوسی ملک پاکستان بھی عیسائی تحریکوں کا خاص نشانہ ہے اور وہاں ارتداد اور توہین رسالت سے متعلق قوانین کی تبدیلی کا مغرب کی طرف سے دیرینہ مطالبہ رہا ہے۔

ہندوستان میں جب انگریز آئے، تو عیسائی مشنریز کا جال پورے ملک میں بہت تیزی سے پھیل گیا آج ہندوستان میں کئی چھوٹے چھوٹے صوبے عیسائی اکثریت کے ہوگئے ہیں، یا کم سے کم وہاں ان کی معتد بہ تعداد موجود ہے، یہ اسی کا اثر ہے، انگریزوں کی آمد اور مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو مرتد بنانے کی کم کوششیں نہیں کی گئیں اور اس کے لئے پادری صفدر علی اور پادری عماد الدین جیسے ایمان فروش لوگوں کو آلۂ کار بھی بنایا گیا؛ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ علماء کی بیدار مغزی اور فکر مندی کی وجہ سے ان کی یہ کوششیں بڑی حد تک ناکام رہیں، مولانا محمد رحمت اللہ کیرانویؒ، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ اور دوسرے بزرگوں نے عیسائیت کے رد میں ایسی مخلصانہ کوششیں فرمائیں اور اتنا قیمتی لٹریچر اس موضوع پر فراہم کیا کہ اسلام کی علمی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ احمد دیدات کے دنداں شکن اور مسکت مناظروں کا سرچشمہ مولانا کیرانویؒ کی کتاب ''اظہار الحق'' ہی تھا اور آج کل بعض حضرات نے جو مذاہب کے تقابلی مطالعہ کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اس پہلو سے مقبولیت حاصل کی ہے، وہ بھی براہ راست یا بالواسطہ مولانا کیرانویؒ سے استفادہ کرنے والوں میں ہیں۔

ہندوستان کو آزاد ہوئے اب ساٹھ سال کا عرصہ ہو چکا ہے، اس طویل مدت میں دیہات میں بسنے والے مسلمان طرح طرح کی دشواریوں سے دوچار رہے ہیں، آزادی کے فوراً ہی بعد مسلمان زمین داروں کی جاگیریں ان کے ہاتھوں سے نکل گئیں، تقسیم ملک کی وجہ سے بہت سے مسلمانوں نے اپنا وطن چھوڑ دیا، ملازمتوں کے دروازے آہستہ آہستہ ان پر بند ہوتے گئے، فسادات میں مسلمانوں کی املاک کو نشانہ بنانے کی وجہ سے تجارت اور کاروبار میں پسماندگی بڑھتی گئی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف کمیشنوں کی رپورٹ کے مطابق مسلمان اب دلت سے بھی زیادہ پسماندہ ہیں، اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دیہاتوں اور شہر کے مسلم علاقوں میں عیسائی مشنریز نے ایک نئے جوش وخروش کے ساتھ کام شروع کر دیا ہے، وہ مسلمانوں کی نفسیات اور ان کے مزاج

کے مطابق ، نیز اسلامی اصطلاحات وتعبیرات کی رعایت کے ساتھ اپنا لٹریچر مرتب کر رہے ہیں ، ہسپتالوں اور تعلیمی اداروں کے علاوہ انہوں نے نئی تکنیک غیر سودی قرضوں کی استعمال کی ہے ، یہ قرضے خواتین کی بہبود کے نام پر عورتوں کو فراہم کئے جاتے ہیں اور قرض کی اجرائی ،قسطوں کی ادائیگی اور خیر سگالی ملاقاتوں کے نام پر انہیں بار بار چرچ میں بلایا جاتا ہے ،عیسائیت سے مانوس کرایا جاتا ہے اور جو لوگ قرض ادا نہیں کر پائیں ،ان سے خاص طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ اس مذہب کو قبول کر لیں تو ان کے سارے قرض معاف کر دئے جائیں گے اور مزید سہولتیں فراہم کی جائیں گی ، یہ رعایت نہایت مؤثر ثابت ہوتی ہے اور کم فہم و ناواقف مسلمان ارتداد کے دام میں آجاتے ہیں ۔

ابھی ۷-۹/ نومبر کو ناگپور میں عیسائی مشنریز کی ایک خصوصی کانفرنس مسلمانوں میں کام کی نسبت سے منعقد ہوئی ، جس میں ملک کے مختلف گوشوں سے مرتد ہو کر پادری بننے والے چار سو افراد کو جمع کیا گیا اور مسلم معاشرہ میں عیسائیت کی تبلیغ کے طریقۂ کار پر غور کیا گیا ، اس میں وہ خصوصی لٹریچر بھی تقسیم کیا گیا ، جو مسلمانوں کی مناسبت سے اردو زبان میں لکھا گیا ہے اور جن میں سے چند کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ، اب ان کا اگلا اجتماع چند ماہ کے بعد لکھنؤ میں طے پایا ہے ۔

عیسائی مشنریز کے کاموں میں اضافہ کے کچھ خاص اسباب بھی ہیں ، ایک تو مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی پسماندگی اور مزید برآں ملکی اور عالمی سطح پر ان کی تذلیل اور اس کی وجہ سے امت میں پیدا ہونے والی مرعوبیت اور احساس کمتری ، دوسرے :— عالمی و ملکی سطح پر — مادی وسائل کی بہتات ، مغربی ممالک سرکاری اور عوامی سطح پر مشنریوں کی بے حد حوصلہ افزائی کرتے ہیں ، اسلامی تحریکات کا تعاون تو ایک ناقابل معافی جرم ہے ؛ لیکن عیسائی تبلیغی مشن کے تعاون پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا ، ان مادی وسائل سے مشنریز نے اندرون ملک جو ہسپتال اور تعلیمی ادارے قائم کئے ہیں ، وہ خود بڑے معاشی وسائل بن گئے ہیں ؛ اس لئے تبلیغی مشن پر بے دریغ پیسے خرچ کئے جاتے ہیں ، تیسرا سبب مغرب کا سیاسی دباؤ ہے ، امریکہ اور یورپ کے ملکوں نے انسانی حقوق کا نام لے کر ایشیائی ممالک پر دباؤ بنا رکھا ہے کہ انہیں بے روک ٹوک کام کرنے کا موقع دیا جائے ، چوتھا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ موجودہ عیسائیت حقیقی معنوں میں کوئی مذہب نہیں ہے ، یہ کچھ رسوم کا نام ہے ، جو تہذیب کا حصہ بن گئے ہیں ، جیسے کرسمس ہے ، اسے یورپ میں مذہبی جذبہ سے بہت کم منایا جاتا

ہے، ملحدین اور دہریے بھی گرم جوشی سے اس میں حصہ لیتے ہیں، گویا یہ مذہبی تہوار تہذیبی تہوار کی حیثیت اختیار کرچکا ہے، اس میں عمل کی کوئی دعوت نہیں ہے، نہ کچھ حلال ہے نہ حرام، کچھ فرض ہے نہ واجب، یہی وجہ ہے کہ آج عیسائی اقوام میں شراب نوشی، عریانیت، زنا اور جنسی انحراف کی جتنی کثرت ہے، کمیونسٹ ملکوں میں بھی نہیں؛ اس لئے عیسائیت کے قبول کرنے میں انسان کو اپنی نفس پرستی میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی ؛ بلکہ پوپ کے سامنے دو کلمۂ اعتراف کہہ کر مغفرت کا اطمینان بھی ہوجاتا ہے۔

بہر حال اسباب جو بھی ہوں، اس فتنۂ ارتداد کی گھٹا مسلمانوں کی طرف بڑھ رہی ہے، ان حالات میں دینی تحریکوں، جماعتوں، تنظیموں اور اداروں کا فریضہ ہے کہ وہ اس کے سدباب کے لئے باہم سر جوڑ کر بیٹھیں، ایک طرف مسلمانوں میں شعور پیدا کریں اور ایک مہم بنا کر فتنۂ عیسائیت سے مسلمانوں کو باخبر کریں، غیر سودی قرض کے اداروں کو فروغ دیں، دینی مدارس مسلمانوں کی ارتداد سے حفاظت کو اپنے مقاصد میں شامل کریں، اس کے لئے علماء کو تیار کریں اور ائمہ کے تربیتی اجتماعات رکھیں، مقامی زبانوں میں ردعیسائیت پر آسان اور عام فہم لٹریچر شائع کریں اور ایک دوسرے سے باخبر رہیں، کہیں اس فتنہ کی کوئی آہٹ محسوس ہو تو فوراً اس کا تعاقب کریں، خدمت خلق کے کاموں کی طرف خصوصی توجہ دی جائے، غریب آبادیوں میں خواتین کے لئے ووکیشنل کورس رکھے جائیں؛ تاکہ وہ خود اپنے لئے باعزت روزگار حاصل کرسکیں اور فقر ومحتاجی انہیں ارتداد کے راستہ پر نہیں لے جائے، اگر ہم نے ایسے فتنوں سے اپنی آنکھیں موندلیں اور ایک دفعہ مسلم معاشرہ میں فتنۂ ارتداد کو گھسنے کا موقع مل گیا، تو پھر یہ جڑ پکڑتا جائے گا اور اس کا تدارک دشوار ہوجائے گا، ضرورت ہے کہ ہم خواب غفلت سے بیدار ہوں اور خدا نے ہمیں جس دین حق کا امین بنایا ہے، اس کی حفاظت واشاعت کے لئے کمر بستہ ہوجائیں۔

۷/ دسمبر ۲۰۰۷ء

اسپین کا سبق

آپ بیتی کا اثر جگ بیتی سے بڑھ کر ہوتا ہے، آپ بیتی میں خون جگر کی سرخی اور جذبات و احساسات کی خوشبو بھی شامل ہوتی ہے، رنگ ونکہت کا حسن جب الفاظ کے پیکر میں ڈھلتا ہے تو پڑھنے والوں کے دلوں کی گہرائیوں میں بس جاتا ہے، ایسی ہی ایک آپ بیتی خوابوں کی زمین اسپین کی ہے، جہاں تفتیشی عدالتیں جور وظلم کی آگ لگا کر دلوں کو لرزا رہی ہیں، گلی کوچوں میں عرب مسلمانوں کی تلاش ہے، برسر عام مردوں کو تختۂ دار پر چڑھایا جارہا ہے، جگہ جگہ پھانسی کے پھندے جھول رہے ہیں، عورتوں کو ان کے بال سے باندھ کر لٹکا دیا گیا ہے، بہتوں کے پیٹ چاک کردیئے گئے ہیں، برسر عام ان کی آبروریزی کی جاتی ہے، سزا کے نت نئے طریقے آزمائے جارہے ہیں، ناخن اکھاڑے جارہے ہیں، ٹانگوں اور پہلوؤں پر آگ سے داغا جارہا ہے، انگلیاں کاٹ کاٹ کر منہ میں رکھ دی جاتی ہیں، کوڑوں کی بارش ہورہی ہے، ساری دنیا انسانیت سوزی کے ان مناظر کو دیکھ کر مسلمانوں کی مظلومیت، ان کی بے آبروئی اور ان کے ساتھ روا رکھے جانے والی غیر اخلاقی حرکتوں پر شاداں وفرحاں ہے؛ کیوں کہ مسلمانوں کی اذیت سے بڑھ کر ان کے لئے کوئی سامان تفریح نہیں۔

میری عمر اس وقت دس سال کی تھی، جب بھی میں درس گاہ سے آتا اور بتاتا کہ میں نے اسپینی زبان میں سے یہ اور یہ سیکھا ہے، اور ''کتاب مقدس'' (بائبل) میں سے یہ اور یہ یاد کیا ہے، تو میرے والد پر بے قراری اور بے بسی کی کیفیت نمایاں ہوجاتی، اس کے باوجود میری ماں صبح اسکول چھوڑنے کے لئے دور تک جاتی، مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میرے والدین کس مشقت اور تکلیف سے دوچار ہیں؟ دن گذرتے گئے اور میری حیرت ورنج میں اضافہ ہوتا گیا؛ یہاں تک کہ میرا مزاج اپنے ہم عمر ساتھیوں سے الگ تھلگ بن گیا، میں تنہائی کو پسند کرتا، دوستوں کے ہنسی، مذاق اور کھیل

کود سے الگ رہتا، ہر وقت میرے ذہن میں یہی فکر گردش کرتی رہتی کہ میرے والدین کیوں مغموم وفکرمند رہتے ہیں اور مجھے دیکھ کران کی فکر بڑھ کیوں جاتی ہے؟

ہاں، میرے گھر کے آخری حصہ میں ایک کمرہ تھا، اس میں صرف میرے والدین داخل ہوتے تھے، بہت بہت دیر تک وہ اس کمرہ میں رہتے اور کیا کرتے؟ اس کا کسی کو علم نہیں تھا، وہ جب اپنے کمرہ سے نکلتے تو چہرہ کا رنگ بدلا ہوا ہوتا، آنکھیں سرخ ہوجاتیں، جیسے خوب رونے کے بعد ہوجاتی ہیں یا جیسے کسی قریب ترین آدمی کی موت پر ہوتا ہے، وہ مجھے بڑے ملال کے ساتھ دیکھتے اور کچھ کہے بغیر آگے بڑھ جاتے، ایک رات جو اسپین میں ایک تہوار کی رات تھی، ''غرناطہ شہر'' مشعلوں سے جگمگا رہا تھا، صلیبیں ہر جگہ لٹکی ہوئی تھیں، خوبصورت غبارے سجے ہوئے تھے اور شہر کو دلہن کی طرح آراستہ کیا گیا تھا، میرے والد نے آخر شب میں مجھے بلایا، اس وقت گھر کے سارے لوگ سوئے ہوئے تھے، وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے اس حجرہ میں لے گئے جس میں صرف وہی جایا کرتے تھے، اور دروازہ بند کرلیا، پھر انہوں نے تلاش کرکے چراغ جلایا، اب وہ کمرہ میرے سامنے تھا، جس کی حقیقت سے میں اب تک واقف نہیں تھا، میں نے اپنے گردوپیش نظر ڈالی تو اس میں ایک چھوٹی سی بچھائی جانے والی چادر اور بلند جگہ پر ایک پرانی کتاب کے سوا اور کوئی چیز نہیں تھی، میرے والد نے مجھے اسی بستر پر بٹھایا اور فکرمندی کے ساتھ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، مجھ پر گھبراہٹ طاری تھی، اس کمرہ کو میرے گھر میں تقدس حاصل تھا، جس میں والد کے سوا کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی، اس کے معمولی سامان، رات کا سکون اور سارے لوگوں کا نیند کی حالت میں ہونا میرے لئے خوف کا باعث تھا۔

مگر میرے والد محبت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف متوجہ ہوئے، میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور مجھ سے نہایت نرمی کے ساتھ کہا: میرے بیٹے! اب تمہاری عمر دس سال ہوچکی، اب تم اس لائق ہوگئے کہ تم پر بھروسہ کیا جائے، میرے سینہ میں ایک راز ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم کو اس میں شریک بناؤں، تم بھی اسے اپنے سینہ میں چھپائے رکھوگے اور کسی بھی شخص پر —— جس کو تم جانتے ہو —— ظاہر نہیں کروگے؛ کیوں کہ اس راز کے بارے میں تمہارا ایک اشارہ بھی مجھے تفتیشی عدالتوں کے جلادوں اور قاتلوں تک پہونچادے گا —— تفتیشی عدالت کا نام سنتے ہی میرا

کلیجہ کانپ گیا؛ کیوں کہ میں تقریباً ہر دن ہی اس کے مقتولین کو دیکھتا تھا، مجھے ڈر لگنے لگا، میری زبان ایسی بند ہوگئی کہ کچھ کہنے کی طاقت نہیں رہی، میں خاموش ہوگیا اور کوئی جواب نہیں دیا —— والد نے پھر مجھ سے کہا: میرے بیٹے! تم کو کیا ہوگیا ہے؟ کیا تم اپنے باپ کے راز کو نہیں چھپا سکتے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں، میں ضرور چھپاؤں گا، والد نے پھر پوچھا: تم اپنی والدہ سے، بھائیوں سے، گھر کے تمام لوگوں سے اور اپنے ساتھیوں سے بھی اس کو مخفی رکھو گے؟ میں نے کہا: ہاں۔

والد نے کہا: بیٹے! اب میرے اور قریب آجاؤ اور خوب کان کھول کر سنو؛ کیوں کہ میں اپنی آواز بلند نہیں کرسکتا، کہیں کوئی سن لے، کہ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں، اور بات تفتیش کی عدالتوں تک پہونچ جائے تو وہ مجھے زندہ جلادیں گے اور میرا گوشت تک درندوں کو کھلادیں گے، میں قریب ہوگیا، میں نے کہا: ابا جان! میرا کان آپ کی طرف ہے، آپ جو کچھ کہیں گے، میں اسے اچھی طرح یاد رکھوں گا —— والد نے تپائی سے کتاب اٹھائی اور مجھ سے پوچھا: تم اس کتاب کو جانتے ہو؟ میں نے کہا: نہیں۔

والد نے کہا: یہ اللہ کی کتاب ہے، جو اس نے سب سے بہتر انسان پر اتاری ہے، میں نے کہا: یہ بائبل ہے، جس کو اللہ کے بیٹے یسوع لائے ہیں؟ والد نے ایک گونہ ڈانٹتے ہوئے کہا: یہ قرآن کریم ہے، جس کو اللہ —— جو یکتا اور بے نیاز ہے اور نہ اس کا کوئی والد ہے اور نہ اولاد —— نے روئے زمین کے سب سے بہتر انسان نبی عربی امی محمد بن عبداللہ ﷺ پر اتارا ہے، جنھوں نے انسانیت کو گمراہی سے نکالا، اس کو ہدایت کا راستہ دکھایا، انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کیا اور باطل مذاہب کے جور وظلم سے نجات دے کر اسلام کے عدل وانصاف سے ہمکنار کیا، جس کے بغیر کوئی قوم عزت ووقار حاصل نہیں کرسکتی۔

یہ اللہ کی کتاب ہے، جس میں باطل ہرگز داخل نہیں ہوسکتا، یہ حکمت والے قابل تعریف خدا کا اتارا ہوا ہے، یہ اسلام کی وہ کتاب ہے، جسے اللہ نے پوری انسانیت کے لئے دستور زندگی بنایا ہے، ہم تک اللہ کے یہ احکام سمندروں اور صحراؤں کے پار سے —— یعنی مکہ مکرمہ سے —— ایسے لوگوں کے ہاتھوں پہونچا ہے، جو اپنے معاملات اور جہاد میں پیکر اخلاق تھے، جو دوسروں کے خیر خواہ تھے اور خود فاقہ رہ کر دوسروں کے لئے ایثار سے کام لیتے تھے، انہوں نے آنکھوں سے پہلے

عقلوں کو روشن کیا، ہر انسان کے اندر چھپے ہوئے حقیقی انسان کو مخاطب کیا، بہترین روحانی صلاحیتیں اور مال خرچ کئے، یہاں تک کہ ستارے ان سے روشنی حاصل کرتے تھے اور ان کی طرف جھانکنے کے لئے نقاب رخ الٹتے تھے، چنانچہ انہوں نے مشرق ومغرب کے علاقہ فتح کئے، یہاں تک کہ ہمارے اس ملک میں بھی پہونچے، انہوں نے یہاں کے حکمرانوں سے گفتگو کی اور مطالبہ کیا کہ وہ اس دین کو پھیلائیں گے اور لوگوں کو اسلام اور اس کی تعلیمات سے روشناس کرائیں گے، وہ ظالم و جابر بادشاہ تھا، وہ لوگوں کو ہدایت سے محروم رکھنے اور اپنے ہی طریقہ پر چلانے پر مصر تھا۔

یہ بادشاہ ظلم پر، انسان کو غلام بنا کر رکھنے اور تلوار اور آگ سے انہیں سزائیں دینے پر مصر رہا، چنانچہ ان آنے والوں نے اس ظالم حکومت کو ختم کر دیا اور اس ملک کے فرمانروا ہوگئے، لوگوں کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک کا معاملہ کیا، جان ومال کے معاملہ میں امن قائم کیا اور آٹھ سو سال اس ملک میں رہے، انہوں نے اس ملک کو پوری طرح تبدیل کر دیا، تمدنی اور معاشی ترقی میں بھی اسے اوج کمال پر پہونچا دیا، یہاں تک کہ خوبصورت عمارتوں، علمی وتہذیبی ترقیوں اور انسانی اقدار کے تحفظ کی بناء پر دنیا اس علاقہ پر رشک کرنے لگی؛ کیوں کہ صرف عمارتوں سے ترقی نہیں ہوسکتی، جب تک ترقی کا دائرہ انسان کی روح اور اس کی عقل تک وسیع نہ ہوجائے —— ہاں، اے بیٹے! ہم لوگ عرب مسلمان ہیں —— میرے والد اس بات کو فخر سے کہہ رہے تھے اور مجھ پر خوف ودہشت مسلط ہوتی جا رہی تھی، میں چیخ پڑا: آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم عرب مسلمان ہیں؟ والد نے کہا: ہاں، اے میرے بیٹے! یہی وہ راز ہے، جس میں ہم تم کو شریک کرنا چاہتے تھے اور اب یہ راز میں نے تم تک پہونچا دیا ہے۔

والد کہتے جا رہے تھے: ''ہاں، ہاں، ہم عرب مسلمان ہیں، ہم ہی اس ملک کے مالک ہیں، ہم نے ہی اس تمدن کی تعمیر کی ہے، جو آج ہمارے دھوکہ باز دشمنوں کے ہاتھ میں ہے، ہم نے ہی ان بلند میناروں کو بنایا تھا، تاکہ یہاں سے ''اللہ اکبر'' کی آواز گونجے، ہم نے ہی ان مسجدوں اور تعلیم گاہوں کو بنایا ہے، جو اب گرجوں میں تبدیل ہو چکے ہیں؛ بلکہ جس جگہ پیشانیاں اللہ کے حضور جھکا کرتی تھیں، اب ان میں سے بعض کو گھوڑے کا اصطبل بنا دیا گیا ہے، خدا کی قسم! ہم ہی ہیں، جنہوں نے ان پلوں، سڑکوں اور پُر بہار باغات کو تعمیر کیا ہے، ہم نے اس زمین کو اپنے خون پسینہ

سے سینچا ہے —— لیکن چالیس سال پہلے شاہ ابوعبداللہ صغیر —— جو اس سرزمین پر آخری مسلمان بادشاہ تھا —— اہل اسپین کے وعدہ پر دھوکہ کھا گیا اور غرناطہ —— جسے اس کے آباء واجداد نے اپنی جانوں کی قیمت پر حاصل کیا تھا —— کی کنجیاں حوالہ کردیں اور ذلت وحسرت کی موت مرنے کے لئے محروم ومہجور تنہا مغرب کے صحرا کی طرف نکل گیا۔

اہل اسپین نے مسلمانوں سے امان، یہاں رہنے کی اجازت، انصاف اور آزادی کا وعدہ کیا تھا، پھر جب زمام اقتدار ان کے ہاتھوں میں آگئی، ان کی حکومت کو استحکام حاصل ہوگیا، تو انہوں نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا، خیانت کی، ہمارا خون مباح کردیا اور ہماری عورتوں کو بے آبرو کیا، اب ان کا واحد طریقۂ کار ظلم وجور تھا، انہوں نے تفتیشی عدالتیں قائم کیں، ہم لوگوں کو جبراً عیسائی بنایا، ہمیں عربی زبان چھوڑنے پر مجبور کیا گیا، ہم نماز پڑھنے اور عربی میں گفتگو کرنے سے بھی ڈرنے لگے؛ کیوں کہ ان عدالتوں کی طرف سے غیر انسانی ایذارسانی کو برداشت کرنے کی ہم میں تاب نہیں تھی، یہاں تک کہ جس کے بارے میں اطلاع پہونچتی کہ وہ نماز پڑھتا ہے یا عربی بولتا ہے، اسے قتل کردیا جاتا ہے، یا سولی دیدی جاتی ہے، اگر کسی کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم دیتا ہے یا عربی زبان سکھاتا ہے، تو پورے خاندان کو جلاوطن کردیا جاتا ہے، ...... میرے بیٹے! یہی راز ہے، تم اسے چھپائے رہو اور مجھے ایذاء سے دوچار نہ ہونے دو؛ کیوں کہ میں تم کو عربی زبان سکھانے اور کفر ونصرانیت سے اسلام اور نورِ ایمان کی طرف لانے سے پہلے مرنا نہیں چاہتا، —— میرے بیٹے! اب تم اپنے بستر پر چلے جاؤ''۔

اس کے بعد میں ہر معاملہ کو الگ نگاہ سے دیکھنے لگا، اب یہ غرناطہ وہ غرناطہ نہیں تھا، جس سے میں اب تک واقف تھا، اب یہ قصر الحمراء وہ حمراء نہیں تھا، جسے میں اب تک جانتا تھا، اب میں تمام چیزوں کو ایک نئی عینک سے دیکھتا تھا، اب میرے تصور میں اس زمین کے حقیقی معمار گھوم رہے تھے، جنھوں نے اپنے خون سے اس شہر کو سینچا تھا اور اسے عظمت وسربلندی عطا کی تھی، میں دل ہی دل میں کہتا تھا: اے غرناطہ اور حمراء! تو اس پستی کی حد تک کیسے پہونچ گیا؟ اب میں وقت بچا کر جلد سے جلد گھر آجایا کرتا تھا؛ تاکہ عربی زبان کا سبق یاد کرسکوں، جو میرے والد مجھے دیا کرتے تھے، میں نے اچھی طرح عربی میں گفتگو کرنا اور لکھنا سیکھ لیا اور قرآن وحدیث اور فقہ کے علوم کی طرف منتقل

ہوا، والد کے جس حجرہ سے میں ڈرتا تھا، اب وہی مجھے سب سے زیادہ محبوب تھا، میں آخر شب والد کے پیچھے نماز ادا کر یا کرتا تھا، اب ہمارے لئے ہمارے گھر میں یہی سب سے بہتر جگہ تھی، اس کے ساتھ ساتھ یہ خوف بھی میرا پیچھا کرتا رہتا تھا کہ کہیں میری زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکل جائے کہ لوگ سمجھ جائیں کہ میں مسلمان ہوں، میرے والد کو بھی اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں میرے ذریعہ یہ راز کھل نہ جائے، جس کے طشت از بام ہونے سے گردنیں اڑائی جاسکتی ہیں اور جان کے لالے پڑ سکتے ہیں؛ اس لئے والد میرا امتحان لیتے رہتے تھے اور میری والدہ کو بھیجتے تھے کہ وہ دریافت کریں کہ تمہارے والد تم کو کیا پڑھاتے ہیں؟ میں کہتا تھا: کچھ نہیں، وہ مجھ سے بات لینے کی بہت کوشش کرتی تھیں، مگر میں انہیں کچھ بتاتا نہیں تھا۔

جب میں نے اچھی طرح تعلیم حاصل کر لی، قرآن مجید کو سمجھ لیا اور قواعد فقہ سے روشناس ہوگیا تو والد نے اپنے بھائی سے میرا تعارف کرایا، چنانچہ عبادت اور تلاوت قرآن مجید میں ہم تینوں اکھٹے ہوتے تھے، یہاں تک کہ تفتیشی عدالت کی عرب مسلمانوں اور ان کی نسلوں پر دارو گیر اور بڑھ گئی، عرصہ سے یہ سلسلہ جاری تھا، کہ مجھ سے ایک دن میرے والد نے کہا: ان ظالموں کے ہاتھ شہادت کا شوق میرے دل میں چٹکیاں لے رہا ہے؛ تاکہ میں جنت حاصل کرسکوں اور کامیابی سے ہم کنار ہوں، تم کو کفر کی تاریکی سے نکالنے کے بعد اب اس گھر میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے، لہذا اگر مجھے کوئی بات پیش آئے تو اپنے ان چچا کی بات ماننا، ان کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرنا اور وہ جہاں جائیں، ان کے ساتھ چلے جانا، چنانچہ چند ہی دن گذرے تھے کہ چچا آئے اور انہوں نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا؛ کیوں کہ اللہ نے ہمارے لئے مغرب (مراکش) کی طرف فرار کا راستہ مہیا کر دیا تھا، میں جب بھی چچا سے کہتا: میرے والدین؟ تو وہ ڈانٹتے اور کہتے کہ کیا تمہارے والد نے تم کو میری بات ماننے کی نصیحت نہیں کی تھی؟ میں یہ سن کر مغموم و متفکر ان کے ساتھ چلتا رہتا، یہاں تک کہ جب ہم دور نکل گئے اور دشمنوں کے ظلم سے مامون ہوگئے تو چچا نے کہا: بیٹے! صبر کرو، اللہ نے تمہارے مؤمن والدین کے لئے شہادت کی سعادت لکھی ہے!

مؤمن ماں باپ کی آغوش میں پیدا ہونے والا یہ بچہ جب مسلمانوں کے ملک مغرب میں آ گیا تو تعلیم و تعلم میں یکسو ہو گیا، تاریخ اس بچے کو مشہور عالم اور مصنف ''محمد بن عبدالرفیع اندلسی''

کے نام سے جانتی ہے (محمد عمر باعثمان: امتع القصص والأخبار: ۲۸-۳۴)۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک ''ہندوستان'' اسپین نہ بننے پائے اور ایسے واقعات سے یہ سرزمین دوچار نہ ہوتو علامہ اقبالؒ کے بہ قول ہمیں مدارس کے نظام کوتقویت پہونچانا اور دینی تعلیم کو عام کرنا چاہئے کہ قومیں پُر شکوہ قلعوں اور خوبصورت عمارتوں سے زندہ نہیں رہتیں؛ بلکہ فکر وعقیدہ پر تسلسل سے باقی رہتی ہیں۔

۱۷/ستمبر ۲۰۰۸ء

سیاسی مہم کے بعد تعلیمی مہم

اسلامی علوم میں حدیث کو بڑی اہمیت حاصل ہے ؛ کیوں کہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے فرمودات ، معمولات اور حالات کو پیش کرتی ہے ، اور یہی ہے دین وشریعت کی بنا اور اساس ، حدیث کے موضوع پر مختلف پہلوؤں سے کتابیں مرتب کی گئی ہیں، ان میں ایک خاص اصطلاح ان کتابوں کی ہے، جن کو '' جامع '' کہا جاتا ہے، کتب حدیث کی ان قسموں کو جامع اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں ہر گوشۂ زندگی اور ہر پہلو سے متعلق حدیثیں موجود ہیں ، امام بخاری اور امام مسلم کے مرتب کئے ہوئے معتبر احادیث کے مجموعے اسی قسم میں داخل ہیں، جو بخاری شریف اور مسلم شریف کے نام سے معروف ہیں۔

ان مجموعوں میں مضمون کی اہمیت کے اعتبار سے حدیثوں کی ترتیب قائم کی گئی ہے ؛ چنانچہ عام طور پر ان کتابوں کے مرتبین نے پہلے ایمان کا عنوان قائم کیا ہے، پھر علم کا ، اس کے بعد نماز اور دوسرے احکام دین کا ، یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ اسلام میں ایمان کے بعد سب سے زیادہ اہمیت علم کو ہے، خود قرآن مجید میں دیکھیں تو رسول اللہ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پہلا کلام نازل ہوا، اس میں علم کا، قلم کا اور پڑھنے کا ذکر موجود ہے (العلق:۱-۵) دین سے متعلق علوم کی اہمیت تو ہے ہی اور وہ تو تمام علوم پر فائق ہے ؛ لیکن اس کے علاوہ ہر وہ علم جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو دین میں مطلوب ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے علم نافع کی دعا کیا کرو اور جو علم انسانیت کے لئے مفید نہ ہو اس سے اللہ کی پناہ چاہو: ''**سلوا اللہ العلم النافع وتعوذوا باللہ من علم لا ینفع** '' (ابن ماجہ، عن جابر بن عبداللہ ؓ، حدیث نمبر:۳۸۴۳) خود رسول اللہ ﷺ اسی طرح کی دعاء فرمایا کرتے تھے، حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصی دعاء یہ تھی کہ میں غیر مفید علم سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں: ''**اللھم إني أعوذ بک من علم لا ینفع** '' (ابن ماجہ،

عن ابی ہریرۃ ؓ، حدیث نمبر: ۲۵۰)، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں علم کی اصل تقسیم علم نافع اور علم غیر نافع کی ہے، نہ کہ علم دین اور علم دنیا کی۔

اسی لئے اسلام کے ابتدائی دور سے لے کر کم وبیش ایک ہزار سال کا عرصہ ایسا گزرا ہے، جس میں ایک ساتھ دونوں علوم حاصل کئے جاتے تھے، ایک شخص بیک وقت عالم دین بھی ہوتا تھا اور طبیب بھی، یا عالم دین بھی ہوتا تھا اور عالم فلکیات بھی، حکیم بوعلی سیناؒ، فارابیؒ، ابن رشدؒ، فخر الدین رازیؒ اور امام غزالیؒ وغیرہ، یہ سب وہ تھے، جو اپنے زمانہ کے مایہ ناز علماء بھی تھے اور مانے ہوئے سائنس داں اور فلاسفہ بھی؛ اسی لئے ان کی کتابوں میں قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ سائنسی نظریات اور عقلی مباحث بھی بہ کثرت ملتے ہیں، بعد کو علوم میں اتنی وسعت پیدا ہوگئی کہ ایک شخص کے لئے اتنے سارے علوم کا جامع ہونا ممکن نہیں رہا؛ بلکہ ایک ہی لائن میں جو قلب کا ڈاکٹر ہوتا ہے، وہ آنکھوں کا آپریشن نہیں کرسکتا، جو تعمیرات کا انجنیئر ہوتا ہے اسے الکٹرونک شعبہ سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی، اسی طرح اسلامی علوم میں بھی بہت پھیلاؤ پیدا ہوگیا تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ وغیرہ کے دائرے اتنے وسیع ہوگئے کہ ایک شخص بیک وقت محدث بھی ہو اور فقیہ بھی، یہ بات دشوار ہوگئی؛ اس لئے آج کے دور میں اگر کچھ لوگوں نے علم دین کے تعلیم وتعلم کے لئے اپنے آپ کو یکسو کرلیا ہے تو یہ ایک بہتر اور قابل عمل طریقہ ہے؛ چنانچہ دینی تعلیمی اداروں نے اپنے لئے اسی راستہ کا انتخاب کیا ہے، مگر انہوں نے کبھی بھی دوسرے نافع علوم کی مخالفت نہیں کی، اور جیسے عیسائیوں کے یہاں سائنس دانوں اور مذہبی رہنماؤں میں تصادم کی صورت پیدا ہوئی، مسلمانوں کے یہاں پوری تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے دین ودنیا کے فاصلوں کو سمیٹ دیا اور ہر علم نافع کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

آج کل ایک تصور مسلمانوں میں بھی اور دوسری قوموں میں ان سے بڑھ کر یہ پیدا ہوگیا ہے کہ علم صرف روزگار کا وسیلہ ہے، اگر تعلیم حاصل کرے اور وہ علم کسبِ معاش کا ذریعہ نہ بن سکے تو بے فائدہ ہے، اسلام کا نقطۂ نظر اس سے مختلف ہے، اسلام کا تصور ہے کہ علم بذات خود ایک جوہر ہے، اس سے انسان کی زندگی میں روشنی پیدا ہوتی ہے، اس کا فکری اور عملی رویہ بدلتا ہے؛ اس لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: علم روشنی ہے: ''**العلم نور**'' (حلیۃ الأولیاء: ۶/۳۱۹، عن مالک بن أنس ؓ)

اورقرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ جولوگ علم سے بہرہ ورہوں اور جوعلم سے محروم ہوں، دونوں برابر نہیں ہوسکتے:

﴿ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُونَ ﴾

(الزمر :۹)

یہی تصور ہمارے ذہنوں میں علم نافع کے بارے میں بھی پیدا ہوگیا کہ علم کے نافع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ پیسے کمائے جاسکتے ہوں ؛ لیکن اسلام میں علم کے نافع ہونے کا تصور بہت وسیع ہے، اس میں اپنا نفع بھی شامل ہے اور دوسروں کا بھی، اس میں دنیا کا نفع بھی شامل ہے اور آخرت کا بھی، اگر آپ نے اپنے علم کے ذریعہ کوئی ایسا کام کیا، جس سے آپ کوکوئی مالی منفعت تو حاصل نہیں ہوسکی ؛ لیکن انسانیت کواس سے راحت میسر آئی تو یہ بھی نہ صرف علم نافع ہوا ؛ بلکہ زیادہ نافع علوم میں اس کا شمار ہوگا ، اگر آپ نے انسانیت کے نفع کی کوئی چیز ایجاد کردی، سماج کو فائدہ پہنچانے والی کوئی کتاب لکھ دی تو ہوسکتا ہے کہ آپ کوخود اس کا کوئی بڑا معاشی نفع نہ پہنچ سکے ؛ لیکن اس صورت میں جب آپ دنیا سے جائیں گے تو نافع ترین علم کو چھوڑ کر جائیں گے، اسی پس منظر میں رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کو دیکھیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب انسان دنیا سے جاتا ہے تو اس سے عمل کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے، ایک یہ کہ وہ صدقۂ جاریہ کر کے جائے ، دوسرے: اس کی وہ علمی خدمت، جس سے بعد میں بھی لوگ نفع اٹھاتے رہیں: ''**علم ينتفع به** ''، تیسرے: اس کی صالح اولاد ہو جواس کے حق میں دعائے خیر کریں، (مسلم، عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر: ۱۶۳۱) اس میں '' وہ علم جس سے نفع پہنچتا ہے'' میں دینی علوم تو شامل ہیں ہی ؛ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ عصری علوم اس میں شامل نہ ہوں ، بشرطیکہ علم کا یہ مقصد لوگوں کے ذہن میں رہے کہ علم اصل میں کمانے کا ذریعہ نہیں ؛ بلکہ خلق خدا کو نفع پہنچانے کا ذریعہ ہے، اگر ایسا ہو جائے تو آج زندگی کے مختلف شعبوں میں ماہرین کی طرف سے استحصال اور خودغرضی کا جو رویہ پایا جاتا ہے، وہ بھی نہ ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ نے علم ودانش کی اہمیت کو ایک بڑی ہی اچھی مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے، اس کو اس طرح سمجھنا چاہئے کہ اگر آپ کے گھر کوئی بچہ پیدا ہوا تو یقیناً اس سے آپ کو مسرت ہوگی ؛

کیوں کہ انسان کو اولاد تو بعض اوقات اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے؛ لیکن اگر خدانہ خواستہ آپ کا بچہ گم ہو جائے، آپ تلاش کر کے تھک جائیں اور اس کے لئے تمام وسائل استعمال کرلیں؛ یہاں تک کہ اس سے ناامید ہو جائیں کہ آپ کو اچانک معلوم ہو کہ فلاں جگہ آپ کا بچہ موجود ہے، آپ امید وبیم کے ساتھ بے تابانہ وہاں پہونچیں اور پھر اپنے بچے کو وہاں موجود پائیں تو آپ کے کیا جذبات ہوں گے؟ آپ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوگا، شاید بڑا سے بڑا ادیب بھی آپ کے ان جذبات مسرت کا نقشہ نہیں کھینچ سکے، اور اچھے سے اچھے شاعر کے تخیل کی پرواز بھی وہاں تک نہ پہنچ پائے، غرض کہ گمشدہ چیز کے حاصل ہونے سے انسان کو کئی چند خوشیاں حاصل ہوتی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے انسان کی اسی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے فرمایا کہ علم و دانش کی باتیں جہاں سے بھی حاصل ہو جائیں وہ مؤمن کا گم شدہ مال ہے:

" الكلمة الحكمة ضالة المؤمن فحيث وجدها فهو أحق بها " (سنن الترمذی ،عن أبی هريرة ﷺ، كتاب العلم ، باب فضل الفقه على العبادة ،حدیث نمبر:۲۶۸۷،سنن ابن ماجة ، كتاب الزهد ، باب الحكمة ،حدیث نمبر:۴۱۶۹)

گویا جس طرح انسان اپنی گم شدہ چیز کو کمال اشتیاق کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح علم وفن کو حاصل کرے، ظاہر ہے کہ اس میں تمام ہی نافع علوم شامل ہیں۔

افسوس کہ جس امت کو سب سے پہلے اپنے نبی کے ذریعہ تعلیم کی دعوت ملی اور جس کے دین میں ایمان کے بعد سب سے زیادہ اہمیت علم کی ہے، وہی امت ہمارے ملک میں تعلیمی اعتبار سے سب سے زیادہ پسماندہ سمجھی جاتی ہے اور جتنے کمیشن قائم ہوتے ہیں وہ سب اس کی جہالت اور علم سے محرومی کی شہادت پر ختم ہوتے ہیں، ہمیں حکومت سے بجا طور پر شکایت ہے، وہ مسلمانوں کو تعلیم سے محروم رکھنے کے منصوبہ بند پروگرام پر کام کر رہی ہے؛ لیکن خود دار اور جفاکش قومیں دوسروں کی بیساکھی پر اپنا سفر طے نہیں کرتیں، وہ خود اپنا راستہ بناتی اور منزل مقصود تک پہونچتی ہیں، ضرورت ہے کہ پورے ملک میں مسلمان تعلیمی ترقی کے لئے ایک مہم لے کر اٹھیں اور شہر شہر قریہ قریہ؛ بلکہ گھر گھر پہنچ کر مسلماں بچوں کو تعلیم سے جوڑنے کی کوشش کریں، اس کے بغیر صرف حکومت سے شکوے

کرنے اور ایک دوسرے کو قصور وار قرار دینے سے ہرگز یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

ایسا نہیں ہے کہ مسلمان طلبہ میں صلاحیت نہیں ہے، اس سال ماشاء اللہ ۳۸/مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں نے آئی، اے، ایس میں کامیابی حاصل کی ہے، اگر چہ مسلمان آبادی کے اعتبار سے یہ تناسب کم ہے؛ لیکن آئی، اے، ایس کے لئے گریجویشن ضروری ہے اور مسلمان گریجویٹس کے اعتبار سے وہی تناسب ہے جو برادران وطن کے گریجویشن کے لحاظ سے آئی، اے، ایس مکمل کرنے والوں کا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے یہاں اصل مسئلہ تعلیمی سلسلہ منقطع کرنے کا ہے، ہمارے بچوں کی ایک بڑی تعداد ساتویں جماعت پاس کرنے کے بعد ہائی اسکول میں داخل نہیں ہوتی، پھر میٹرک میں کامیاب ہونے والوں کی ایک بڑی تعداد انٹر نہیں کرتی، پھر ڈگری کرنے والوں کی تعداد ان سے بھی کم ہو جاتی ہے، اس طرح پرائمری تعلیم شروع کرنے کے بعد سے اعلیٰ تعلیم تک پہنچنے والے بچوں کا تناسب مسلمانوں میں بہ مقابلہ دوسری قوموں کے بہت کم ہو جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اعلیٰ امتحانات پاس کرنے والے مسلمان نہایت قلیل تعداد میں ہوتے ہیں؛ حالاں کہ انہیں سے حکومت کی مشنری بنتی ہے، کوئی بھی پارٹی برسر اقتدار آئے، ان اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل انتظامیہ کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے، اور حکومتیں بھی ان کے مشوروں سے آزاد نہیں ہو پاتیں ؛ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج مسلمانوں کے ساتھ جو ناانصافی اور زیادتی ہو رہی ہے، اس میں مقتدر گروہ سے زیادہ دخل سنگھ پریوار کی تربیت یافتہ انتظامیہ کا ہے، جو عدلیہ تک میں سیکولرزم کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔

ابھی انتخابی معرکہ آرائی ختم ہوئی ہے، اس بار ملک، ریاستوں اور مختلف شہروں کی سطح پر سیاسی نمائندوں نے جس قدر جد و جہد کی ہے اور ایک ایک شخص تک پہنچ کر اپنا پیغام پنچانے کی کوشش کی ہے، شاید ہی ماضی قریب میں اس کی نظیر مل سکے، ضرورت ہے کہ انتخابی مہم کے بعد مسلمان اسی طرح کی تعلیمی مہم شروع کریں اور مذہبی، سماجی اور سیاسی قائدین باہمی اشتراک سے ہر گلی کوچے میں پہنچ کر، نیز گھر گھر گشت کر کے لوگوں کو ترغیب دیں کہ وہ اپنے بچوں کے تعلیمی سلسلہ کو منقطع نہ کریں، وہ ان کی مشکلات کو سنیں، ان کی دشواریوں کو حل کریں اور اس کے لئے ماحول بنائیں، تعلیم سے جوڑنے کے لئے ہمیشہ پیسوں کی ضرورت نہیں ہوتی، بعض دفعہ حوصلے بڑھانے

اور راستہ بتانے کی ضرورت ہوتی ہے ، بعض اوقات گورنمنٹ کی اسکیموں سے واقف کرانا کافی ہوجاتا ہے، بعض دفعہ ان اسکیموں تک رسائی کے لئے اثر ورسوخ کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے، بعض اوقات معمولی مالی تعاون سے ایک بچہ تعلیم سے محروم رہنے سے بچ سکتا ہے، غرض کہ تھوڑی سی کوشش کے ذریعہ قوم کے بہت سے بچوں کو تعلیمی محرومی سے بچایا جاسکتا ہے اور پوری امت کو سر بلندی سے ہمکنار کیا جاسکتا ہے، کاش، ہم اس طرف توجہ دیں!!

۲۲/مئی ۲۰۰۹ء

مرکزی مدرسہ بورڈ — آب یا سراب؟

بحیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دین حق اپنی آخری صورت میں مکمل طریقہ پر نازل ہوا، آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا اور نہ اب اللہ کا کلام اتر سکتا ہے:

﴿ اَلْیَوْمَ أَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الإِسْلاَمَ دِیْناً﴾ (المائدہ :۳)

لیکن انبیاء کا بنیادی کام قیامت تک باقی رہے گا اور وہ کام ہے قرآن مجید کی تلاوت، کتاب وسنت کی تفہیم وتشریح اور لوگوں کو کتاب وسنت کے سانچے میں ڈھالنا اور انہیں صراط مستقیم پر قائم رکھنا:

﴿یَتْلُو عَلَیْھِمْ آیَاتِہِ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ ﴾ (آل عمران :۱۶۴)

یہ کام آپ ﷺ کے بعد علماء امت کے سپرد کر دیا گیا، اسی کو قرآن مجید نے ''تفقہ فی الدین'' سے تعبیر کیا ہے؛ چنانچہ فرمایا گیا کہ امت میں ایک ایسا گروہ ہونا چاہئے، جو دین کا تفقہ رکھتا ہو، دین میں تفقہ کیا ہے؟ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے الفاظ و معانی پر دسترس حاصل کرنا اور یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ تفقہ فی الدین کا مقصد صرف خود دین دار ہو جانا نہیں ہے؛ بلکہ ان لوگوں کو دین کی طرف بلانا ہے، جس کے لئے قرآن مجید میں مختلف اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں، ان میں سے ایک ہے ''اِنذار''، یعنی محبت، دلسوزی اور رحم دلی کے جذبہ کے ساتھ لوگوں کو آخرت کی ناکامیوں سے ڈرانا اور آخری حد تک انہیں اس محرومی سے بچانے کی کوشش کرنا:

﴿ فَلَوْلاَ نَفَرَ مِن کُلِّ فِرْقَۃٍ مِّنْھُمْ طَآئِفَۃٌ لِّیَتَفَقَّھُوْا فِیْ الدِّیْنِ

وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾ (التوبہ:۱۲۲)

اسی طبقہ کو حدیث میں علماء کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ’’ إن مثل العلماء في الأرض كمثل النجوم في السماء يهتدي بها في ظلمات البر والبحر فإذا انطمست النجوم أوشك أن تضل الهداة ‘‘ (مسند احمد بن حنبل ،حدیث نمبر: ۱۲۶۲۱،عن انس بن مالک ﷛)
>
> ’’زمین میں علماء اسی طرح ہیں جیسے آسمان میں ستارے، رات کی تاریکی اور سمندر کی اتھاہ وسعتوں میں ستاروں کے ذریعہ رہنمائی حاصل کی جاتی ہے، ستارے خود روشن ہوتے ہیں اور ان کے وجود سے روشنی پھوٹتی ہے‘‘

گویا اس تشبیہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ علماء امت کے دینی رہنما اور مقتدیٰ ہیں، ان کی ذمہ داری ہے کہ امت کی رہنمائی کریں اور امت کا فریضہ ہے کہ وہ ان سے رہنمائی حاصل کرے، اگر کوئی عالم امت کو دین کی طرف بلانے سے غفلت برتتا ہے اور ان کی بے دینی اور فکری وعملی بے راہ روی پر فکر مند نہیں ہوتا، تو وہ اپنی بنیادی ذمہ داری سے غافل ہے، وہ ایسا فوجی ہے، جو دشمن کی ریشہ دوانیوں سے آنکھیں موندے ہوا ہے، اور وہ ایسا ڈاکٹر ہے، جسے اپنے مریضوں کی تکلیف کا احساس نہیں، وہ ایک بے حس اور فرض ناشناس معالج ہے، اسی طرح امت کا فریضہ ہے کہ وہ علماء سے رہنمائی حاصل کریں اور انہیں کی ہدایت کو اپنے لئے نشانِ راہ بنائیں، جیسے مریض معالج سے بے نیاز ہو کر صحت یاب نہیں ہوسکتا، اسی طرح ایک مسلمان خواہ مادی ترقی میں کتنے بھی اونچے مقام کو پہنچ جائے، علماء سے مستغنی ہو کر وہ دین کے معاملے میں صحیح راستہ پر قائم نہیں رہ سکتا، اس حدیث سے یہ بھی واضح ہوا کہ علماء کے لئے حاملِ علم ہونا کافی نہیں؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے وجود سے عمل کی روشنی پھوٹتی ہو اور اس کے سراپا سے تقویٰ کا نور جھلکتا ہو۔

علماء کے اس منصب ومقام کو رسول اللہ ﷺ نے واضح کرتے ہوئے ایک اور موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں؛ کیوں کہ انبیاء درہم ودینار کی میراث چھوڑ کر نہیں جاتے؛ بلکہ علم کی میراث چھوڑ کر جاتے ہیں؛ لہٰذا جس نے دین کا علم حاصل کیا اس نے میراث نبوی کا بڑا حصہ

پالیا:

" ... وإن العلماء ورثة الأنبياء وإن الأنبياء لم يورثوا دينارا ولا درهما ، ورثوا العلم فمن أخذه أخذ بحظ وافر "

(سنن أبي داؤد ، كتاب العلم ، باب الحث على طلب العلم ، **حدیث** *نمبر*:۳۶۴۳،سنن الترمذي ، كتاب العلم ، باب ما جاء في فضل الفقه على العبادة ، *حدیث نمبر*:۲۸۹۸)

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ علوم جن کے ذریعہ مادی ترقی حاصل ہو، اگر چہ انہیں حاصل کرنا جائز ہے؛ لیکن یہ انبیاء کی میراث نہیں ہے، انبیاء کی میراث علوم دین کا حاصل کرنا اور روحانی اعتبار سے ترقی حاصل کرنا ہے۔

ایک زمانہ ایسا تھا کہ دینی علوم کے حاصل کرنے سے مادی ترقی بھی متعلق تھی اور روحانی ترقی بھی، اس کے ذریعہ اعلیٰ سرکاری ملازمتیں ملتی تھیں، اسلامی حکومتوں میں قاضی اور مفتی کے عہدے قائم تھے، امر بالمعروف اور دفع مظالم کا محکمہ تھا، یہ ان کے لئے مختص تھے اور انہیں اونچی تنخواہیں ملتی تھیں، لوگ نہ صرف دینی جذبہ کے تحت؛ بلکہ دنیوی فائدہ کے نقطۂ نظر سے بھی ان علوم کو حاصل کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ امام غزالیؒ نے ''اِحیاء علوم الدین'' میں اس بات پر سخت افسوس ظاہر کیا ہے کہ مسلمان عہدۂ قضاء کو حاصل کرنے کے لئے تو علم فقہ کی طرف توجہ کرتے ہیں؛ لیکن میڈیکل تعلیم کی طرف توجہ نہیں دیتے، اس کی وجہ سے ایسے مسائل میں - جو طب سے متعلق ہیں - غیر مسلموں پر انحصار کرنا پڑتا ہے؛ لیکن عربوں کی حکومت اور خاص کر مسلم حکومتوں کے خاتمہ کے بعد یہ صورت حال باقی نہیں رہی، دینی تعلیم سے کوئی بڑی معاشی منفعت متعلق نہیں رہی، اور ان علوم کے حاصل کرنے والوں پر بڑی حد تک مادی ترقی کا دروازہ بند ہو گیا، اس کے نتیجہ میں دینی تعلیم کی طرف لوگوں کا رُخ کم ہوتا گیا، جس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کا جب قیام عمل میں آیا تو بانی دارالعلوم نے اس بات پر خصوصیت سے زور دیا کہ طلبہ کی تکثیر پر توجہ دی جائے، یعنی کوشش کی جائے کہ طلبہ زیادہ سے زیادہ ہوں، آج نہ صرف اسی دارالعلوم سے؛ بلکہ بہت سے مدرسوں سے سینکڑوں طلبہ واپس کر دئے جاتے ہیں اور ان

کا داخلہ نہیں ہوتا؛ لیکن اس کا ابتدائی دور اس طرح تھا کہ غالباً طلبہ کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے چالیس سال تک وہاں مطبخ قائم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

ان حالات میں ہندوستان کے برگزیدہ علماء نے مدارس اسلامیہ کی تحریک شروع کی، اگر ان مدارس کا مقصد ایک جملہ میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ یہ وارثین انبیاء پیدا کرنے کے لئے ہیں، یہاں سے وہ لوگ پیدا ہوں جو پیغمبر اسلام ﷺ کی میراث کی حفاظت کریں، اس کو مسلم معاشرہ میں زندہ رکھیں، اس کو انسانی آمیزشوں سے بچائیں اور اس امت کو سرمایۂ ایمان سے محروم ہونے نہیں دیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مدارس ان مقاصد کو کامیابی کے ساتھ پورا کر رہے ہیں اور یہ شجر طوبیٰ، جسے حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے خلفاء باتوفیق نے مغل سلطنت کے زوال کے بعد لگایا تھا، آج اس کا سایۂ رحمت پوری دنیا میں مسلمانوں کو روحانی ٹھنڈک عطا کر رہا ہے اور مشرق بعید سے لے کر مغرب کی آخری سرحدوں تک مدارس کا یہ نظام قائم ہے، ان مدارس کی قیادت علماء اور صالحین کے ہاتھوں میں ہے، اس کی ضرورتیں مخلصین امت کے تعاون سے پوری ہوتی ہیں، یہ تعاون وتناصر علماء اور عوام کے درمیان رابطہ کا ایک اہم ذریعہ ہے، عوام میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنے دین وشریعت کی حفاظت خود کریں گے اور اہل مدارس میں جوابدہی کا احساس اور احسان مندی کا جذبہ پروان چڑھتا ہے، یہی علماء اور عوام کا رابطہ اس امت کے ایمان واعمال کی حفاظت کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے، یہ نظام جس قدر سرکاری اثر سے آزاد رہے گا، اسی قدر علماء اور عوام کے ارتباط پر اس کا انحصار ہوگا، اور اسی نسبت سے مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت ہوگی۔

گورنمنٹ کی طرف سے مرکزی مدرسہ بورڈ کے قیام کی مسلمانان ہند کی تمام تنظیموں، اداروں اور قابل ذکر شخصیتوں نے مخالفت کی ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، جمعیۃ علمائے ہند، جماعت اسلامی ہند، آل انڈیا ملی کونسل، دارالعلوم دیوبند، مسلم مجلسِ مشاورت وغیرہ سبھوں نے بہ اتفاق رائے اس کی مخالفت کی ہے، اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ گورنمنٹ کی مدد اور اس کی مداخلت مدارس کے بنیادی کردار کو متاثر کر دے گی، مدارس صرف تعلیم ہی نہیں دیتے ہیں؛ بلکہ اپنے فضلاء کے اندر دینی حمیت اور ایمانی غیرت بھی پیدا کرتے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ کوئی عالم فتنۂ ارتداد کو برداشت نہیں کر سکتا، امت کی بداعمالی پر اس کی زبان خاموش نہیں رہ سکتی، اس کا قلم ہمیشہ

اپنی شریعت کے اعتبار سے دین حق کی ترجمانی اور باطل کی مخالفت پر مجبور ہے، اس کا دماغ ہمیشہ ایسے نقشے بناتا ہے، جس سے کسی نہ کسی پہلو سے اسلام کی اشاعت وسر بلندی متعلق ہو، اسی لئے پچھلے ڈیڑھ سوسال میں اسلام کی مدافعت، مسلمانوں کی اصلاح اوران کے حقوق کی بازیابی کی جو بھی تحریک اٹھی ہے، اس میں ان مدارس کے فضلاء پیش پیش رہے ہیں، اوران درسگاہوں نے ان کے لئے بنابنایا انفراسٹرکچر فراہم کیا ہے، امت کے لئے فکرمندی، دین کے لئے قربانی اورانسانیت کی بےغرض خیرخواہی کا جذبہ، نیز ان مقاصد کے لئے مادی محرومی کو گوارا کرنا اورحرص وہوس کی دوڑ سے اپنے آپ کوالگ رکھنا، صرف تعلیم کے ذریعہ پیدانہیں ہوسکتا؛ بلکہ مدارس کا ماحول، اس کا تعلیمی نظام، اساتذہ کے اندر قناعت کا جذبہ، مدارس کی فضا میں شب وروز قال اللہ وقال الرسول کی گونج اوراس گئے گذرے دور میں بھی روحانیت کا چرچا اور مادی ترقیوں کے تذکروں سے گریز، اوردن ورات اس بات کا ذکر کہ دنیا کی عیش کوشی اورعشرت سامانی ہماری منزل نہیں ہے، یہ سب وہ چیزیں ہیں جومل کر ایمانی حمیت کو وجود بخشتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج امت کی غفلت اورقدر ناشناسی کی وجہ سے دین کے خدمت گزاروں کو ناقابل بیان حد تک قلیل تنخواہیں ملتی ہیں؛ لیکن اس کے باوجود ایسی خبریں نہیں آتیں کہ ان میں سے کسی نے غربت وافلاس سے تنگ آکر خودکشی کرلی ہو، یا چوری اورڈاکہ کا راستہ اختیار کیا ہو، یانکسل تحریک میں شامل ہوگیا ہو۔

اگر صرف تعلیم سے یہ کردار پیدا ہوسکتا تو ہمارے ملک میں کتنی ہی یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبے ہیں، جہاں اساتذہ کواونچی تنخواہیں اورطلبہ کواسکالرشپ کی سہولتیں حاصل ہیں، جہاں عرق ریزی سے علمی وتحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں اورداد تحقیق دی جاتی ہے، بیش قیمت لائبریریاں ہیں؛ لیکن آپ ہی غور کریں کہ اسلام کے خلاف جو فتنے اٹھتے ہیں ان کی مدافعت میں، اورمسلمانوں کے ایمان کی حفاظت اوران کے اعمال کو درست رکھنے میں ان اداروں سے پیدا ہونے والی شخصیات کا کیا کردار رہا ہے؟ یہ ایک آزمودہ حقیقت ہے کہ —— الا ماشاء اللہ —— ان کا قلم اٹھتا نہیں ہے، جب تک اس میں روپے اورڈالر کی روشنائی نہ ڈال دی جائے، ملت پر کتنی ہی بڑی آزمائش آجائے؛ لیکن ان کی زبان کھلتی نہیں ہے کہ کہیں ان کی ملازمت پر کوئی حرف نہ آجائے ،انہیں حکومت کے چشم وابرو کو دیکھ کر کوئی بات کہنی اورلکھنی پڑتی ہے، کم وبیش یہی حال ان اسلامی

یونیورسٹیوں کے فضلاء کا ہے، جو مختلف مسلمان ملکوں میں حکومت کے زیر انتظام قائم ہیں، آپ ان کے دلوں میں جھانک کر دیکھیں اور کسی قدر کریدیں، ان کا منتہائے مقصود محض سرکاری ملازمتوں اور ان کے ذریعہ اعلیٰ تنخواہوں کا حصول ہے، اور کچھ باضمیر لوگوں کو چھوڑ کر ان کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ حکومت کی ہر روا اور ناروا بات پر مہر لگانے کو تیار ہیں، اکبر نے تو اپنے لئے صرف ایک ابو الفضل اور فیضی کو کافی سمجھا تھا؛ لیکن یہ جمہوریت اور ترقی کا دور ہے؛ اس لئے صرف ان اداروں کے ذریعہ ہر دن سیکڑوں ابو الفضل اور فیضی پیدا ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اس امت کی ان سے حفاظت فرمائے!

مرکزی مدرسہ بورڈ کی حمایت میں چند باتیں خاص طور پر کہی جارہی ہیں، ان کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ضروری ہے، ایک بات یہ کہی جارہی ہے کہ حکومت مدارس کے نظام میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی، صرف چند عصری مضامین کا اضافہ کرے گی اور اس کی تعلیم کے لئے مدد دے گی؛ کیوں کہ مجوزہ بل میں اس کی صراحت کی گئی ہے۔

مگر یہ کس قدر سادہ لوحی کی بات ہے، جو ادارہ قانون بنانے کا مستحق ہوتا ہے، وہی قانون میں تبدیلی کا بھی مجاز ہوتا ہے، اگر آج حکومت نے ایک قانون بنایا تو وہ پتھر کی لکیر نہیں ہے، کل اس میں حکومت کی طرف سے تبدیلی ہوسکتی ہے، یہ ہماری حکومت ہی ہے، جو دستور میں مسلم پرسنل لا کو بنیادی حق تسلیم کرنے کے باوجود فوج داری قانون کے واسطہ سے قانونِ شریعت میں تبدیلیاں کر چکی ہے؛ اس لئے اس طرح کے وعدے بہلاوے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، بلکہ حکومت بعض اوقات آرڈیننس کے ذریعہ قانون میں تبدیلی کر دیتی ہے اور اگر آپ نے عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا ہے، خود مجوزہ قانون میں بعض دفعات جو مدرسوں کی جوابدہی سے متعلق ہیں، مدارس کے تعلیمی اور حسابی نظام میں مداخلت کا راستہ فراہم کرتی ہیں۔

دوسری بات یہ کہی جارہی ہے کہ دینی علوم میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی —— لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ تعلیم میں مداخلت کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ دینی علوم کا حصہ کم کر دیا جائے، ممکن ہے حکومت فی الحال ایسا کوئی قدم نہ اٹھائے، دوسری صورت یہ ہے کہ عصری علوم اس قدر بڑھا دئے جائیں کہ خود مدارس دینی علوم کا حصہ کم کرنے پر مجبور ہو جائیں، یا مضامین

کی کثرت کی وجہ سے عملاً دینی تعلیم بے اثر ہوکر رہ جائے ،اس اندیشہ کو یہ حقیقت اور بڑھا دیتی ہے کہ مجوّزہ قانون کے مطابق نصاب تعلیم کی کمیٹی صرف علماء پر مشتمل نہیں ہوگی ؛ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ غیر علماء کا اس پر غلبہ ہوجائے ،ان بے چاروں سے اسلامی علوم کی تدریس کو خصوصی اہمیت دینے کی توقع نہیں کی جاسکتی ، یہ محض اندیشہ ہائے دور دراز نہیں ہیں ؛ بلکہ ریاست بہار میں اس کا عملی تجربہ ہوچکا ہے ، جہاں علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ جیسے یگانۂ روزگار علماء کے مشورہ سے ایک عمدہ نصاب بنا اور پھر بتدریج نصاب تعلیم کمیٹی پر یونیوسیٹی کے اساتذہ کا غلبہ ہوتا گیا اور عصری مضامین اس قدر بڑھا دئے گئے کہ اب وہاں سے پڑھ کر نکلنے والے نہ مکمل مولوی بن پاتے ہیں نہ باصلاحیت مسٹر ،مرکزی مدرسہ بورڈ کے ذریعہ اسی تجربہ کو پورے ملک میں دہرانے کی کوشش کی جارہی ہے ۔

اب ذرا حقیقت پسندی سے جائزہ لیجئے کہ مدارس میں جو درسی مواد پڑھایا جاتا ہے ،اس کا دائرہ کسی قدر وسیع ہے ،اسلام کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے ؛ اس لئے تفسیر اور اصول تفسیر نصاب کا لازمی جز ہیں ،اس مضمون کو عام طور پر پانچ سال میں سات گھنٹیوں میں عالمیت تک پڑھایا جاتا ہے ، قرآن کے بعد حدیث کا درجہ ہے ،حدیث کا دائرہ بہت وسیع ہے ،امام مالکؒ کی تالیف موطأ کو شامل کر کے حدیث کی سات کتابیں صحت واسناد کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہیں ،ان کتابوں کے علاوہ مشکوۃ شریف ، ریاض الصالحین اور فقہی احکام سے متعلق وارد ہونے والی احادیث کے سلسلہ میں بلوغ المرام یا آثار السنن بھی پڑھائی جاتی ہے اور چار سال میں اس مضمون کی بارہ کتابیں داخل نصاب ہیں ، جو اپنی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے ضروری ہیں ،حدیث کے ساتھ اصول حدیث بھی ایک اہم مضمون ہے ،اس طرح اس کی تیرہ گھنٹیاں ہوگئیں ،کتاب وسنت کے بعد فقہ کا درجہ ہے ، جو قرآن وحدیث کا نچوڑ بھی ہے اور انسانی زندگی سے لحہ بہ لحہ مربوط بھی ،فقہ کے مختلف ابواب کو پڑھانے کے لئے مدارس میں آٹھ گھنٹیاں مصروف کی جاتی ہیں ،ان میں مختلف ابواب اور مختلف سطح کے اسباق ہوتے ہیں اور سب اپنی جگہ ضروری ہیں ،فقہ کے ساتھ ایک اہم مضمون اصول فقہ کا ہے ، اس مضمون کی کم سے کم تین کتابیں اونچی جماعتوں میں داخل نصاب ہیں اور جن مدارس میں فضیلت کے بعد اعلیٰ تعلیم کا نظم ہے وہاں فقہ ہی سے مربوط ایک اور فن قواعد فقہ کی بھی ایک دو کتابیں

داخل نصاب ہیں، ان کے علاوہ ایک یا دو کتابیں عقیدہ اور ایمانیات میں پڑھائی جاتی ہیں، اس طرح جو علوم 'مقصود' کا درجہ رکھتے ہیں، وہ کم سے کم آٹھ ہیں، اوران کے لئے ۳۴ گھنٹیاں مطلوب ہیں۔

اسلامی علوم کے لئے عربی زبان کی اہمیت محتاج اظہار نہیں ؛ کیوں کہ قرآن وحدیث کی زبان عربی ہے اور مختلف اسلامی علوم کے تمام مراجع عربی ہی میں ہیں ؛ اس لئے عربی زبان کی تدریس کو ایک آلہ و وسیلہ کی حیثیت سے مدارس کے نصاب میں خصوصی اہمیت حاصل ہے ؛ چنانچہ عربی گرامر یعنی نحو وصرف اور بلاغت میں مختلف سطح کی ایک درجن یا اس سے زیادہ کتابیں داخل نصاب ہیں، اسی طرح عربی ادب میں چودہ پندرہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، جو چھ سات گھنٹیوں پر مشتمل ہوتی ہیں، سیرت نبوی، خلافت راشدہ، فارسی، اردو، اور قدیم فلسفہ ومنطق، ان کے علاوہ فارسی زبان کی ایک حد تک تعلیم اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر طلبہ اپنی مادری زبان یعنی اردو زبان میں بہتر طور پر لکھ پڑھ نہیں سکتے، قدیم فلسفہ اور منطق کو نصاب میں کم کر دیا گیا ہے ؛ لیکن اس کا کچھ حصہ اس لئے ضروری ہے کہ علم کلام اور علم تفسیر وغیرہ میں قدیم مصنفین کی بہت سی اہم کتابوں میں ان علوم کی اصطلاحات کا بہ کثرت استعمال کیا گیا ہے، اگر طلبہ ان سے بالکل نا آشنا ہوں تو وہ انہیں سمجھ نہیں سکتے، اب دیکھئے کہ بحیثیت مجموعی ۱۷ علوم کی تقریباً ۴۰ کتابیں مدارس کے نصاب کا حصہ ہیں، جن کو آٹھ سے نو سال کے عرصہ میں پڑھایا جاتا ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مدارس میں عام طور پر غریب اور پس ماندہ گھرانوں کے بچے آتے ہیں اور ان کے ماں باپ راضی نہیں ہوتے کہ اس سے زیادہ عرصہ اپنے بچوں کو تعلیم میں مشغول رکھیں۔

ان مضامین کے ساتھ عصری علوم کا بہت سارا بوجھ طلبہ پر رکھ دیا جائے، تو وہ اسے کیوں کر برداشت کر سکیں گے؟ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ دونوں میں سے کسی ایک جہت میں ان کی توجہ کم ہو جائے اور وہ دونوں سمتوں میں ایک کمزور طالب عالم ثابت ہوں ؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ ان طلبہ پر عصری تعلیم کا زیادہ بوجھ ڈالنا بجائے خود دینی تعلیم کو متأثر کرنے کی کوشش ہے۔

تیسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ اس کا مقصد علماء کو جدید علوم سے آراستہ کرنا ہے ؛ تاکہ وہ باہر کی دنیا سے واقف ہو سکیں، اس سلسلہ میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں : اول : یہ کہ مدارس خود

حسب ضرورت اپنے نظام تعلیم میں تبدیلی لاتے رہے ہیں، عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ آج کا مروجہ نصاب ملاّ نظام الدین سہالویؒ کا بنایا ہوا نصاب ہے؛ لیکن یہ محض غلط فہمی ہے، موجودہ نصاب کو پچاس فیصد بھی ملاّ نظام الدینؒ کا نصاب کہنا شاید درست نہیں ہو، اصل درس نظامی میں حدیث کی صرف ایک کتاب مشارق الانوار پڑھائی جاتی تھی، اور اب ایک درجن سے زیادہ کتب حدیث داخل نصاب ہیں، جو شاہ ولی اللہؒ صاحب کے دبستان درس کا فیض ہے، اصل درس نظامی میں تفسیر میں صرف ''مدارک التنزیل'' پڑھائی جاتی تھی؛ لیکن اب یہ کتاب نہیں پڑھائی جاتی، اس کی جگہ اب متعدد کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، فقہ میں صرف شرح وقایہ پڑھائی جاتی تھی؛ لیکن اب متعدد کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، پچاس فیصد سے زیادہ معقولات درس کا حصہ تھے؛ لیکن اب فلسفہ ومنطق کی محض ایک دو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں؛ اس لئے یہ سمجھنا کہ مدارس میں نصاب کے معاملہ میں جمود ہے، محض غلط فہمی اور ناواقفیت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مدارس اپنی گنجائش اور ضرورت کے پیش نظر خود جدید علوم کو داخل درس کررہے ہیں، اب اکثر مدارس میں پرائمری یعنی پانچویں جماعت تک سرکاری نصاب کے ساتھ دینی تعلیم کا نظم ہے، پھر عالم کورس کی ابتدائی چہارم پنجم تک بھی انگریزی زبان اور بعض دوسرے عصری مضامین کے اسباق شامل درس ہیں، اب اکثر بڑے مدارس میں کمپیوٹر کی تعلیم بھی دی جاتی ہے، ہندوستان میں ایک درجن سے بھی زیادہ ایسے ادارے کھل چکے ہیں، جن میں مدارس کے فضلاء کو دو سال انگریزی کی تعلیم دی جاتی ہے، اور ان اداروں سے فارغ ہونے والے کئی علماء وہ ہیں جو انگریزی رسائل وجرائد میں کام کررہے ہیں؛ اس لئے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مدارس جدید تعلیم سے دور یا اس کا مخالف ہیں، محض افواہ پر یقین کرنے والے لوگ ہیں۔

پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ حکومت نے نیشنل اُوپن اسکول اور اوپن یونیورسیٹیوں کے ذریعہ دینی مدارس کے طلبہ کے لئے جدید تعلیم کے وسیع مواقع فراہم کئے ہیں، اُردو ذریعہ تعلیم ہونے کے اعتبار سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسیٹی اس سلسلہ میں خاص طور پر اہمیت کی حامل ہے کہ مدارس کے جو طلبہ اور فضلاء عصری تعلیم حاصل کرنا چاہیں، ان کے لئے یہ راستہ کھلا ہوا ہے، اب حکومت اگر مدارس کے مختلف مراحل کی اسناد کو عصری تعلیم کے مختلف مراحل کے لئے قبول

کرلے ،تو اس سے مزید حوصلہ افزائی ہوگی ، اس کے ساتھ حکومت یہ کرسکتی ہے کہ مدارس میں پڑھنے والے طلبہ و طالبات کوعصری علوم کے حاصل کرنے کی ترغیب دے ، یہ طریقہ کار مرکزی مدرسہ بورڈ کے قیام سے زیادہ مفید ہوگا ؛ کیوں کہ اس طرح بورڈ سے ملحق اور غیر ملحق تمام ہی مدارس کے طلبہ اپنی رغبت اور ذوق کے مطابق عصری تعلیم حاصل کرسکیں گے ۔

مدرسہ بورڈ کی تائید میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ اس سے مدارس کے فضلاء کو بہتر معاشی مواقع حاصل ہوسکیں گے ؛ لیکن سوال یہ ہے کہ حکومت کے دل میں مسلمانوں کے اِس ایک ہی طبقہ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے ؟ مدتوں سے مسلمان تعلیم اور ملازمت میں ریزرویشن کا مطالبہ کررہے ہیں ، مگر اس کو قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا ، سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب ان کی آبادی کے تناسب کا نصف بھی نہیں ، یہاں تک کہ درجہ چہارم کی ملازمتوں — جس کے لئے کوئی خاص لیاقت مطلوب نہیں ہوتی — میں بھی مسلمانوں کا تناسب نہایت کم ہے ، یہی حال قانون ساز اداروں کا ہے ، اسی طرح ہر شعبۂ تعلیم میں تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے ، اگر بیرون ملک جاکر محنت مزدوری کرنے کا راستہ نہ نکلا ہوتا اور پرائیوٹ کمپنیاں ملک میں نہ آئی ہوتیں ، تو نہ معلوم معاشی اعتبار سے مسلمانوں کا کیا حال ہوتا ؟ ! اس صورت حال کی طرف مسلمان تنظیموں اور قیادتوں نے بار بار حکومت کی توجہ مبذول کی ہے ؛ لیکن حکومت نے کبھی بھی سنجیدگی کے ساتھ اس پر توجہ نہیں دی ، اگر حکومت واقعی مسلمانوں کے معاملہ میں مخلص ہے تو اسے ان امور میں توجہ دینی چاہئے ، مقام فکر ہے کہ حکومت ڈاکٹروں ، انجینئروں اور دوسرے شعبہ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کو ملازمت تو دینے سے قاصر ہے ، عربی ، اردو اور اسلامک اسٹڈیز کے شعبے جو یونیورسیٹیوں میں قائم ہیں ، جن میں فضلائے مدارس کی کھپت ہوسکتی ہے ، وہاں جگہیں اتنی محدود ہیں کہ ایک ایک جگہ کے درجنوں امیدوار ہیں ، اب مدرسہ بورڈ کے فارغین کے لئے وہ ملازمت کے کیا مواقع پیدا کرسکے گی ؟

پھر جن ریاستوں میں گورنمنٹ کے بورڈ موجود ہیں اور سرکار انہیں باضابطہ تنخواہیں ادا کرتی ہے ، ان کی زبوں حالی کو بھی ملاحظہ کیجئے ، ان کی تنخواہیں عام مدارس ہی کے معیار کی ہیں اور وہ بھی کئی کئی مہینوں پر ملتی ہیں ، عوام ان علماء کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں ؛ اس لئے دینی خدمت گزاروں

سے عام مسلمانوں کو جو محبت ملتی ہے اور بعض دفعہ ان کے شخصی مسائل کے لئے جو تعاون ملتا ہے، وہ اس سے بھی محروم ہیں ؛ اس لئے مدرسہ بورڈ کے ذریعہ فضلاء مدارس کی معیشت کے بہتر ہونے کی بات دوپہر کے خواب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ۔

اس کے علاوہ یہ مدارس کے بنیادی مقاصد کے بھی خلاف ہے، یہ سوچ مدارس کے اساتذہ اور فضلاء کو اسی مادی تگ ودو اور دوڑ دھوپ کا شکار بنادے گی ،جس کو آج عصری درسگاہوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں دیکھا جاسکتا ہے اور جس کا نتیجہ ہے کہ تعلیم یافتہ بے روزگار بہت سی جگہ ملک کے امن و امان کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہیں ،ہمیں اگر مدارس کے کردار کو باقی رکھنا ہے تو انہیں سرکاری اعانتوں اور ملازمتوں کا راستہ دکھانے کے بجائے اپنی قوم سے اپیل کرنا چاہئے کہ وہ خدام دین کی زیادہ سے زیادہ مدد کریں ،آزاد مدارس میں تنخواہوں کے معیار کو بہتر بنایا جائے اور انہیں اس بات سے بچایا جائے کہ وہ حکومت کے دسترخوان کا لقمہ کھانے پر مجبور ہوجائیں ، جو ان کی زبان وقلم کے لئے غلامی کی زنجیر بن جائے ۔

۱۶،۲۳،۳۰/اکتوبر ۲۰۰۹ء

ایک بنیادی مرض

اللہ تعالیٰ نے انسان کی صلاحیتوں کو محدود رکھا ہے، اس کی قوتیں ایک خاص دائرہ میں کام کرتی ہیں، مثلاً انسان کو ایک بہت بڑی نعمت دیکھنے کی دی گئی ہے، پتھر اور لوہے کس قدر مضبوط ہیں ، سمندر کا دامن کس قدر وسیع اور بے پناہ ہے؛ لیکن وہ دیکھ نہیں سکتے ، انہوں نے آج تک خود اپنے حسن و جمال کو بھی دیکھا نہیں ہوگا؛ لیکن ایک خاص حد تک چیزوں ہی کو انسان دیکھ سکتا ہے، اگر کوئی رکاوٹ نہ بھی ہو تو انسان کو آدھے ایک کیلومیٹر سے آگے کی چیزیں صاف نظر نہیں آتیں، اگر بیچ میں دیوار حائل ہو تو بالکل قریب کی چیزوں کو بھی وہ نہیں دیکھ سکتا ، انسان میں سننے کی صلاحیت رکھی گئی ہے؛ لیکن اس کا بھی یہی حال ہے، اس کی سماعت کا دائرہ چند فرلانگ تک ہوتا ہے، یہ بھی اس وقت ہے کہ جب کوئی چیز حائل نہ ہو، ورنہ دو کمروں کے بیچ چند انچ کی دیوار ہوتی ہے اور ایک طرف کی آواز دوسری طرف بالکل سنائی نہیں پڑتی ، انسان کے دیکھنے اور سننے کے دائرہ کو جو محدود رکھا گیا، بہ ظاہر یہ ایک محرومی معلوم ہوتی ہے؛ لیکن حقیقت میں یہ بجائے خود اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، ہر انسان اپنے لیے تنہائی (Privacy) چاہتا ہے جو دوسرے کی مداخلت سے آزاد ہو، انسان کی بہت سی ضروریات ایسی ہیں، جن میں دوسروں کی آنکھ اور کان کے تعاقب سے باہر ہونا، اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے، فرض کیجئے کہ کسی مکان میں بہت سے کمرے ہوں ، ہر کمرے میں الگ الگ لوگ رہتے ہوں ، وہ سب ہمہ وقت ایک دوسرے کی نظر میں ہوں اور ایک دوسرے کی چھوٹی بڑی بات کانوں سے ٹکراتی رہتی ہو تو اس کے لیے زندگی گزارنا کتنا دوبھر ہو جائے گا ، اسے اپنے مکان میں رہتے ہوئے بھی ایسا محسوس ہوگا کہ وہ ریلوے کے کسی پلیٹ فارم پر مقیم ہے؛ اس لیے انسان کی صلاحیتوں کا محدود ہونا بظاہر ایک محرومی معلوم ہوتی ہے؛ لیکن درحقیقت یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور انسان کے لیے سامان راحت ؛ بلکہ ایک ضرورت ہے۔

انسان اپنی محدود دیکھنے اور سننے کی صلاحیت کی وجہ سے بہت سی باتیں جاننے میں دوسروں کی اطلاع کا محتاج ہوتا ہے، اس کے سوا چارہ نہیں کہ اپنے چشم سر سے دیکھے اور گوشِ سر سے سنے بغیر بعض امور کو تسلیم کرے؛ اس لیے دنیا کا سارا کاروبار دوسروں کی دی ہوئی خبر پر اعتماد و یقین سے متعلق ہے، اور اسی طرح نظامِ زندگی جاری وساری ہے، خبریں صحیح بھی ہوتی ہیں اور غلط بھی، سچی بھی ہوتی ہیں اور جھوٹی بھی، خبر دینے والے جھوٹے بھی ہوتے ہیں، بعض لوگ طبعاً برے نہیں ہوتے؛ لیکن ان کی طبیعت میں مبالغہ ہوتا ہے، وہ لفظوں کے ایسے بازیگر ہوتے ہیں، کہ سننے والوں کو رائی پہاڑ محسوس ہوتا ہے، کچھ لوگ شریف اور نیک تو ہوتے ہیں؛ لیکن سادہ لوح اور بھولے بھالے ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی باتوں کا یقین کر لیتے ہیں، کسی خبر پر جرح نہیں کرتے اور اس کے کھرے کھوٹے کو پرکھے بغیر مان لیتے ہیں، بعض حضرات سے کسی بات کو سننے یا سمجھنے میں غلط فہمی بھی ہو جاتی ہے، یہ مختلف اسباب ہیں، جن کی وجہ سے دانستہ یا نادانستہ اور بالارادہ یا بلا ارادہ خلاف واقعہ باتیں لوگوں میں چل پڑتی ہیں، ایسے ہی بے سروپا باتوں کو ''ہوا'' کہتے ہیں۔

بارہا ایسا ہوا کہ کسی شخص نے کچھ لوگوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا، یہ دوڑ بھاگ کسی اور سبب سے تھی؛ لیکن شہر کی فضاء کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں کو خیال ہو گیا کہ شاید دو گروہوں کے درمیان تصادم ہو گیا ہے، اب اس خوف سے انہوں نے خود بھاگنا شروع کیا، آتے ہوئے راستہ میں جو لوگ ملے ہمدردی وبہی خواہی میں انہیں بھی واپس ہونے کی صلاح دے دی، پھر خبر ایک محلّہ سے دوسرے محلّہ میں پہونچی اور ایک فرقہ کے ناسمجھ لوگوں نے دوسرے فرقہ کے لوگوں پر وار کر دیا، یہاں تک کہ پورا شہر فساد کی آگ میں بھڑکنے لگا اور اس بے تحقیق خبر کی چنگاری نے پورے علاقہ کے امن وامان کو نذرِ آتش کر دیا، اس طرح کے واقعات ہمارے سماج میں پیش آتے رہتے ہیں، افواہوں کی بنا پر گروہی لڑائیاں ٹھن جاتی ہیں، ادارے اور جماعتیں تقسیم ہو جاتے ہیں، اجتماعی کاموں میں رخنہ پڑتا ہے، خاندانوں میں نفرت کی آگ سلگ جاتی ہے، بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں، یہاں تک کہ میاں بیوی میں طلاق کے واقعات پیش آجاتے ہیں، والدین، اولاد اور قریب ترین اقارب کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے، افواہوں کی گرم بازاری نے بہت سے مخلص، محبّ قوم، برگزیدہ شخصیتوں کو بے آبرو کیا ہے اور خود غرضی وبدخواہ افراد کی طالع آزمائی کو کامیابی

سے ہم کنار کر کے قوم وملک کو نا قابلِ تلافی نقصان پہونچایا ہے۔

افواہوں کو جنم دینا، انہیں پھیلانا اوران کو تقویت پہونچانا نہایت ہی ناشائستہ و نامناسب عمل ہے، اللہ تعالیٰ نے اخبار و واقعات کے بارے میں یہ اصولی رہنمائی فرمائی ہے کہ جب کوئی نا قابلِ بھروسہ آدمی کوئی خبر لائے تو جب تک اس کی اچھی طرح تحقیق نہ ہو جائے اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا إِنْ جَاءَ كُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوْا أَنْ تُصِيْبُوْا قَوْماً بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِيْنَ﴾ (الحجرات:٦)

''اے ایمان والو! اگر کوئی نا قابلِ بھروسہ (فاسق) شخص کوئی اہم خبر دے تو اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو، کہ کہیں کسی قوم پر تم ناواقفیت میں حملہ نہ کردو کہ پھر تمہیں اپنے کئے پر پچھتانا پڑے''

اس سے معلوم ہوا کہ بے تحقیقی خبروں پر یقین نہیں کرنا چاہیے، اگر اس پر یقین کیا گیا تو یہ نقصان اور مضرت کا باعث ہوگا، یہ آیت ایک خاص واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ بنو مصطلق کی طرف —— جو مسلمان ہو چکے تھے —— اپنے نمائندہ ولید بن عقبہ کو بھیجا، بنو مصطلق نے جب نمائندۂ نبوی کو دیکھا تو ان کے احترام وتوقیر کے لیے آبادی سے باہر نکل آئے، ولید نے سمجھا کہ یہ لوگ ان کے قتل کے درپے ہیں اور پچھلے پاؤں واپس آ گئے، آ کر حضور ﷺ کو اطلاع دی کہ یہ لوگ مرتد ہو گئے ہیں، یہ زکوۃ ادا کرنے کے منکر ہیں اور ان کے قتل کے درپے ہو گئے تھے، آپ ﷺ نے ان سے جہاد کا ارادہ فرمالیا، ابھی تیاری کے مرحلہ میں تھے کہ بنو مصطلق کا وفد آ پہونچا، انہوں نے عرض کیا کہ آپ کے قاصد آ رہے تھے، ہم اس لیے نکلے کہ ان کا استقبال کریں اور اپنی زکوۃ ان کی خدمت میں پیش کریں، ہمیں معلوم ہوا کہ انہوں نے یہ خیال کیا ہے کہ ہم لوگ ان سے جنگ کے لیے نکلے تھے، سو یہ غلط ہے، اسی موقع سے یہ آیت نازل ہوئی، (قرطبی:۱۶/ ۳۱۱) —— غور کیجئے کہ یہ عہدِ نبوی کا واقعہ ہے، اور یہ اطلاع ایک صحابی رسول کی تھی، انہوں نے دانستہ غلط بیانی سے یقیناً کام نہیں لیا تھا کہ یہ مقام صحابیت سے فروتر بات ہے؛ بلکہ یہ محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے، یہ نا داستہ غلط فہمی بھی کتنے بڑے انتشار کا پیش خیمہ بن سکتا تھا، تو جہاں

افواہیں بالقصد پیدا کی جاتی ہوں، ان سے کس قدر نقصان ہوگا؟

افواہوں کے پھیلنے کے چند خاص اسباب ہیں، ان میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ لوگ ہر سنی سنائی ہوئی بات کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں، خواہ وہ بات کسی قدر بھی بے بنیاد ہو، بعض لوگوں نے اس کے لیے 'دروغ برگردن راوی' کی ایک خود ساختہ بیساکھی تیار کر رکھی ہے، اور اس کے ساتھ ہر گفتنی و ناگفتنی کو نقل کر دینے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے، یہ بھی خدا سے بے خوفی کی بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے بیماری کی تشخیص کرتے ہوئے فرمایا: آدمی کے گناہ گار ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو نقل کر دے، ''**کفی بالمرء کذباً أن یحدث بکل ما سمع**'' (مسلم ، حدیث نمبر:۷، باب النهي عن الحدیث بکل ما سمع) —— ہر سنی سنائی بات کو نقل کرنے سے معاشرہ میں کس طرح بگاڑ پیدا ہوتا اور فساد پھیلتا ہے، اس کی مثال رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں پیش آنے والا ''واقعۂ افک'' ہے، کچھ بیمار ذہن منافقین نے امت کی ماں سیدنا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگا دی، اور اس افواہ کو پھیلانے کی خوب کوشش کی، نتیجہ یہ ہوا کہ بعض سادہ لوح مخلص مسلمان بھی اس میں شریک ہو گئے اور مدینہ میں ایسے انتشار کی کیفیت پیدا ہوئی کہ حیاتِ نبوی میں شاید ہی کسی اور واقعہ سے آپ ﷺ کو اس درجہ تکلیف پہونچی، یہ اسی بات کا نتیجہ تھا کہ ایک سنی سنائی بات کو کچھ لوگ بلا تحقیق کہتے چلے گئے۔

ان افواہوں میں اضافہ ان لوگوں کی وجہ سے ہوتا ہے، جو بری باتوں کے متلاشی رہتے ہیں، لوگوں کی برائیوں اور کوتاہیوں کے بارے میں تجسس سے جن کو لذت ملتی ہے، اور کسی واقعہ میں اگر چند احتمالات ہوں، تو منفی پہلو کی طرف ان کا ذہن زیادہ چلتا ہے، اس طرزِ عمل کو حضور ﷺ نے پسند نہیں کیا؛ اسی لیے تجسس کو منع کیا گیا، اور ان لوگوں کو کج فکر قرار دیا گیا جو کسی بات کی غلط تاویل و توجیہ کے درپے ہوتے ہیں:

﴿**فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ**﴾ (آل عمران :۷)

''جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ فتنہ برپا کرنے اور (من چاہی) تاویلیں کرنے کے لیے متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں''

افواہیں عام طور پر اعلانیہ نہیں پھیلائی جاتیں، ریڈیو اور اخبارات کو ان کا ذریعہ نہیں بنایا جاتا (ویسے آج کل حکومتوں کے غیر ذمہ دارانہ اور ذرائع ابلاغ کے جانب دارانہ رویہ کی وجہ سے ایسا بھی ہورہا ہے)؛ بلکہ زیادہ تر سینہ بسینہ افواہیں پھیلائی جاتی ہیں، اور سرگوشیوں کے ذریعہ گشت کرتی رہتی ہیں؛ اسی لیے زیادہ تر سرگوشیوں کو قرآن مجید نے پسند نہیں کیا:

﴿لاَ خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوَاهُمْ﴾ (النساء :۱۱۴)

کسی بھی خبر کے بارے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ یا انسان خود اس کی تحقیق کرلے، یا کم سے کم ایسے سمجھدار، معاملہ فہم اور زمانہ آگاہ لوگوں کی طرف رجوع کرے، جن کے بارے میں توقع ہو کہ وہ مناسب طریقہ پر اس کی تحقیق کرنے کے بعد کوئی صحیح قدم اٹھائیں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''جب ان کو امن یا خوف کی کوئی بات پہونچتی ہے تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں، اگر وہ اس کو رسول اور اپنے میں سے ذمہ داروں تک پہونچا دیتے تو اسے وہ لوگ جان لیتے، جو ان میں سے بات کی تہہ تک پہونچ کر صحیح نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں، اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم تو شیطان کی پیروی کرنے والے ہوجاتے'' (النساء :۷۳)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بنیادی مرض کا علاج بتایا ہے، جو افواہوں کا باعث ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ جو باتیں اہم ہوں ان کے بارے میں اگر انسان خود تحقیق کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، تو اس کی صلاحیت رکھنے والوں سے رجوع کرلے، اور کسی بھی بات کو بلا تحقیق بیان کرنے؛ بلکہ خود بھی اس پر یقین کرنے سے گریز کرے؛ کیوں کہ انسان اپنے کانوں، اپنی آنکھوں اور اپنے دلوں کا مالک نہیں؛ بلکہ امین ہے، اس کے بارے میں وہ عند اللہ جوابدہ ہے:

﴿إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰـئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُولاً﴾ (الإسراء :۳۶)

۲۹/ جون ۲۰۰۷ء

موجودہ حالات کے پس منظر میں حیات ابراہیمی کا پیغام

قرآن مجید خدا کی کتاب ہے اور یہ کتاب قیامت تک کے لئے ہے، اس لئے قرآن مجید میں جو مضامین آئے ہیں، ان کا تعلق ایمانیات سے ہو، انبیاء کے قصص و واقعات سے ہو، عملی زندگی کے احکام سے ہو، یا کائنات کے حقائق سے، وہ سب قیامت تک کے لئے نشانِ راہ ہیں، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف عہد میں اللہ تعالی کی طرف سے مبعوث کئے جانے والے پیغمبروں کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر رہی ہے، ان میں سے صرف چند پیغمبروں کا قرآن پاک میں ذکر آیا ہے اور ان میں بھی بعض ہی پیغمبر ہیں، جن کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں، ان انبیاء کرام کا خصوصی طور پر ذکر اس بات کی علامت ہے کہ ان سے متعلق واقعات میں امت محمدیہ کے لئے خاص طور پر عبرت و موعظت کے پہلو موجود ہیں، جن انبیاء کے واقعات کو قرآن مجید میں زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، ان میں ایک سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بھی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید میں ۶۹ بار آیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے علاوہ انبیاء میں صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی ذات ہے، جن کے بارے میں قرآن مجید نے صراحت کی ہے کہ یہ امت کے لئے اسوہ ہیں: ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ إِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ (الممتحنہ :۴) گویا یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ مسلمان مستقبل میں جن حالات سے دوچار ہوں گے، ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی ایک نقش راہ کا درجہ رکھے گی اور اس سے رہنمائی حاصل کرنے میں اس امت کی فلاح و کامیابی مضمر ہوگی۔

اگر غور کیا جائے تو آج مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں وہ حیات ابراہیمی سے بڑی مماثلت رکھتے ہیں، آج پوری دنیا میں مسلمانوں سے مطالبہ کیا جارہا ہے کہ وہ اللہ اور رسول کے احکام کے بجائے قومی روایات پر عمل کریں اور اپنے آپ کو اس تہذیب کے سانچہ میں ڈھال لیں

جو آج پوری دنیا پر اپنا غاصبانہ قبضہ جمانا چاہ رہی ہے اور اس میں مسلمانوں کے سوا اور کسی کی مزاحمت درپیش نہیں ہے، عالمی سطح پر ان سے مطالبہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب کو قبول کرلیں، شرافت و اخلاق اور حیا پر مبنی طریقۂ زندگی کو بنیاد پرستی اور قدامت پسندی کا نام دیا جارہا ہے، ہندوستان میں ہندوتوا کی بات کی جارہی ہے، سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کی ابتدا یہیں سے ہوئی، عراق کا معاشرہ چاہتا تھا کہ وہ اُس مشرکانہ طریقۂ زندگی پر قانع ہوجائیں، جس میں سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش سے لے کر بے شمار چیزوں کی پرستش کی جاتی تھی اور اس روایتی فکر کے خلاف بغاوت نہیں کریں، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ضمیر نے اس کو قبول نہیں کیا کہ وہ توحید کے بجائے شرک پر قانع ہوجائیں، انہوں نے ستارہ پرستی، چاند پرستی، سورج پرستی اور بت پرستی کے خلاف پوری قوت اور دلیل کے ساتھ آواز اٹھائی، اس کا ردعمل یہ ہوا کہ پہلے آپ کو زندہ جلانے کی کوشش کی گئی، مگر جب اللہ کی طرف سے آپ کی حفاظت کے غیبی انتظام نے انہیں ناکام کردیا، تو آپ کو وطن چھوڑنے پر مجبور کردیا گیا، یہاں تک کہ آپ کے بت گر والد نے بھی آپ کو سنگسار کردینے کی دھمکی دی: ﴿ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ لَاَرۡجُمَنَّكُمۡ وَاهۡجُرۡنِیۡ مَلِيًّا﴾ (مریم:۴۶) یہ وہی رویہ ہے جو ہر عہد میں باطل کی طاقتوں نے حق اور سچائی کے خلاف استعمال کیا ہے، آج بھی مسلمانوں کو مختلف ملکوں میں در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کیا جارہا ہے، فلسطین میں فلسطینی پناہ گزینوں کو خود ان کے وطن میں واپس آنے کی اجازت نہیں دی جارہی ہے اور ہندوستان میں فرقہ پرست طاقتیں ''کہاں جائے گا مسلمان، قبرستان یا پاکستان؟'' کا نعرہ لگارہی ہیں، یہ قوم ابراہیمی کے اسی رویہ کا اعادہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب عراق سے ہجرت کی تو راستہ میں مصر سے بھی گزرے، جہاں آپ کی زوجہ حضرت سارہ علیہا السلام کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی گئی؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد سے یہ فتنہ ٹل گیا، پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام شام پہنچے اور بوڑھاپے میں حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو حکم ہوا کہ شیر خوار بیٹے اور نئی نویلی دلہن شہزادیِ مصر حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو شام وفلسطین کے مرغزاروں کو چھوڑ کر مکہ کے بے آب و گیاہ صحرا میں پہنچا دیا جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اس امتحان میں بھی پورے اترے اور ان دونوں کو مکہ مکرمہ میں چھوڑ آئے، جہاں اس وقت پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہیں تھا، مکہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پرورش ہوئی اور جب انہوں نے

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اور امتحان ہوا، جو آخری امتحان تھا؛ کہ اللہ کی رضا کے لئے حضرت اسماعیل ؑ کو بھینٹ چڑھا دیا جائے ، رضاء خداوندی کے طالب باپ اور وفا شعار بیٹے نے اس جاں گسل امتحان پر بھی لبیک کہا اور وہ قربانی پیش کی ،جس کی محبت و جاں نثاری کی انسانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی:

اے دل ! تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا ضیاع ہے سو ایسا ضیاع نہیں

یہ بات ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، اگر اللہ چاہتے تو حضرت اسماعیل ؑ کو ان آزمائشوں سے گزارے بغیر بھی وہ مقاصد حاصل ہو جاتے جو مقصود تھے؛ لیکن ایسا نہیں ہوا، آپ کو ابتلاؤں اور آزمائشوں کا سفر طے کرنا پڑا، یہی بات رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بھی ملتی ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن مجید نے واضح طور پر اشارہ کیا ہے، اہل ایمان کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ وہ جب ایمان و ہدایت سے بہرہ ور ہو چکے ہیں اور حق وراستی پر قائم ہیں تو وہ اس دنیا میں مشقتوں اور آزمائشوں میں کیوں مبتلا کئے جائیں گے؟ جیسے خدا نے ان کے لئے آخرت میں جنت بنائی ہے، اسی طرح وہ دنیا میں بھی راحت وآسائش کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے نہایت تاکید کے ساتھ فرمایا ہے:

''اور ہم تمہیں ضرور ہی آزمائیں گے، کچھ بھوک اور خوف سے، نیز مال، جان اور پھلوں کی کمی سے بھی ، اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دیجئے ، وہ لوگ کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ بیشک ہم سب اللہ کے لئے ہیں اور ہم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے'' (البقرۃ :۱۵۵)

اس آیت میں صحابہ ؓ سے خطاب ہے، جن کا ایمان بعد میں آنے والی امت سے یقیناً بڑھا ہوا تھا؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تمہارے لئے پھولوں کی سیج بچھے گی ؛ بلکہ پوری قوت کے ساتھ فرمایا گیا کہ ہم تمہیں ضرور ہی ابتلاؤں اور آزمائشوں کی بھٹی میں تپائیں گے، یہ آزمائش بھوک اور فاقہ مستی کی بھی ہوگی ، یعنی معاشی ناکہ بندی ہوگی ، ملازمت کے دروازے بند کئے جائیں گے، تعلیمی پسماندگی سے بھی دوچار کیا جائے گا؛ کیوں کہ یہ پسماندگی انسان کو معاشی زوال

وانحطاط تک لے جاتی ہے، خوف و دہشت سے بھی آزمایا جائے گا، حکومتوں کا خوف، انٹلی جنس اور پولیس کا خوف، ظالمانہ قوانین کا خوف، انسانی حقوق سے محروم کئے جانے کا خوف، غرض طرح طرح کے خوف و دہشت سے مسلمانوں کو گزرنا پڑے گا، مال کا نقصان بھی برداشت کرنا ہوگا، تجارتوں اور کاروباروں پر حملے بھی ہوں گے، جان کا نقصان بھی اٹھانا ہوگا، اور مسلمانوں کے خون کی ارزانی ہوگی، پھل کا بھی نقصان ہوگا، زمین کے پھل میں جیسے سیب اور آم اور چاول اور گیہوں داخل ہیں، اسی طرح پٹرول اور دوسرے معدنی ذخائر بھی شامل ہیں، آج حقیقی معنوں میں پٹرول کے ذخیرہ پر مغربی طاقتوں کا قبضہ ہے، مسلم ممالک کو زراعتی ٹیکنالوجی سے محروم رکھنا؛ بلکہ مختلف کیمیکل کے استعمال کے ذریعہ عالم اسلام کی زمینوں کو ناکارہ بنانا، یہ سب زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی کو نقصان پہنچانا اور قرآن مجید کی زبان میں ﴿ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ ﴾ ہے، غرض کہ آج پوری دنیا میں مسلمان جن مصیبتوں سے گزر رہے ہیں وہ باعث حیرت نہیں ہے اور قرآن مجید نے شروع ہی سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ایسے واقعات پر مسلمانوں کا کیا طرز عمل ہونا چاہئے؟ —— اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسے موقع پر امت کو صبر کا راستہ اختیار کرنا چاہئے، صبر سے مراد ثابت قدمی ہے، یعنی حالات کتنے بھی ناموافق ہوں اور کتنی بھی دشواریاں راہ حق میں آئیں، انسان باطل کی قوت کو دیکھ کر متزلزل نہ ہو، وہ حوصلہ نہ ہارے اور اللہ کے دین پر اس کے یقین میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ ہونے پائے؛ بلکہ وہ پوری طرح ثابت قدم رہے، قرآن مجید نے ایک اور موقع پر صحابہ ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ جب انہیں دشمن کی کثرت کا حوالہ دے کر خوف زدہ کرنے اور دہشت میں مبتلا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، تو گھبرانے اور خوف کھانے کے بجائے ان کے ایمان میں اضافہ ہوجاتا ہے: ﴿ وَمَازَادَهُمْ إِلَّا إِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴾ (الأحزاب:۲۲) پھر صبر کے اس مرحلہ میں مرد مؤمن اپنے درجۂ ومقام کا اعلان کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور ہمیں اللہ ہی کی طرف واپس جانا ہے، جس تمدن کی بنیاد عیش پرستی اور عشرت کوشی پر ہو، اور جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ نفسانی خواہشات کو پورا کرنا ہو، وہ بنیادی طور پر ''بے خدا تمدن'' ہوتا ہے، ایک ایسا تمدن جس میں خدا کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی، جس میں انسان اپنے آپ کو خدا

سے بھی آگے سمجھنے لگتا ہے، جس میں خدا کو چرچوں اورعبادت گاہوں تک محدود کردیا جاتا ہے، اور پوری دنیا کو انسان اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے؛ لیکن اسلام جس تمدن کی دعوت دیتا ہے، وہ ''باخدا تمدن'' ہے، جس میں انسان اپنی پوری زندگی کو اللہ کے حوالہ کردیتا ہے، اسی لئے قرآن دین حق پر ثابت قدم رہنے والوں کے طرز فکر کو بیان کرتا ہے کہ وہ کہتے ہیں: ﴿ إِنَّـا لِـلّٰـهِ وَإِنَّـا إِلَيْـهِ رَاجِعُوْنَ ﴾ (البقرة :۱۵۶) یعنی: ''ہم سب اللہ کے لئے ہیں اوراللہ ہی کی طرف ہماری واپسی ہے'' یہ اس بات کا اعلان ہے کہ حالات جیسے بھی ہوں، ہم خدا کی فرمانبرداری سے آزادنہیں ہوسکتے، اور ہم ایسے تمدن کو قبول نہیں کرسکتے، جس میں خدا کو عبادت گاہ سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔

اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ إِنَّ صَلاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ ربّ الْعَالَمِيْنَ ﴾

(الأنعام :۱۶۲)

''میری نماز، میری عبادتیں، میرا جینا اور مرنا سب اللہ کے لئے ہے، جو تمام عالم کا پالنے والا ہے''

ایک اور موقع پر حضرت ابراہیم ں نے ارشاد فرمایا:

﴿ إِنِّـيْ وَجَّهْتُ وَجْهَيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ (الا نعام :۷۹)

''میں نے اپنا رخ اس ذات کی طرف رکھا ہے، جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے اور میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرانے والا نہیں''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سب سے بڑی خصوصیت اللہ سے تعلق اور خود سپردگی تھی، اور نمرودی معاشرہ میں یہی بات سب سے زیادہ نا قابل برداشت اور نا قابل عفو تھی، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس فکر اور نظام حیات کے سانچہ میں ڈھالنا چاہتے تھے، جس میں حقیقی خدا کا کوئی تصور نہ ہو، جس میں انسان مذہب واخلاق کی ہر طرح کی قید و بند سے آزاد ہو، جس میں مذہب ایک رسمی چیز ہو اور جس کا زندگی میں کوئی عمل دخل نہ ہو، جس میں انسان کی پیشانی اس کی مصنوعی

دیویوں، دیوتاؤں، نیز لذتوں اور شہوتوں کے سامنے جھکا کرتی ہو، جس میں ایسی بے جان چیزوں کی پرستش کی جاتی ہو، جس سے نہ انسان کو ڈرنے کی ضرورت ہو اور نہ اس کے اعمال وافکار پر کوئی پابندی عائد ہو، آج بھی مسلمانوں سے نفرت وعناد اور انہیں بدنام ورسوا کرنے کی کوششوں کا اصل سبب یہی ہے کہ جس گھر میں سب لوگ بے لباس ہیں، یہ مذہب اور خدا پرستی کا لباس کیوں پہنے ہوئے ہے؟ یہ ہمارے بے خدا تمدن کے سامنے سر جھکانے کے بجائے خدا پرستی اور خدا ترسی کی بات کیوں کرتے ہیں؟ یہ آخرت کا نام لے کر ہماری خوش عیشیوں میں کیوں بھنگ ڈالتے ہیں؟ یہ مسجد اور نماز تک اپنے آپ کو محدود کر کے زندگی کے دوسرے مسائل میں مذہب سے کیوں آزادی حاصل نہیں کرتے اور انسان کی آزادی میں کیوں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں؟

یہ بنیادی فکری اختلاف ہے، جس نے خدا بیزار قوموں اور تہذیبوں کو اسلام کے خلاف آمادۂ پیکار کر دیا ہے اور وہ اس کے بغیر راضی نہیں ہو سکتے کہ مسلمان اپنے تہذیبی اور مذہبی تشخص سے باز آ کر اقوام مغرب کو اپنا قبلہ بنالیں:

﴿ لَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصَارٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ﴾

(البقرۃ: ۱۲۰)

اس لئے آج کے ماحول میں مسلمانوں کے لئے وہی اسوہ ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار کیا تھا، یعنی مشکلات پر صبر واستقامت اور ہر طرح کی مشکلات کو سمجھنے کے باوجود خدا کے تعلق پر کوئی آنچ نہیں آنے دینا، اگر مسلمان اسوۂ ابراہیمی پر قائم رہیں، تو انشاء اللہ وہ امتوں کی امامت سے سرفراز کئے جائیں گے اور مسلمانوں کو کتنا ہی بدنام اور رسوا کرنے کی کوشش کی جائے، خدا کی طرف سے ان کو عزت وسر بلندی حاصل ہوگی، جیسا کہ خدا کا یہ وعدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں پورا ہوا۔ ﴿ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ﴾ (البقرۃ: ۱۲۴)۔

۲۱/ دسمبر ۲۰۰۷ء

اللہ کے سوا کسی اور سے جزا نہیں لوں گا!

قاضی ابوبکر انصاری بزاز بڑے اہل علم میں گذرے ہیں، ان کی ایک ''آپ بیتی'' دلچسپ بھی ہے اور عبرت خیز بھی، وہ مکہ مکرمہ میں مقیم تھے، غربت اور افلاس کی وجہ سے فاقہ کی سنت تازہ کرنے کی بار بار نوبت آتی تھی، ایک دن اسی کیفیت میں تھے، بھوک کی شدت تھی اور کھانے کی کوئی چیز گھر میں موجود نہیں تھی، اسی اضطراب میں باہر نکلے، شاید کھانے کا کوئی انتظام ہوسکے، مگر کوئی چیز میسر نہیں آئی، البتہ ایک ریشمی تھیلی گری ہوئی ملی، جو ریشم ہی کی ڈوری سے بندھی ہوئی تھی، وہ اسے لے کر گھر آگئے، کھول کر دیکھا تو ہیرے کا نہایت خوبصورت ہار اس میں موجود ہے، ہار ایسا خوبصورت اور دیدہ زیب کہ آنکھوں نے اب تک ایسا ہار دیکھا نہیں تھا، انہوں نے پھر اسے اسی طرح باندھ کر رکھ دیا اور کھانے کی کسی چیز کی تلاش میں دوبارہ باہر نکل آئے۔

دیکھتے کیا ہیں کہ ایک بوڑھا شخص اعلان کر رہا ہے، جس نے کوئی تھیلی پائی ہو، جس کی کیفیت یہ اور یہ ہے اور لاکر دیدے تو اسے پانچ سو دینار سونا دیا جائے گا، پانچ سو دینار چھ سو گرام سے اوپر یعنی آدھا کیلو سے بھی زیادہ سونا ہے، یہ دراصل اسی تھیلی کا اعلان تھا، دل میں خیال آیا کہ میں ضرورت مند و بھوکا ہوں، تھیلی لوٹا کر دینار حاصل کرسکتا ہوں، قاضی ابوبکر انصاری نے اعلان کرنے والے شخص کو اپنے گھر بلایا، ان سے تھیلی اور ہیرے کی علامتیں اور تعداد دریافت کیں، پھر تھیلی نکالی اور ان کے حوالہ کی، اس شخص نے بڑے جذبۂ شکر کے ساتھ وصول کیا اور پانچ سو دینار ان کی طرف بڑھائے، انہوں نے لینے سے انکار کردیا، اعلان کرنے والے شخص نے بڑی خوشامدیں کیں، خوب اصرار کیا اور یہ واقعی بے حد محتاج و ضرورت مند بھی تھے؛ مگر قبول نہیں کیا اور فرمایا: اس ذات کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں اللہ کے سوا کسی اور سے اس کی جزا نہیں لے سکتا۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک بار ان کا سمندری سفر ہوا، کشتی سمندر کی متلاطم موجوں کے نرغہ میں آ گئی، کشتی ٹوٹ گئی، مال واسباب ہی نہیں کشتی میں سوار لوگ بھی ڈوب گئے، خدا کی قدرت کہ یہ ایک شکستہ تختہ پکڑے رہے، سمندر کی لہریں کبھی ان کو دائیں لے جاتیں کبھی بائیں، سمندر کی گہرائی اتھاہ، وسعتیں بے پناہ اور منزل نامعلوم، آخر ان بے رحم موجوں نے رحم کھایا اور ایک چھوٹے سے جزیرہ پر انہیں پھینک دیا، اس جزیرہ میں تھوڑی سی آبادی تھی، لوگ اَن پڑھ، لکھنے پڑھنے سے نابلد؛ البتہ ایک مسجد موجود تھی، یہ مسجد میں جا بیٹھے اور قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہو گئے، جزیرہ کے لوگ جمع ہو گئے اور تقاضا کرنے لگے کہ وہ انہیں قرآن مجید پڑھا دیں، شیخ انہیں قرآن پڑھانے لگے، لوگوں کے دل میں ان کی عزت بڑھ گئی اور خدمت بھی ہونے لگی، مسجد میں قرآن مجید کا ایک بوسیدہ نسخہ بھی موجود تھا، یہ اس کے اوراق کو مرتب کر کے درست کرنے لگے، اب لوگوں کو اندازہ ہوا کہ انہیں لکھنا بھی آتا ہے، لوگوں نے دریافت کیا: کیا آپ لکھنے سے بھی واقف ہیں؟ شیخ نے جواب دیا: ہاں، جزیرہ کے باشندوں کا تقاضا ہوا کہ پھر تو ہمیں لکھنا بھی سکھا دیں، شیخ نے اس پر بھی آمادگی ظاہر کی، پھر تو بچوں اور نوجوانوں کی بھیڑ لگ گئی۔

گویا اب شیخ پورے جزیرہ کے استاذ، مربی اور مقتدیٰ تھے، انہیں عزت بھی حاصل تھی، خدمت بھی کی جاتی تھی اور ضروریات بھی پوری ہوتی تھیں، لوگوں کو خیال ہوا کہ شیخ یہیں قیام کر لیں؛ تاکہ ہم ان سے محروم نہ ہونے پائیں، اس کی بہتر صورت یہ تھی کہ اسی دیار میں ان کی شادی ہو جائے، چنانچہ ایک یتیم لڑکی سے رشتہ کی پیشکش کی گئی، جس کے پاس کچھ مال واسباب بھی تھے، شیخ نے ابتداءً بہت بہت معذرت کی؛ مگر لوگوں کا اس قدر اصرار بڑھا کہ آخر قبول کر لیا۔

نکاح ہو گیا، لڑکی کے لوگ لڑکی کو لے کر آئے، شیخ ان سب کے ساتھ بیٹھے، اب جو شیخ نے لڑکی پر نظر ڈالی تو اس کے گلے میں وہی ہار تھا، جو مکہ میں انہیں ملا تھا اور انہوں نے اسے واپس کر دیا تھا، وہ حیرت زدہ رہ گئے اور ان کی نظر اس ہار پر رک کر رہ گئی، آنے والوں کو ان کا یہ انداز اچھا نہیں لگا کہ گویا ''ہار والی'' کے بجائے ہار ہی پر ان کی نظر ہے، لوگ کہنے لگے: شیخ! آپ نے اس یتیم لڑکی کا دل توڑ دیا، آپ نے اس کی طرف تو دیکھا ہی نہیں، آپ کی نظر صرف ہار پر اٹکی ہوئی ہے؟ —— شیخ نے فرمایا: اصل میں اس ہار سے ایک واقعہ متعلق ہے؛ اس لئے میں متعجب ہوں، پھر ہار کی پوری

کہانی بیان کی ، یہ سنتے ہی لوگ ''اللہ اکبر'' اور ''لا الٰہ الا اللہ'' کے نعرے لگانے لگے اور پورا جزیرہ اس سے گونج اٹھا۔

شیخ نے اس طرح چیخنے اور آواز لگانے کی وجہ پوچھی ؛ بلکہ اس پر حیرت اور ناراضگی کا اظہار بھی کیا ، لوگوں نے بتایا : جس شخص کا ہار گم ہوگیا تھا اور جس کو آپ نے ہار واپس کیا تھا ، وہی اس یتیم لڑکی کے والد تھے ، جن کا انتقال ہو چکا ، وہ جب واپس آئے تو اس واقعہ کو بیان کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مکہ میں جس شخص نے مجھے ہار لوٹایا ، میں نے روئے زمین پر اس سے بہتر مسلمان نہیں دیکھا ، خداوند ! تو میری اس شخص سے ملاقات کرادے ؛ تاکہ میں اس سے اپنی لڑکی کا نکاح کردوں ؛ چنانچہ اس شخص کا تو انتقال ہوگیا ، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی دعاء قبول فرمالی۔

یہ یتیم لڑکی شیخ کی بہترین بیوی ثابت ہوئی ، دولڑکے بھی ہوئے ، اتفاق کہ پہلے بیوی کا انتقال ہوا اور ہار شیخ اور ان کے دونوں لڑکوں کے حصہ میں آیا ، پھر ان دونوں لڑکوں کی بھی یکے بعد دیگرے وفات ہوگئی اور اب پورا ہار شیخ کی ملکیت میں آگیا ، انہوں نے اس کو ایک لاکھ دینار میں فروخت کردیا اور عرصہ تک اسی قیمت سے اپنی ضروریات پوری کرتے رہے ، جب وہ اپنی یہ آپ بیتی سنا رہے تھے ، اس وقت بھی ان کے پاس اس میں سے اچھی خاصی رقم بچی ہوئی تھی۔

(محمد عمر باعثمان : امتع القصص وا لأخبار :ص:۳۹-۴۰)

نیکی کی جزاء اور برائی کی سزا کی اصل جگہ تو آخرت ہے ؛ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے نظام غیبی پر یقین بڑھانے کے لئے اس دنیا میں بھی ایسے حالات پیدا فرمادیتے ہیں ، جو انسان کے لئے نشان عبرت اور مشعل راہ بن سکیں ، شیخ کے اس واقعہ میں سبق ہے حلال پر قناعت اور حرام ومشتبہ سے بچنے کا ، بندوں کے بجائے خدا سے پانے کے یقین کا ، دنیا کی متاع حقیر پر ریجھنے کے بجائے آخرت کے شوق کا اور نفس کی خواہش اور شیطان کے دام فریب کے مقابلہ رضاء خداوندی کی طلب کا ، —— مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کا خلاصہ خدا کے بجائے مادہ کی پرستش ہے ، مادہ پرستی میں انسان بہ ظاہر آزاد نظر آتا ہے ؛ مگر حقیقت میں وہ غلام ہوتا ہے ، نفس کا غلام ، خواہشات ولذات کا غلام اور بے وفاء و بے ثبات اسباب عشرت کا غلام ، یہ غلامی اسے خود فراموش بھی بنادیتی ہے اور خدا فراموش بھی ، وہ بھول جاتا ہے کہ خدا نے اسے ایک انسان کی صورت میں پیدا کیا ہے ، اسے سلیم

فطرت اور دردمند دل سے نوازا گیا ہے، اس کو حیاء واخلاق کا جوہر عطاء کیا گیا ہے، یہ خودفراموشی اسے خودغرض بنادیتی ہے، خواہشات پرستی کا نشہ اسے اپنے آپ سے ایسا بے خبر کردیتا ہے کہ وہ اپنی حرص و ہوس اور خودغرضی کی بنیاد پر سماج کی آنکھ کا نور بننے کے بجائے کانٹے کی طرح چھبنے لگتا ہے اور سماج میں قتل وغارت گری کے واقعات پیش آتے ہیں، لذت پرستی اسے ایسے گناہوں کے دلدل میں پھنسادیتی ہے کہ خود اس کا وجود ان گناہوں کی سزا پاکر سراپا عبرت ہوجاتا ہے، جس کی مثال اس وقت ایڈس جیسی بیماری ہے۔

خدافراموشی اسے بداخلاقی، خیانت اور بددیانتی پر دلیر بنادیتی ہے، اُس میں جوابدہی کا احساس ختم ہوجاتا ہے اور جو شخص اِس نوبت پر آجائے وہ سماج کے لئے ناسور بن جاتا ہے، وہ سماج کیسا گہوارۂ امن ہوگا جس میں ہر شخص اپنے جیسے انسانوں کے بجائے خدا سے پانے کا یقین رکھتا ہو ،جس میں ایک فاقہ مست انسان بھی ہیرے کے قیمتی ہار پر نگاہ حرص ڈالنے کو تیار نہ ہو، جس کو نہ آنکھ نے دیکھا ہو، نہ زبان نے ٹوکا ہو، نہ دشمنوں نے اس کے خلاف رپورٹ لکھوائی ہو؛ مگر اس کا ضمیر اس کے کردار وعمل کا محافظ ہو!

۳/اکتوبر۲۰۰۸ء

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

حجاج کرام —— کچھ مخلصانہ مشورے

وارفتگان عشق کا کارواں سوئے حرم رواں دواں ہے، لبیک اللّٰہم لبیک کی صدائیں - کیا فضائیں، کیا سمندر اور کیا خشکی؟ - ہر طرف گونج رہی ہیں، خدا کے بندے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کے حکم پر تنہا ہی لبیک کی آواز لگائی تھی؛ لیکن کیسی مقبول تھی یہ آواز جو آج مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پوری دنیا کا احاطہ کئے ہوئی ہے اور ہر طرف سے راہ محبت کے مسافر کفن لپیٹے ہوئے صحرائے عرب کے ایک چوکور پتھر کے مکان کی طرف بڑھ رہے ہیں، یہ سادہ نقشہ کی عمارت قبلۂ نماز بھی ہے، قبلۂ محبت بھی اور قبلۂ احترام بھی، مبارک ہیں وہ لوگ جو اس سفر سعادت سے بہرہ مند ہو رہے ہیں، قابل رشک ہیں وہ ہستیاں جنہیں اس در تک حاضری کی سعادت نصیب ہو رہی ہے، خوش قسمت ہیں وہ اہل ایمان جو حرمین شریفین کے دیدار سے اپنے دیدۂ چشم کو سجائے ہوئے ہیں اور رب کائنات سے محبت کرنے والوں کی فہرست میں اپنا نام لکھائے ہوئے ہیں۔

لیکن یہ سفر جتنا مبارک ہے اس کے تقاضے بھی اتنے ہی زیادہ ہیں، اگر اس سفر کا حق ادا نہیں کیا گیا تو خدا کی طرف سے پکڑ کا اندیشہ بھی اسی قدر ہے، جو عمل جس قدر اونچا ہوتا ہے اس میں کوتاہی اسی قدر نقصان بھی پہنچاتی ہے، اگر کوئی شخص دو فٹ کی بلندی سے گر جائے تو معمولی چوٹ سے دوچار ہوگا؛ لیکن اگر کوئی شخص دو سو فٹ کی بلندی سے گرے تو جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا؛ اسی لئے مسافران حرم کو چاہئے کہ حج جیسی عبادت کو اس کے پورے حقوق کے ساتھ ادا کریں اور زیادہ سے زیادہ احتیاط کا راستہ اختیار کریں؛ کیونکہ عمر بھر میں ایک ہی بار حج فرض ہے، اس کے بعد اگر آپ کو سفر حج نصیب ہو تو وہ حج نفل ہوگا فرض نہیں ہوگا، حج ایسی عبادت ہے جس میں کثیر رقم خرچ کرنی پڑتی ہے اور جسمانی مشقت بھی نماز روزہ سے کہیں بڑھ کر ہے؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: حج بھی ایک طرح کا جہاد ہے، **"الحج جهاد"** (سنن ابن ماجة ، كتاب المناسك ،

باب الحج جهاد النساء ،حدیث نمبر:۲۹۰۲)، نیز بعض روایتوں کے مطابق آپ ﷺ نے عورتوں کے بارے میں فرمایا کہ حج ان کے لئے جہاد کے درجہ میں ہے؛ لہٰذا جو عبادت اتنے اخراجات اور اتنی مشقت سے کی جارہی ہے اور جسے آئندہ پھر کبھی بطور فرض کے ادا کرنے کا موقع نہیں ہے، اس میں جس قدر احتیاط سے کام لیا جائے اور مستحبات وآداب کا اہتمام کیا جائے کم ہے، اسی پس منظر میں چند ضروری امور کی طرف حج کے لئے جانے والے عازمین کو متوجہ کیا جاتا ہے۔

❁ بعض مسائل وہ ہیں جن میں قرآن وحدیث کے احکام بالکل واضح ہیں، ان میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے نہیں پایا جاتا ،بعض مسائل میں ایسی تعبیر اختیار کی گئی ہے کہ ایک سے زیادہ رایوں کی گنجائش ہے؛ اس لئے ان میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے کہ دشواری کے وقت علماء اس اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس رائے کو اختیار کر سکتے ہیں، جس میں سہولت ہو، جیسے دسویں ذی الحجہ کو منیٰ میں تین عمل کرنا ہوتا ہے، جمرات پر کنکری مارنا، قربانی کرنا اور بال منڈانا، رسول اللہ ﷺ نے اسی ترتیب سے ان تینوں کاموں کو انجام دیا ہے، بعض صحابہ اس ترتیب کو باقی نہیں رکھ سکے اور انہوں نے حضور ﷺ سے صورت حال عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں ہے، "**افعل ولا حرج**" (صحیح البخاری ، کتاب العلم ، باب الفتيا وهو واقف على الدابة وغيرها ،حدیث نمبر:۸۳) —— اب حرج نہ ہونے کا دو مطلب ہوسکتا ہے: ایک یہ کہ اس میں کوئی دم واجب نہ ہوگا؛ گویا کہ حضور ﷺ نے دنیوی حرج کو دور فرمایا، دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ آخرت میں اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، یعنی اخروی حرج کی نفی کی گئی، اب بعض فقہاء نے پہلا معنی مراد لیا اور انہوں نے کہا کہ دسویں تاریخ کے ان تینوں افعال میں ترتیب واجب نہیں اور کوئی شخص ترتیب کی رعایت نہ کر پائے تو دم واجب نہ ہوگا، امام ابوحنیفہؒ نے دوسرا معنی مراد لیا، یعنی ترتیب واجب تو ہے اور اس کی رعایت نہ کرنے پر دم بھی واجب ہوگا؛ لیکن گناہ نہیں ہوگا، آج کل اژدہام کی کثرت، شرعی احکام سے ناواقفیت، لوگوں کی قیام گاہ سے قربان گاہ کی دوری کے باعث اس ترتیب کو باقی رکھنے میں قابل لحاظ مشقت ہوتی ہے، اس لئے موجودہ دور کے علماء ہند کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سلف صالحین کے اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلی رائے پر بھی عمل کیا جاسکتا ہے۔

مگر ایسے مسائل میں جہاں تک ممکن ہو بہتر طریقہ یہ ہے کہ جس رائے میں زیادہ احتیاط ہو اس پر عمل کیا جائے؛ تا کہ حج جیسی عبادت کی ادائیگی ہر شک وشبہ سے بالاتر ہو جائے، اسی کی ایک مثال عمرہ اور حج کے افعال مکمل ہونے کے بعد بال کٹانے کی ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک محض تین بال کا کاٹ لینا بھی کافی ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کم از کم چوتھائی حصہ کے بال کا کٹانا ضروری ہے، امام مالکؒ کے نزدیک پورے سر کا منڈانا یا کٹانا ضروری ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پورے سر کا بال منڈایا ہے، پہلے دونوں نقطہ نظر کے حاملین آپ ﷺ کے اس عمل کو استحباب کے درجہ میں رکھتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس میں احتیاط پورے سر کا بال منڈانے یا کٹانے میں ہے؛ کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ کا عمل رہا ہے اور اس کے درست بلکہ کم سے کم افضل ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں؛ اس لئے اگر کسی مسئلہ میں اختلاف رائے ہو اور ارباب افتاء نے لوگوں کی مشکلات پر نظر کرتے ہوئے آسان رائے پر عمل کرنے کی گنجائش نکالی ہو تو اس پر عمل کرنے کی گنجائش ہے، اور اگر آپ کا کوئی ساتھی اس رائے پر عمل کر رہا ہو تو اس کو خطا کار یا حقیر سمجھنا قطعاً غلط ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ امت کے لئے آسانی کے پہلو کو اختیار کرتے تھے؛ لیکن کوشش بہر حال ایسی رائے پر عمل کرنے کی ہونی چاہیے، جس میں احتیاط کا پہلو ہو اور جس پر عمل کر کے انسان اختلاف سے بچ سکتا ہو، یہ بات اس لئے اہم ہے کہ حج کے درمیان بعض لوگ حاجیوں کو اختلافی مسائل میں کسی معقول ضرورت کے بغیر ایسے عمل کا مشورہ دیتے ہیں جو جمہور فقہاء کے نزدیک درست نہیں؛ اس لئے مسائل ان علماء اور ارباب افتاء سے معلوم کرنا چاہیے جن کے علم وفضل پر آپ کو تجربہ کی بنیاد پر اعتماد ہو، نہ یہ کہ ہر مسئلہ بتانے والے کی بات کو قبول کرتے چلے جائیں۔

❁ عبادتوں کا مقصد اپنی خواہش پر اللہ کی خوشنودی کو غالب کرنا ہے، اگر وہاں بھی انسان اپنی خواہش کا غلام بنا رہے تو یہ افسوس کی بات ہے، بہت سے موقعوں پر اس کی مثالیں سامنے آتی ہیں، جیسے حج میں بال کا منڈانا بھی جائز ہے اور کٹانا بھی؛ لیکن رسول اللہ ﷺ نے تین بار بال منڈانے والوں کے حق میں رحمت خداوندی کی دعا کی ہے اور ایک بار بال کٹانے والے کے حق میں، (مسلم: عن عبد الله بن عمر ؓ، حدیث نمبر: ۶۴-۳۱۴۵) یقیناً ہر مسلمان کی آرزو ہوتی ہے کہ ایک دفعہ کے بجائے تین دفعہ اپنے آقا کی دعا پائے؛ لیکن بعض نوجوانوں پر بال کی محبت اس

قدر غالب ہوتی ہے کہ حج جیسے مبارک موقع پر بھی وہ اپنی اس چاہت کو قربان کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

❁ حج جیسی عبادت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس میں خالص حلال مال خرچ ہو، مال حرام کی آمیزش نہ ہو، جہاں سود اور قمار کے ذریعہ حاصل ہونے والا پیسہ حرام ہے، وہیں رشوت، جبری وصولی اور ناجائز قبضہ وغیرہ کے ذریعہ بھی حاصل ہونے والے مال سے حج کرنا درست نہیں، اگر کسی شخص نے ایسے مال سے حج کیا تو گوفریضۂ حج ادا ہوجائے گا؛ لیکن اندیشہ ہے کہ اس کی عبادت اللہ کے نزدیک مقبول نہ ہو:

"**ویجتهد فی تحصیل نفقة حلال فإنه لا یقبل بالنفقة الحرام کما ورد فی الحدیث مع أنه لیسقط الفرض عنه معها**" (ردالمحتار : ۳/۴۵۴)

اس لئے حج کے لئے حلال مال کے استعمال کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے، نیز حرام سے توبہ کرنی چاہئے اور توبہ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جو مالِ حرام متعین طور پر اس کے پاس موجود ہو، اسے بلا نیت ثواب صدقہ کردے۔

❁ افسوس کہ حج میں بعض دفعہ فرائض و واجبات کا بھی لحاظ نہیں رکھا جاتا، بعض حضرات فجر کی نماز چھوڑ دیتے ہیں؛ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کفر وشرک اور ایمان کے درمیان نماز کا ترک کرنا معیار ہے:

"**بین الرجل وبین الشرک والکفر ترک الصلاة**" (مسلم عن جابر بن عبد الله ﷺ، کتاب الإیمان، باب بیان إطلاق اسم الکفر علی من ترك الصلاة ، حدیث نمبر:۲۵۶)

اسی طرح بعض حضرات حرمین شریفین میں رہنے کے باوجود جماعت کا اہتمام نہیں کرتے، حالانکہ جو لوگ مسافر نہ ہوں، ان کے حق میں جماعت واجب ہے، رسول اللہ ﷺ نے ان پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ان کے گھروں کو نذر آتش کردوں، (ابوداؤد عن ابی ہریرہ ﷺ، حدیث نمبر:۸۴۵) ایسی وعیدوں کا کوئی شخص حرم شریف جیسی مبارک

جگہ میں مستحق قرار پائے تو اس کی حرماں نصیبی کی بھی کوئی انتہا ہوگی؟ اس لئے حجاج مرد وخواتین کو نمازوں کا اور انہیں جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا خصوصی اہتمام کرنا چاہئے۔

❁ حج کے منکرات میں ایک غیر محرم کے ساتھ اختلاط بھی ہے، کمروں میں مردوں اور عورتوں کا مشترک قیام رہتا ہے، اس میں ایک دوسرے کے غیر محرم بھی ہوتے ہیں، مسجدوں کو جانے اور آنے کے اوقات مختلف ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے بعض دفعہ غیر محرم کے ساتھ تنہائی کی بھی نوبت آجاتی ہے، یہ نہایت ہی قبیح بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب اجنبی مرد و عورت کی تنہائی ہوتی ہے تو اس میں کا تیسرا شیطان ہوتا ہے، نیز مردوں اور عورتوں کا اس طرح مخلوط قیام نیک طبیعت مرد وخواتین کے لئے گرانی کا باعث بھی بنتا ہے؛ اس لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ چند افراد مل کر اس طرح نظم بنائیں کہ ایک کمرہ مردوں کے لئے مخصوص کردیں اور ایک کمرہ عورتوں کے لئے؛ تاکہ بدنگاہی، بے پردگی اور اختلاط کے گناہ سے بھی بچیں اور دونوں کو بے تکلف ماحول میں رہنے کا بھی موقع ملے۔

❁ حج کے سفر میں خرید وفروخت کی ممانعت نہیں ہے؛ لیکن اس سے ایسا اشتغال اور ایسی رغبت بھی نہ ہو کہ گویا سفر حج کا مقصود ہی یہی ہے، یہ عبادت کی روح کے منافی ہے، افسوس کہ بہت سے لوگ حرمین شریفین میں پہنچتے ہی خرید وفروخت کا پروگرام بنانا اور حریصانہ نظر سے بازاروں کا جائزہ لینا شروع کردیتے ہیں اور جن کا واپسی کا سفر حج کے بعد قریب ہوتا ہے ان میں سے بعض حضرات کو تو دیکھا گیا ہے کہ وہ منیٰ ہی سے خریداری کا نقشہ تیار کرنے لگتے ہیں کہ کس کے لئے کیا سامان خرید کر لے جانا ہے؟ یہ یقیناً قابل افسوس ہے، حج وہ جگہ ہے جہاں سے انسان کو زرق برق مادی لباس کے بجائے 'لباس تقویٰ' لے کر جانا چاہئے، جہاں سے سونا چاندی کے بجائے زیور عمل کی سوغات اس کے ساتھ ہونی چاہئے، جہاں سے غذائے جسمانی کے بجائے غذائے روحانی کا توشہ لے کر اسے لوٹنا چاہئے؛ لیکن بہت سے حجاج مادی اسباب عشرت کی بہتات لے کر واپس ہوتے ہیں اور جہاز کا عملہ ان کے سامانوں کے ڈھیر کو دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے، حرمین شریفین سے اگر کوئی چیز لانے کی ہے تو وہ وہاں کے تبرکات ہیں، یعنی مکہ مکرمہ سے آب زم زم اور مدینہ منورہ سے کھجوریں نہ کہ متاع عیش وعشرت۔

❁ 　بعض حجاج خریدنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ سفر حج کو تجارتی سفر بھی بنالیتے ہیں، ادھر ایک سلسلہ بعض افراد نے قربانی کے جانور فروخت کرنے کا شروع کر رکھا ہے، جس میں متعدد واقعات دھوکہ اور خیانت کے پکڑے گئے ہیں، اس لئے ایسی چیزوں سے بچنا ضروری ہے۔

❁ 　عبادت کی روح، اخلاص وللّٰہیت ہے اور اخلاص کی ایک علامت اپنے نیک اعمال کو چھپانا اور اس کی تشہیر سے بچنا ہے؛ لیکن افسوس کہ آج کل حج وعمرہ کی بھی باضابطہ تشہیر کی جاتی ہے، اخبارات میں مصور اشتہارات دیئے جاتے ہیں کہ فلاں صاحب حج کے لئے جارہے ہیں، خبریں بھی چھاپی جاتی ہیں، افسوس کہ عوام اور دنیادار سمجھے جانے والے لوگ ہی نہیں، وہ لوگ بھی اس میں مبتلا ہیں جو اصلاح وارشاد کی مسندوں پر متمکن ہیں، یہ نہایت قابل افسوس بات ہے، حج کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اس میں تجارت، دکھاوا اور تشہیر سے بچایا جائے: ''**ویجرد سفره عن التجارة والرياء والسمعة والفخر**'' (فتح القدير :۲/۴۰۷)۔

❁ 　حج کا سفر ہے ہی مشقت ومجاہدہ کا سفر؛ اس لئے اسے ہنسی خوشی برداشت کرنا چاہئے اور جذبہ ایثار کے ساتھ عزم سفر کرنا چاہئے، سفرِ عشق ومحبت کھونے کا سفر ہوتا ہے، اس میں کھونا ہی پانا ہے اور اس میں لٹ جانا ہی سرفرازی ہے، سفر حج میں بہت سے مواقع باہمی کشاکش کے آتے ہیں، تکان اور مشقت اس احساس کو اور بھی سوا کردیتی ہے؛ اس لئے اگر آدمی پہلے سے ذہن بنالے کہ ہم اپنے حصہ سے کسی قدر کم پر راضی ہو جائیں گے اور اپنے بھائی کے حق میں ایثار سے کام لیں گے تو نہ صرف آخرت میں وہ اجر کا مستحق ہوگا؛ بلکہ اپنے ساتھیوں کے درمیان بھی وہ محبوب وپسندیدہ شخص بن کر رہ سکے گا۔

❁ 　حرمین شریفین کا تقدس، اس کی عظمت اور رشتہ ایمان کی وجہ سے اس سے جو محبت ہے، اس کا تقاضا ہے کہ وہاں کے لوگوں، وہاں کی چیزوں اور وہاں کی خوبیوں کو سراہا جائے اور خامیوں اور پریشانیوں کے ذکر سے گریز کیا جائے؛ کیونکہ ان مبارک مقامات سے محبت دراصل ایمان کا حصہ ہے، انسان کو اپنے والدین اور اولاد سے محبت ہوتی ہے تو وہ ان کی خامیوں میں بھی خوبیوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے؛ اس لئے زبان کو محتاط رکھنے کی ضرورت ہے، بہت سے لوگ یہاں پہنچ کر بھی شکایت کا دفتر کھولے رہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے بارے میں فرمایا کہ

اس کی مثال ایک بھٹی کی سی ہے، جو خراب حصے کو اچھے حصہ سے الگ کر دیتی ہے (مسلم، حدیث نمبر:۵۵۳۳) تو اگر ان مقامات کی محبت سے کسی مسلمان کا سینہ خدانخواستہ لبریز نہ ہو، یہاں کی فضائیں اور یہاں کی چیزیں دل کو نہ بھائیں تو ایمان میں کمزوری کی علامت ہے؛ اس لئے ایسی باتوں سے خوب احتیاط کرنی چاہئے؛ بلکہ وہاں کے لوگوں کی کمزوریوں سے بھی درگذر کرنا چاہئے اور اس کا آسان نسخہ یہ ہے کہ انسان اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں پر نظر رکھے۔

۷/نومبر۲۰۰۸ء

مدینہ منورہ

من ایں جا، زندگی ایں جا، لحد ایں جا، کنار ایں جا

اگر مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کا قبلہ ہے تو مدینہ منورہ میں ان کا قبلہ نما (صلی اللہ علیہ وسلم)، آپ ﷺ ہی کے ذریعہ ہم نے خدا کو پہچانا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا ہمیں علم ہوا ہے، رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ قرآن خدا کی کتاب ہے تو ہمیں اس کا کتابِ الٰہی ہونا معلوم ہوا، آپ ﷺ نے تعلیم دی کہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے تو ہم آخرت پر ایمان لائے، آپ ﷺ نے خدا کی بندگی کا طریقہ سکھایا تو آپ ﷺ کے نقشِ قدم کو دیکھ دیکھ کر ہم عبادت کرتے ہیں، آپ ﷺ نے زندگی بسر کرنے کا سلیقہ بتایا تو وہی آج ہمارے لئے نشانِ راہ ہے، غرض کہ آپ ﷺ کی ذات والا صفات کی حیثیت دین وشریعت کے لئے قبلہ نما کی ہے، آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لانا ہی کافی نہیں ہے؛ بلکہ آپ کی محبت اور عظمت بھی جزوِ ایمان ہے اور آپ ﷺ کی اتباع واطاعت ہی میں مسلمانوں کی نجات مضمر ہے، حضرت مرزا مظہر جان جاناں نے اس حقیقت کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان فرمایا ہے:

محمد ! از تو می خواہم خدارا
الٰہی ! از تو حبّ مصطفیٰ را

’’یعنی محمد ﷺ کے ذریعہ میں خدا کی قربت کا خواستگار ہوں اور خدا
سے مصطفیٰ ﷺ کی محبت کا طالب ہوں‘‘

چنانچہ مشہور صوفی خواجہ عثمان ہارونی نے دربار رسالت مآب میں حاضری کا خوب نقشہ کھینچا ہے اور دل چاہتا ہے کہ ان کے قلبی واردات کی یہ امانت قارئین تک پہونچادی جائے:

بنہ برپائے احمد سرکہ یابی صد وقار ایں جا

زر ایں جا، حشمت ایں جا، دولت ایں جا، افتخار ایں جا

''احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر اپنا سر رکھ دو کہ اس سے تمہیں سیکڑوں درجہ وقار حاصل ہوگا، یہاں تم زر بھی پاؤ گے، جاہ وحشمت بھی، دولت بھی اور سرمایۂ افتخار بھی''

چو در طیبہ در آیم با ہزاراں شوق می خوانم

من ایں جا، زندگی ایں جا، لحد ایں جا، کنار ایں جا

''جب میں مدینہ طیبہ آتا ہوں تو ہزار شوق کے ساتھ پڑھتا ہوں، مجھے یہی جگہ میسر ہو، یہیں زندگی گذارنے کا موقع ملے، یہیں قبر بنے، اسی کی آغوش میں رہوں''

نہ باشد جائے من جز آستانِ مصطفیٰ عثماںؔ

سر ایں جا، سجدہ ایں جا، بندگی ایں جا، قرار ایں جا

''مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ کے سوا عثمان! میرے لئے کوئی اور جگہ نہیں ہے، اسی آستانہ پر سر رکھنا ہے، یہیں (خدا کو) سجدہ کرنا ہے، یہیں اللہ کی بندگی کرنی ہے، یہیں دل کا قرار وسکون ہے''

غرض کہ آپ کی ذات والا صفات امت کی محبت کا مرکز ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تک کسی شخص کے اندر میری محبت اس کے والدین، اولاد اور تمام لوگوں سے بڑھ نہیں جائے، وہ مسلمان نہیں ہوسکتا:

" لا يؤمن أحدكم حتى أكون أحب إليه من ولده ووالده والناس أجمعين " (صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب وجوب محبة رسول الله ﷺ أكثر من الأهل والولد ، حدیث نمبر:۷۰)

—— ہندوستان کے ایک بافیض اور کثیر التالیف بزرگ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے ایک صاحب نے ڈرتے ڈرتے استفسار کیا کہ حضور ﷺ نے ایمان کے لئے اولاد سے زیادہ اپنی محبت کو شرط ٹھہرایا ہے اور مجھے تامل ہے کہ کیا واقعی حضور ﷺ سے میری محبت میری اولاد سے بڑھ کر ہے؟

مولانا تھانویؒ نے فرمایا: یقیناً اولاد سے بڑھ کر ہے، پھر انہوں نے دریافت کیا: اگر تمہارا لڑکا حضورا کی شان میں — نعوذ باللہ — سب وشتم کرے تو تم کیا کروگے؟ وہ صاحب کہنے لگے: اگر اس نے ایسا کہا تو میں اسے ذبح کرڈالوں گا، حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ تمہاری یہ بات دلیل ہے کہ تمہارے دل میں رسول اللہ ﷺ کی محبت تمہاری اولاد سے بڑھ کر ہے۔

محبت کا فلسفہ یہ ہے کہ محبوب کی ہر چیز سے محبت ہوتی ہے، دنیا کی ناپائیدار محبت کا حال یہ ہے کہ انسان جب کسی کو پسند کرتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ اس کا لباس اسی کی طرح ہوجائے، اس کے بالوں کی وضع اسی شخص کے مطابق ہوں، یہاں تک کہ بعض لوگ تو چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے میں بھی اسی کی نقل کرنے لگتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی محبت تو ان تمام محبتوں سے سوا ہے، ایسی محبت کہ جس پر ساری محبتیں قربان کردی جائیں؛ اس لئے آپ سے تعلق رکھنے والی تو ہر چیز اہل ایمان کے لئے سرمۂ چشم ہے، یہی چیز ہے، جو ہر مؤمن کے لئے مدینہ منورہ کو محبت کا مرکز بناتی ہے؛ اس لئے اگرچہ حج کے افعال مکہ مکرمہ، منیٰ، مزدلفہ اور عرفات سے متعلق ہیں؛ لیکن کون کم نصیب ہوگا جو ارض حجاز تک پہونچے اور مدینہ منورہ کی حاضری سے محرومی کو گوارا کرے؟ اگر مکہ مکرمہ میں اللہ تعالیٰ کی نسبت سے جلال کا رنگ نظر آتا ہے، تو مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی نسبت سے پر جمال کیفیت کو ہر مرد مؤمن محسوس کرتا ہے، اس شہر کی فضائیں اور ہوائیں، یہاں کے سنگ وخشت، یہاں کے گل وخار اور یہاں کی خاک وغبار ہر شئ اصحاب ایمان کے کیف کو بڑھاتی اور اس کی آتش عشق کو سلگاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو مدینہ منورہ سے ایسی محبت تھی کہ آپ ﷺ نے اس کے لئے دعاء فرمائی کہ اس کے پیمانوں میں بھی اللہ کی طرف سے برکت آجائے، (صحیح البخاری، عن عبد اللہ بن زید ﷺ، حدیث نمبر: ۲۱۲۹) آپ ﷺ نے دعاء کی کہ اے اللہ تعالیٰ! اس شہر کی برکت کو مکہ کی برکت سے دو چند فرمادے:

"اللهم اجعل بالمدينة ضعفى ما جعلت بمكة من البركة"

(صحیح البخاری، عن أنس ﷺ، حدیث نمبر: ۱۸۸۵)

آپ ﷺ نے مدینہ کو ایک ایسی بھٹی قرار دیا، جو لوہے سے اس کی ملاوٹ کو الگ کردیتی ہے،

(صحيح البخاری ، عن ابی هريره ﷺ،حدیث نمبر:۱۸۷۱)، گویا مدینہ منورہ سے تعلق اخلاص ونفاق کے درمیان حد فاصل ہے، ارشاد ہوا کہ جولوگ اہل مدینہ کے ساتھ بُرائی کا ارادہ کریں گے، اللہ انہیں دوزخ میں اس طرح پگھلائیں گے، جیسے پانی میں نمک پگھل جاتا ہے،(صحیح البخاری ، کتاب فضائل المدينة ، باب إثم من كاد أهل المدينة ،حدیث نمبر:۱۷۷۸) آپ ﷺ نے مدینہ کی خود روگھاس کو اکھاڑنے ، آپ اُگ آنے والے درختوں کو کاٹنے ، یہاں کے شکار کو تنگ کرنے اوراس مبارک شہر میں ہتھیار اٹھانے کو بھی منع فرمایا،(سنن ابی داؤد عن علی ﷺ،حدیث نمبر:۲۰۳۴) آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اہل مدینہ کوڈرایا دھمکایا، گویا اس نے مجھے ڈرایا''(مسند احمد ، عن جابر ﷺ،حدیث نمبر:۱۴۸۰۳) آپ ﷺ نے دعاء فرمائی کہ اے اللہ! ہمارے دلوں میں مکہ سے بھی بڑھ کر مدینہ کی محبت پیدا فرمادے(مسند احمد،عن عائشہ رضی اللہ عنہا،حدیث نمبر:۲۵۷۰۸)۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اس شہر کی فتنۂ دجال سے حفاظت فرمائیں گے،(صحیح بخاری ، عن ابی هريره ﷺ،حدیث نمبر:۱۸۸۰) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دجال کا فتنۂ کبریٰ ظاہر ہوگا تو مدینہ پر سات دروازے ہوں گے اور ہر دروازہ پر دوفرشتے مقرر ہوں گے،(بخاری ، عن ابی بكره ﷺ،حدیث نمبر:۱۸۷۹) حضرت ابو ہریرہ ﷺ راوی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں کے شہروں میں جو شہر سب سے آخر میں ویران ہوگا، وہ مدینہ منورہ ہے، (ترمذی، حدیث نمبر:۳۹۱۹) یہ شہر ایمان واسلام کا ایسا دائمی مرکز ہے کہ ارشاد ہوا کہ ایک زمانہ میں ایمان مدینہ میں اس طرح سمٹ آئے گا، جیسے سانپ اپنے بل میں سمٹ آتا ہے،(بخاری ، عن ابی هريره ﷺ،حدیث نمبر:۱۸۷۶) ارشاد نبوی ہے کہ مدینہ اسلام کی چوٹی (قبہ) ہے، یہ ایمان کا گھر ہے، یہ سرزمین ہجرت ہے اور یہ حلال وحرام کا ٹھکانہ، یعنی حلال و حرام کے جاننے کا مرکز ہے،(طبرانی ، عن ابی هريره ﷺ ، جمع الفوائد ،حدیث نمبر:۳۷۷۳) —— مدینہ کی ان ہی خصوصیات کی بنا پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص مدینہ میں مرسکے تو کوشش کرے کہ یہاں اس کی موت واقع ہو؛ کیوں کہ جس کی موت مدینہ میں ہوگی ، میں اس کے لئے شفاعت کروں گا ، (ترمذی، عن ابن عمر ﷺ، حدیث نمبر : ۳۹۱۷) —— ایک صاحب کی تدفین مدینہ میں ہورہی تھی ، دوسرے صاحب کہنے لگے : مردمؤمن کے لئے یہ کتنا خراب مدفن ہے؟ آپ ا

نے فرمایا: تم نے کس قدر بُری بات کہی ہے، ان صاحب نے معذرت کی کہ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ ان کو جہاد میں شہادت میسر نہیں ہوئی، آپ ﷺ نے تین بار ارشاد فرمایا: روئے ارض پر کوئی خطہ ایسا نہیں، جو مدینہ سے بڑھ کر قبر کے لئے مجھے محبوب ہو:

" ما على الأرض بقعة هي أحب إليّ أن يكون قبري بها منها " (مؤطأ إمام مالك ،حدیث نمبر:۱۰۰۵)

—— آپ ﷺ نے فرمایا کہ خود اللہ تعالیٰ نے مدینہ کا نام ''طابہ'' رکھا ہے، (مسلم، عن جابر ؓ، حدیث نمبر: ۱۳۸۵) —— اسلام سے پہلے مدینہ کا نام یثرِب تھا، آپ ﷺ نے پسند نہیں فرمایا کہ اب بھی اس شہر کا نام یثرب لیا جائے؛ چنانچہ ارشاد ہوا کہ جو مدینہ کو یثرب کہے، اسے استغفار کرنا چاہئے، یہ تو ''طابہ ہے طابہ!'' (مسند احمد، عن براء بن عازب ؓ، حدیث نمبر: ۱۸۰۴۸) —— طابہ کے معنی پاک کے ہیں۔

ایسے مبارک اور محبوب شہر کی زیارت سے بڑھ کر مؤمن کے لئے کیا سعادت ہوسکتی ہے، اسی شہر میں رسول اللہ ﷺ کا روضۂ مطہرہ ہے، جس کی خاک اہل ایمان کے لئے سرمۂ چشم اور راحتِ جان ہے اور کیوں نہ ہو کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے حج کیا اور میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی؛ گویا اس نے میری زندگی میں مجھ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا ہے'' (جمع الفوائد ، عن ابن عمر ؓ، حدیث نمبر:۳۸۰۲، بحوالۂ معجم کبیر للطبرانی)

—— حضرت عبداللہ بن عمر ؓ ہی کی ایک اور روایت نقل کی گئی ہے کہ جس نے میری قبر کی زیارت کی، اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی، (جمع الفوائد، حدیث نمبر: ۳۸۰۱، بسند مسند بزار) —— اس شخص کی خوش قسمتی کا بھی کوئی ٹھکانہ ہوسکتا ہے، جس کو آپ ﷺ کی شفاعت میں حصہ مل جائے!

اسی شہر میں اور آپ ﷺ کی قبر شریف ہی سے متصل مسجد نبوی ﷺ ہے، جس کی تعمیر میں نہ صرف صحابۂ کرام ؓ؛ بلکہ خود آپ ﷺ نے بنفس نفیس شرکت فرمائی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد آخری مسجد ہے: ''...... **فإني آخر الأنبياء وأن مسجدي آخر**

المساجد ''(صحیح مسلم، عن ابی ہریرہ ؓ، حدیث نمبر:۱۳۹۴) —— یہ ان تین مسجدوں میں سے ایک ہے، جس کے لئے آنحضور ﷺ نے خاص طور سے سفر کرنے کی تلقین فرمائی ہے، (ترمذی، عن ابی سعید الخدری ؓ، حدیث نمبر:۳۲۶) —— مسجد حرام کے بعد اس میں نماز پڑھنا تمام دوسری مسجدوں کے مقابلہ ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے؛ (بخاری، عن ابی ہریرہ ؓ، حدیث نمبر:۱۱۹۰) —— بلکہ حضرت انس ؓ کی بعض روایتوں میں مروی ہے:

''مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر اور مسجد نبوی میں پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے'' (ابن ماجہ، حدیث نمبر:۱۴۱۳)

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو مسجد نبوی میں چالیس نمازیں اس طرح ادا کرے کہ درمیان میں اس کی کوئی نماز فوت نہ ہو، اس کے لئے دوزخ سے براءت، عذاب سے نجات اور نفاق سے براءت لکھی جائے گی''

(مسند احمد، عن انس ؓ، حدیث نمبر:۱۲۱۷۳)

اسی مسجد میں رسول اللہ ﷺ کا منبر مبارک بھی موجود ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

''میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان کا حصہ جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے اور میرا منبر میرے حوض (حوض کوثر) پر ہے''

(بخاری، عن ابی ہریرہ ؓ، حدیث نمبر:۱۸۸۸)

مدینہ سے باہر نکلئے تو قریب ہی ''قباء'' ہے، جس کی آبادیاں اب مدینہ منورہ سے مل چکی ہیں، معمول مبارک تھا کہ آپ ﷺ مسجد قباء کو کبھی پیدل اور کبھی سوار ہو کر جاتے اور وہاں دو رکعت نماز ادا کرتے، (مسلم، عن ابن عمر ؓ، حدیث نمبر:۱۳۹۹) آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مسجد قبا میں نماز ادا کرنے کا اجر عمرہ کے برابر ہے، (ترمذی، حدیث نمبر:۳۲۴) —— مدینہ ہی کی سرحد پر وہ مشہور پہاڑ ہے، جسے ''اُحُد'' کہتے ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ ایسا پہاڑ ہے، جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں، (مسلم، عن انس ؓ، حدیث نمبر:۱۳۹۳) اسی کے دامن میں سید الشہداء حضرت حمزہ ؓ اور بعض اور جاں نثاران اسلام ؓ مدفون ہیں، —— مسجد نبوی کے

سامنے ہی ''جنت البقیع''ہے، ایسا قبرستان جس میں دس ہزار اہل بیت وصحابہ ﷺمدفون ہیں اور ان کے علاوہ بے شمار محدثین، فقہاء اور صوفیاء وصالحین رحمہم اللہ اسی کی خاک میں آسودۂ خواب ہیں۔

مسلمانوں کے لئے اس شہر سے بڑھ کر قبلۂ محبت کیا ہوگا ؟ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ جب مدینہ کی حاضری نصیب ہو تو قدم قدم پر اس شہر کی عظمت وحرمت کا پاس ولحاظ بھی رکھا جائے، یہاں نمازوں اور جماعتوں کا اہتمام ہو، روضۂ نبوی پر ادب واحترام کا حق ادا کرتے ہوئے صلاۃ وسلام کا نذرانۂ محبت پیش کیا جائے، مدینہ کے لوگوں کو اور وہاں کی چیزوں کو بُرا بھلا کہنے سے بچا جائے، زیادہ سے زیادہ درود شریف اور ذکر نبوی ﷺ سے زبان کو تر رکھا جائے، مدینہ میں جو فقراء نظر آئیں، ان پر صدقہ کیا جائے اور خیر کے کاموں میں خرچ کرنے میں فراخ دلی سے کام لیا جائے، قبر شریف کی زیارت اور تمام کاموں میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ شریعت کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز نہ ہو، وہی اعمال کئے جائیں، جو قرآن وحدیث سے ثابت اور صحابہ ﷺ سے مروی ہیں ؛ کیوں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''مدینہ بھی حرام ہے، جس نے مدینہ میں کوئی بدعت کی یا کسی بدعت کرنے والے کو پناہ دی، اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانیت کی لعنت ہو، ایسے شخص سے قیامت کے دن نہ فرض قبول کیا جائے گا اور نہ نفل'' (مسلم عن ابی ہریرہ ﷺ، حدیث نمبر:۱۳۷۱)

—— جو باتیں قرآن وحدیث سے ثابت نہ ہوں اور نہ صحابہ ﷺ کے زمانہ میں وہ عمل کیا گیا ہو، اسے دینی کام سمجھ کر کرنے کو ''بدعت'' کہتے ہیں ؛ اس لئے ہر عمل کے ساتھ خوب سوچئے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت میں موجود ہے یا نہیں؟ اور کہیں یہ بدعت کے دائرہ میں تو نہیں آتی ہے؟ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ حضور ﷺ کی دعاء اور شفاعت کا سرمایہ لے کر واپس ہونے کی بجائے لعنت کا طوق لے کر واپس آئیں کہ اس سے بڑھ کر کم نصیبی، بلکہ حرماں نصیبی اور کیا ہوگی؟؟

۲۱/نومبر ۲۰۰۸ء

قرآن مجید کا مطلوب انسان

قرآن مجید ہدایت اور رہنمائی کی کتاب ہے، اس کے ہر لفظ کی تہہ میں ہدایت کا نور موجود ہے، اس نے دو اہم کردار پیش کئے ہیں، انسانیت کے باپ اور اللہ کے پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام کا اور شیاطین کے سردار ابلیس کا!

ابلیس بھی ''جن'' نامی مخلوق ہی سے تعلق رکھتا ہے، اللہ نے جب یہ حسین وجمیل اور آراستہ وپیراستہ دنیا بنائی تو پہلے اس کو جنوں سے بسایا، مگر انہوں نے خدا کے سامنے جھکنے کے بجائے سرکشی کا ثبوت دیا اور تکبر کی راہ اختیار کی، اس لئے خدا کے حکم سے جنوں کو ازراہِ سرزنش پہاڑوں اور جنگلوں میں قیام کا حکم دیا گیا، انہیں میں ابلیس تھا، یہ بظاہر اپنی قوم سے جداگانہ مزاج رکھتا تھا، مطیع وفرماں بردار اور عبادت گزار، اللہ تعالیٰ گو اس کی باطنی کیفیت سے واقف تھے؛ لیکن ظاہری حالات کی رعایت سے اس کا درجہ بلند کیا گیا اور اسے عالم بالا میں جگہ دی گئی، اب یہ فرشتوں کا مصاحب تھا اور مقربین بارگاہِ الٰہی کے ساتھ رہتا تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے آب وخاک کی اس دنیا میں نئی بستی بسانے کی غرض سے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا، جہاں مٹی کو آپ کا مادۂ تخلیق بنایا، وہیں علم وتحقیق کی صلاحیت حضرت انسان کی سرشت میں داخل فرمائی، پھر خالق کائنات کی طرف سے انسان کی عظمت اس طور ظاہر کی گئی کہ قدسیانِ عالم بالا کو حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سجدہ ریز ہونے کا حکم فرمایا گیا، یہ حکم فرشتوں کو بھی ہوا اور شیطان کو بھی، فرشتے تو فوراً ہی سربسجود ہوگئے؛ لیکن ابلیس کی ''انا'' (جو اب تک بہ تکلف دبی ہوئی تھی) نے اب انگڑائی لی، اس نے آدم علیہ السلام کی طرف سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور کبر پر اتر آیا، پھر جب اللہ کی طرف سے دھتکارا گیا اور زمین پر اس کا اخراج عمل میں آیا، جب بھی اسے کوئی پشیمانی نہیں ہوئی اور کبر وعلم کے احساس سے وہ اپنے آپ کو فارغ نہیں کر پایا؛ بلکہ ایک حد تک اس

نے باری تعالیٰ کو قصور وار قرار دینے کی جسارت کی کہ آدم تخلیقی اعتبار سے اس سے کم تر ہے؛ اس لئے اس کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز کرنا، اس کی تحقیر واہانت اور گویا اس کے ساتھ ناانصافی ہے، اس نے یہ نہ سمجھا کہ رب کائنات ہی تمام مخلوقات کا مالک ہے اور وہ جس کے لئے جو درجہ ومقام متعین کرے، وہی اس کا صحیح اور اصل مقام ہے۔ یہ ایک کردار ہے جس میں کبر ہے، اپنی ''انا'' کی پرستاری ہے، اعترافِ حقیقت سے پہلو تہی اور خسران ومحرومی کے اسباب کو اپنے بجائے دوسروں میں تلاش کرنے کی کوشش ہے۔

دوسرا کردار حضرت آدم علیہ السلام کا ہے، حضرت آدم علیہ السلام اس اعزاز واکرام کے بعد جنت میں رکھے گئے، جنت صرف راحتوں اور نعمتوں کی جگہ ہے، جہاں نہ غمِ امروز ہے اور نہ فکرِ فردا؛ لیکن انسان ''اُنس'' سے ماخوذ ہے؛ اس لئے وہ کسی ''انیس'' کے بغیر ہمیشہ بے سکون ہی رہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک ''اُنسی'' بھی عطا فرمایا اور آپ علیہ السلام ہی سے آپ کے جوڑے حضرت حوا علیہا السلام کی تخلیق فرمائی، اب اس وسیع وعریض جنت میں اس جوڑے کو سب کچھ میسر تھا، وہ سبھی جو سوچا جائے اور وہ بھی جو تصور سے بالا تر ہو؛ البتہ ایک پھل کھانے کی ممانعت تھی، شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہو چکا تھا، وہ گو آسمان سے نکالا گیا تھا، مگر دامِ وسوسہ اب بھی آسمان؛ بلکہ جنت تک پھینک سکتا تھا، آخر اس بھولے بھالے انسانی جوڑے نے بھول کی اور وسوسہ شیطانی کا شکار ہو کر اس شجر ممنوعہ سے کھالیا، پھر کیا تھا؟ پہلے لباسِ جنت اُترا اور پھر ''بڑے بے آبرو ہو کر تری جنت سے ہم نکلے!'' کے مصداق حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام زمین پر اُتارے گئے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا نزول ہندوستان ہی کے جنوبی علاقہ یا سری لنکا میں ہوا تھا، حدیث میں آیا کہ حضرت آدم علیہ السلام تو اتنا روئے، لجائے، گڑگڑائے، خدا کے سامنے جھکے اور بچھے، ہاتھ پھیلایا اور دستِ عفو خواہی دراز کیا کہ شاید ہی کسی اور نے کیا ہو، یہ بھی عرض کر سکتے تھے کہ اس میں میرا کیا قصور، یہ تو سب شیطان کی وسوسہ اندازی کا نتیجہ ہے؛ لیکن حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان بھی تھے اور پہلے پیغمبر بھی، پیغمبر سے بڑھ کر نہ کوئی خدا شناس ہو سکتا ہے اور نہ خدا کا مرتبہ شناس، حضرت آدم علیہ السلام نے دوسروں کے بجائے اپنے آپ میں اللہ تعالیٰ کی ناخوشنودی کی وجہ کو تلاش کیا اور نہایت فروتنی سے عرض گزار ہوئے:

''اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے آپ پرخود ہی بڑا ظلم کیا ہے، اگر آپ ہمیں معاف نہ فرمادیں اور رحم وکرم کا معاملہ نہ فرمائیں تو ہم بے شک سخت نقصان اٹھانے والے ہوں گے'' (الأعراف:۲۳)

غور کیجئے! اس دُعاء میں کس قدر عجز وانکسار اور اقرار واعتراف ہے! سراپا اعتراف واقرار، نہ ایک حرفِ کبر، نہ کوئی کلمۂ پندار!!

یہ دونوں کردار صرف حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کے ساتھ مخصوص نہیں، دنیا میں ہر انسان ان دو میں سے ایک کردار ادا کرتا ہے، جس شخص میں حقیقی آدمیت جتنی زیادہ ہوگی وہ حقیقتوں کے اعتراف میں اسی قدر وسیع الظرف ہوگا، عجز وفروتنی اس کے ایک ایک عمل سے نمایاں ہوگی، اس کے بول بھی انکسار کا مظہر ہوں گے، اس کی چال بھی شرافت اور بندگی کی شہادت دے گی، وہ دوسروں کے بجائے اپنے آپ میں غلطی کو تلاش کرنے کا عادی ہوگا، وہ اپنی غلطیوں کی تاویل وتوجیہ کے بجائے اپنے آپ میں غلطی کو تلاش کرنے کا داعی ہوگا، وہ اپنی غلطیوں کی تاویل وتوجیہ کے بجائے سیدھے سادے طریقہ پر اعتراف کا مزاج رکھے گا، وہ اپنی خطاؤں پر نادم اور پشیماں ہوتا جائے گا، خطائیں اور لغزشیں اس کو فوراً جھکا دیں گی، خدا کے سامنے بھی اور خلق خدا کے سامنے بھی، جس شخص میں آدمیت کا عنصر جتنا کم ہوگا اور وہ شیطان کے مزاج سے جس قدر قریب ہوگا، اس میں ''انا'' کا جذبہ اتنا ہی زیادہ ہوگا، اسے اپنی غلطیوں کے اعتراف اور زیادتیوں کے اقرار کا حوصلہ نہ ہوگا، وہ ہمیشہ کسی واقعہ میں ناکامی کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دے گا، اسے لوگوں کے سامنے جھکنے میں اور حق اور حقیقت کا اعتراف کرنے میں عار ہوگی، اُصولوں کا پابند رہنے میں اسے ہتک محسوس ہوگی، اس کی رفتار وگفتار سے ظاہر ہوگا کہ وہ اپنے تئیں بڑے ہونے کا احساس رکھتا ہے اور دوسروں کو حقیر جانتا ہے۔

اعتراف اور تواضع سے آدمی کی اصلاح بھی ہوتی ہے اور وہ خدا اور خلق خدا دونوں کی نگاہ میں محبوب بن جاتا ہے، اور انکار وکبر کی وجہ سے کبھی اس کی شخصیت کی اصلاح نہیں ہوتی، خدا بھی اس سے ناراض ہوتا ہے، اور گو خلق خدا وقتی طور پر کسی مجبوری کی وجہ سے زبان نہ کھولے؛ لیکن وہ اس کی نگاہ میں مغضوب ہی ہوتا ہے، ہر شخص ان دو کردار میں سے ایک سے قریب ہے، آیئے! ہم اپنا

محاسبہ کریں کہ ہمارا رویہ حضرت آدم علیہ السلام سے کتنی مطابقت رکھتا ہے اور اگر ہم اپنے جدامجد حضرت آدم علیہ السلام کے اُسوہ سے دور ہیں تو کیا ہم اپنی اصلاح کے لئے تیار ہیں؟؟

۲۶/ستمبر ۲۰۰۸ء

دعوتِ دین، مسلمانوں کی ایک اہم ذمہ داری

رابطہ عالم اسلامی کا پیغام

فکری، دعوتی اور اصلاحی پہلو سے عالم اسلام میں جو ادارے کام کررہے ہیں، ان میں ایک ممتاز ؛ بلکہ سرفہرست نام رابطہ عالم اسلامی (World Muslim leage) کا ہے، یہ تنظیم پورے عالم اسلام کی نمائندگی کرتی ہے ؛ لیکن اس کا مرکزی دفتر مکہ مکرمہ میں واقع ہے، اور اس نسبت سے اس کی خدمات کو جاری رکھنے اور وسعت دینے میں سعودی عرب بنیادی کردار ادا کرتا ہے، رابطہ مختلف مناسبتوں سے اپنی کانفرنسیں منعقد کرتا رہتا ہے، رابطہ کا ایک اہم ذیلی ادارہ ''المجمع الفقہی الإ سلامی'' (اسلامک فقہ اکیڈمی) ہے، جس کے تحت نئے مسائل پر سالانہ سمینار منعقد کئے جاتے ہیں، جو عالمی سطح کا ہوتا ہے، رابطہ کے فکری اور دعوتی پروگراموں میں ایک مکہ کانفرنس (مؤتمر مکۃ المکرّمۃ) کا سلسلہ بھی ہے، جس کا ہر سال تو اہتمام نہیں ہوتا ؛ لیکن وقفہ وقفہ سے اہم موضوعات پر یہ کانفرنس منعقد ہوتی رہتی ہے، پہلی مکہ کانفرنس ۱۹۴۳ء میں، پہلے سعودی بادشاہ شاہ عبدالعزیز آل سعود کی دعوت پر منعقد ہوئی تھی، ذوالحجہ ۱۴۲۹ھ میں نویں مکہ کانفرنس منعقد ہوئی، جس کا موضوع تھا ''غیر اسلامی ممالک میں اسلام کا تعارف، حال اور مستقبل''۔

اس حقیر کو بھی اس کانفرنس میں مقالہ لکھنے اور پیش کرنے کی دعوت موصول ہوئی اور ''تعارف اسلام کی اہمیت اور دعوت دین کی ذمہ داری'' کا عنوان دیا گیا، ۳ تا ۵/ ذوالحجہ کانفرنس کی تاریخ تھی اور اس کے بعد میزبانوں کی طرف سے حج کا انتظام تھا؛ اس لئے حج کی سعادت، مقامات مقدسہ کی زیارت اور سیمنار کے موضوع کی اہمیت کے تحت بلا تردد دعوت پر لبیک کہا گیا، اور یکم دسمبر سہ پہر کو میں جدہ پہونچ گیا، رات کو جدہ میں قیام کرنے کی وجہ سے افتتاحی اجلاس میں شرکت سے محروم رہا، شاہ خالد الفیصل گورنر مکہ مکرمہ نے اجلاس کا افتتاح کیا اور شیخ عبدالعزیز آل شیخ مفتی عام

سعودی عرب کا خصوصی خطاب ہوا، اگلے دن ۲ دسمبر کو بعد نماز مغرب کانفرنس کی پہلی نشست ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف سابق سکریٹری جنرل رابطہ وسابق صدر مجلس شوری کی صدارت میں منعقد ہوئی، اس میں پہلا مقالہ اسی حقیر کا تھا، اس کے علاوہ شیخ عبدالمجید عمری (وزارت شئون اسلامیہ واوقاف) کا مقالہ سعودی عرب کی دعوتی کوششوں پر، ڈاکٹر عمر دیب محمد محمود (سابق ڈین جامعہ ازہر) کا حکومت مصر کی دعوتی کوششوں پر اور ڈاکٹر یحی بن ابراہیم یحی (جنرل سکریٹری شعبہ دعوت رابطہ) کا مقالہ رابطہ عالم اسلامی کی خدمات پر پیش ہوا۔

اس حقیر کے مقالہ کا عنوان ''دعوت دین کی اہمیت اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں'' تھا، بحمداللہ ایک عجمی کی اس تحریر کو کافی سراہا گیا، صدر اجلاس نے بلند الفاظ میں اس کا ذکر کیا، شیخ عبدالمجید نے خاص طور پر اپنی جگہ سے اٹھ کر مبارکباد دی، موجودہ سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی حفظہ اللہ نے بھی بڑی حوصلہ افزائی فرمائی، بعض حضرات خاص کر ایک ترک نمائندہ اور بغداد سے آئے ہوئے ایک فاضل نے بعض سوالات اٹھائے، اور میں نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی، میری اس تحریر کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمان اقلیتوں کے لئے بحیثیت مجموعی تین راستے ہوسکتے ہیں: جہاد، ہجرت اور دعوت —— ان میں سے جہاد اور ہجرت کے لئے جو شرطیں ہیں، وہ اس وقت دنیا کے جمہوری ممالک میں نہیں پائی جاتی ہیں؛ اس لئے ان کے لئے اسلامی اصولوں کے مطابق ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دعوت، نیز یہ مجبوری میں اختیار کئے جانے والا راستہ نہیں ہے؛ بلکہ یہی اصل ہدف اور اس امت کا مقصد وجود ہے، میں نے اس کے ساتھ دو اور باتوں پر بھی توجہ دلائی، ایک یہ کہ اصل دعوت وہ ہے، جس میں غیر مسلموں سے خطاب ہو، قرآن میں انبیاء اور ان کی اقوام کے جو واقعات مذکور ہیں، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نوے فیصد سے بھی زیادہ دعوتی کوششیں غیر مسلموں میں ہوئیں، خود رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا رخ بھی نبوت کے بعد سے اخیر وقت تک زیادہ تر غیر مسلموں کی طرف رہا؛ اس لئے مسلمانوں میں اصلاحی کام کرکے یہ سمجھنا کہ ہم اپنے دعوتی فریضہ سے سبکدوش ہو چکے ہیں، غلط فہمی ہے، —— دوسری بات —— جس کی طرف توجہ دلائی گئی —— یہ تھی کہ دعوت ایمانیات اور اصول دین کی ہونی چاہئے، جن پر رسول اللہ ﷺ بیعت لیا کرتے تھے، فروعی اور اختلافی مسائل کو موضوع بحث بنانا، ان پر مناظرہ کرنا

اوراس سلسلہ میں ایک دوسرے کی تغلیط کرنا کارِفساد ہے، اوراس کو دعوت دین سمجھنا کھلا ہوا مغالطہ ہے۔

۳/ دسمبر کو صبح میں کانفرنس کی دوسری نشست ہوئی، جس میں اسلام کے تعارف اور دعوت میں درپیش رکاوٹوں اور چیلنجز کو موضوع بنایا گیا، اس میں ''اسلام کے خلاف ذرائع ابلاغ کے طرز عمل'' پرڈاکٹر ماجد عشقی نے بڑا اچھا اور تجزیاتی مقالہ پیش کیا، ان کے علاوہ ڈاکٹر جعفر عبدالسلام اور شیخ محمد اسماعیل انصاری (کویت) نے بھی اپنے مقالات پیش کئے، تیسری نشست آج بعد مغرب منعقد ہوئی، جس کا موضوع تھا ''دعوت اسلام کا مستقبل'' اس نشست میں ڈاکٹر عادل شدّی، سید جمال شطی (کویت) اور میرے کمرہ کے رفیق شیخ شکیب مخلوف (صدر یورپین اسلامک آرگنائزیشنس، سوئڈن) کے مقالات تھے، ان میں کویت کے نمائندہ نے غیر مسلموں کے ساتھ مثبت تعلقات اور دعوت دین کے لئے اس کی اہمیت پر اچھی وضاحت کی۔

اس نشست کے ختم ہوتے ہی اختتامی نشست ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی حفظہ اللہ (سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی) کی صدارت میں منعقد ہوئی، جس میں ڈاکٹر احمد بن نافع مورعی نے کانفرنس کا اعلامیہ اور تجاویز پیش کیں، ان تجاویز میں مسلم ملکوں سے خواہش کی گئی ہے کہ وہ دعوت دین کو اپنے خارجہ تعلقات کا ایک اہم جزو بنائیں، مسلم تنظیموں سے کہا گیا ہے کہ خدمت خلق کے کاموں کی طرف ان کی خصوصی توجہ ہونی چاہئے اور ان خدمات کو اسلام کے تعارف و دعوت کے لئے استعمال کیا جانا چاہئے، یہ بھی کہا گیا کہ عالمی زبانوں — انگریزی، فرنچ، اسپانش اور چینی زبان وغیرہ — میں دعوت اسلام کے ٹیلی ویژن چینل شروع کئے جائیں، نیز دعوتی تربیت کے لئے ایک خصوصی اکیڈمی کا قیام بھی عمل میں لایا جائے، مسلم ملکوں کو توجہ دلائی گئی کہ وہ مغربی ممالک سے ایسے قوانین کا مطالبہ کریں، جو اسلام کی بے احترامی اور اس کی غلط تصویر کشی کو روک سکیں، نیز اسلام کی صورت مسخ کرنے والی نصابی کتابوں کی متبادل کتابیں بھی تیار کی جائیں، اس اعلامیہ میں مسلمان اقلیتوں کو خاص طور پر اس جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ اپنے ہم وطن غیر مسلم بھائیوں سے بہتر تعلقات کو فروغ دیں؛ تاکہ دعوت اسلام کے لئے بہتر مواقع پیدا ہو سکیں، اور اس طرح کانفرنس اختتام کو پہونچی۔

شرکاءکانفرنس کے لئے پروگرام کا سب سے بڑا تحفہ ’’حج بیت اللہ‘‘ کی سعادت مہیا کرنا تھا، جس میں قدم قدم پر حاجیوں کی سہولت کا لحاظ رکھا گیا؛ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سفر حج کی مشقتوں سے لطف اندوز ہونے کا ذرا بھی موقع نہیں ملا، ان ہی ایام حج میں مکہ ریڈیو کے اردو پرگرام نے اس حقیر کا ایک تفصیلی انٹرویو بھی نشر کیا، جس میں ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور نمائندہ مسلم تنظیموں کے بارے میں بہت سے سوالات کئے گئے تھے، حج کے دوران دو قابل ذکر واقعات یہ پیش آئے کہ ۸/ دسمبر کو منتخب مدعوئین کے اعزاز میں ڈاکٹر ترکی کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا، غالبًا ۱۴، ۱۵ شرکاء رہے ہوں گے، اس میں فلسطین کے نمائندہ بھی موجود تھے، جب بات چلی تو ایک مردمؤمن ڈاکٹر عبدالستار نے واضح طور پر کہا کہ فلسطینیوں نے اس مسئلہ کو ایک اسلامی مسئلہ کی حیثیت سے پیش کرنے کے بجائے عرب قومی مسئلہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے، جو بنیادی غلطی ہے اور یہ اللہ کی نصرت سے محرومی کا سبب ہے، انہوں نے اپنا تجربہ نقل کیا کہ جب یاسر عرفات مرحوم، رابطہ عالم اسلامی سے مالی اعانت کے لئے آئے تو میں نے ان سے کہا کہ کیا وہ اعلان کر سکتے ہیں کہ فلسطین کا مسئلہ ایک اسلامی مسئلہ ہے؟ انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں ایسا اعلان کرنے کے موقف میں نہیں ہوں، ڈاکٹر ترکی نے بھی اس کی تائید کی، اس موقعہ پر مصر کے نمائندہ ڈاکٹر حامد علی حسان نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ عربوں میں بھیجے گئے اور عربی نسل سے ان کا تعلق تھا؛ اس لئے اسلام سے تعلق پر تو ہمیں فخر ہے ہی، لیکن اگر عرب ہونے کی حیثیت سے فخر ہو تو یہ بھی کوئی بے جا بات نہیں، ڈاکٹر عبدالستار نے اس کے جواب میں کہا کہ رسول اللہ ﷺ ’رسول اسلام‘ بنا کر بھیجے گئے تھے، نہ کہ ’’رسول عربیت‘‘، بہر حال ان کی ایمانی حمیت کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، میں نے نکلتے ہوئے انہیں مبارکباد دی، انہوں نے جواب میں کہا کہ یہ تو وہ کم سے کم تعلق ہے، جو ہر مسلمان کے لئے اپنے دین کی نسبت سے رکھنا واجب ہے۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ ۱۲ ذوالحجہ کو منیٰ کے قصر شاہی میں بادشاہ کی طرف سے ہم لوگ مدعو کئے گئے، رابطہ کے مہمانوں میں سے ۸، ۱۰/ کا انتخاب ہوا، جن میں یہ حقیر اور ڈاکٹر شکیب مخلوف بھی تھے، اس کے علاوہ وزارت حج اور مختلف وزارتوں کے منتخب مہمان بھی مدعو تھے، اس اجلاس میں خادم حرمین شریفین ملک عبداللہ کے علاوہ سوڈان اور ایران کے صدر، یمن کے ایک وزیر، ڈاکٹر ترکی

اورخود سعودی حکومت کے مختلف وزراء اور ذمہ داران موجود تھے ، خادم حرمین شریفین نے مختصر خطاب کیا ، جو پہلے سے لکھا ، بلکہ چھپا ہوا حاضرین کو دے دیا گیا تھا ، اس خطاب میں انہوں نے بین مذہبی مذاکرات سے متعلق اپنی مہم کا ذکر کرتے ہوئے خود مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر میں مذاکرات پر زور دیا اور کہا کہ آئندہ وہ اس ایجنڈہ کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں ، نشست کے اختتام پر مہمانوں کے لئے ظہرانہ کا شایان شان انتظام تھا ، اتفاق سے مجھے جس میز پر بٹھایا گیا ، اسی پر شاہ فیصل شہید کے صاحبزادے اور مکہ کے گورنر خالد الفیصل بھی تھے ، مجھے ان سے چند منٹ گفتگو کا بھی موقع ملا اور موجودہ حالات میں اسلام اور مسلمانوں کی نسبت سے محبت و احترام کے ساتھ کسی مسلمان حکمراں کو جو بات کہی جاسکتی ہے ، میں نے ان سے گوش گذار کرنے کی کوشش کی ، انہوں نے توجہ سے سنا اور کچھ دیر تفکر کے بعد ایک دو جملوں میں اپنے حالات کے لحاظ سے جواب دیا۔

ان سطور کا مقصد صرف کانفرنس کی داستان سرائی نہیں ہے ؛ بلکہ اصل مقصد اس کے پیغام کو قارئین تک پہونچانا ہے کہ اس وقت مسلمانوں پر سب سے بڑی ذمہ داری اسلام کی دعوت وتبلیغ ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ خدمت خلق اور غیر مسلموں کی غلط فہمیوں کے ازالہ کے ذریعہ مثبت اور معاون فضا پیدا کی جائے ، اس طرح ہم اُس فریضہ سے عہدہ برآ ہوسکتے ہیں ، جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کا انتخاب فرمایا ہے۔

۳۰/جنوری ۲۰۰۹ء

گرمائی تعطیل اور بچوں کی تعلیم وتربیت

اگر کسی آبادی میں سیلاب آجائے تو آبادی کا ہر شخص فکرمند اور بےقرار نظر آتا ہے، کبھی کبھی یہ تباہی و بربادی پورے ملک کے لوگوں کو اس کے نقصانات کے تدارک کے لئے بےچین کر دیتی ہے، خدانخواستہ کسی شہر میں زلزلہ آگیا تو ہلاک، زخمی اور بےگھر ہونے والوں کے لئے پوری دنیا اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور ریلیف کی تقسیم عمل میں آتی ہے، اور اگر کہیں تباہ کن طوفان آگیا تو پوری دنیا کے ذرائع ابلاغ جاگ اٹھتے ہیں اور اسی کی داستانیں نوکِ زبان ہوتی ہیں، سونامی کی ظالم موجوں نے کسی خطہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو تو برسہابرس وہ اخبارات ورسائل کا موضوع بنے رہتے ہیں؛ لیکن ایک سیلاب ان سیلابوں سے بڑھ کر، ایک زلزلہ ان زلزلوں سے زیادہ ہیبت ناک، ایک طوفان ہواؤں کے طوفان سے زیادہ خطرناک اور ایک سونامی سمندر کی سرکش موجوں سے پیدا ہونے والی سونامیوں سے بھی زیادہ جان لیوا ہے؛ لیکن انسان ان سے غافل، بےپروا اور ان کے بارے میں تساہل کا شکار ہے۔

یہ وہ سیلاب ہے، جو درختوں اور کھیتوں کو بہا نہیں لے جاتا؛ بلکہ اخلاق کو بہا لے جاتا ہے، یہ وہ زلزلہ ہے، جس میں زمین کے اندر چھپی ہوئی چٹانیں متزلزل نہیں ہوتیں؛ بلکہ انسان کے سینوں میں موجود دلوں کی دنیا تباہ و برباد ہو جاتی ہے، یہ وہ طوفان نہیں، جو درختوں کو اٹھا کر پھینک دے اور گھروں کو تہ و بالا کر دے؛ بلکہ یہ وہ طوفان ہے، جو ایمان کے شجر طوبی کو اکھاڑ پھینکتا ہے، یہ وہ سونامی نہیں، جس سے آبادیاں ویران ہو جاتی ہیں؛ بلکہ یہ وہ سونامی ہے، جس سے اخلاق و کردار کی دنیا ویران ہو جاتی ہے، یہ ہے برائیوں کا سیلاب، یہ ہے اخلاق و کردار کی تباہی اور یہ ہے ایمان و یقین کی غارت گری، یہ وہ سیلاب ہے، جو دبے پاؤں ہمارے معاشرہ میں داخل ہو رہا ہے، اس کو روکنے کی کوشش نہیں کی جاتی؛ بلکہ اکثر اوقات اس کا استقبال کیا جاتا ہے، یہ انسانی آبادیوں میں اس

طرح داخل ہوتا ہے کہ نہ ہواؤں کا شور، نہ پانی کا زور، نہ زلزلہ کی گھڑ گھڑاہٹ اور نہ سونامی کی دل دہلا دینے والی متلاطم موجوں کی اکھاڑ و پچھاڑ، سارا ماحول معتدل، خطرہ کے احساس سے عاری اور ان کے سد باب کی فکر سے خالی؛ لیکن اس کی تباہیاں مادی اور ظاہری تباہیوں سے کہیں بڑھ کر ہیں، وہ آسمان کی بلندی پر پہنچی ہوئی قوموں کو ذلت و رسوائی کے گہرے غار میں پہنچا دیتی ہے اور بعض اوقات انسان کے مزاج کو اس طرح بدل دیتی ہیں کہ کردار و عمل کے اعتبار سے جانور بھی ان سے بہتر لگتے ہیں۔

اس وقت ہماری نئی نسل، اسی اَن دیکھے اور غیر محسوس حملہ سے دوچار ہے، انسان کی اصلاح اور اس کے بگاڑ، نیز شخصیت کی تعمیر و تخریب میں تین چیزوں کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے، ذرائع ابلاغ، ماحول اور تعلیم —— ذرائع ابلاغ پر اس وقت عملاً مغرب کا قبضہ ہے، مغربی تہذیب ایسے نظام زندگی سے عبارت ہے، جس میں کسی اخلاقی رکاوٹ کو قبول نہیں کیا جائے اور انسان کے لئے اس کی ہوس کو پوری کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے؛ چنانچہ اس وقت ٹی وی، انٹرنیٹ اور اخبارات وجرائد —— جو ابلاغ کے اہم اور مؤثر ذرائع ہیں —— کی صورت حال ہمارے سامنے ہے، ٹی وی میں مخرب اخلاق پروگرام کا غلبہ ہے اور کوئی شریف انسان اپنے بزرگ یا عزیز کے ساتھ ٹی وی کے سامنے بیٹھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا، کھیل اور خبروں کا حالاں کہ نیم عریاں لباس سے کوئی تعلق نہیں ؛لیکن مغرب کی بے لباس تہذیب نے ان پروگراموں کو بھی عریانیت اور بے حیائی کے مناظر سے آلودہ کر دیا ہے، خواتین کو ٹی وی اسکرین پر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ گویا لباس ان کے لئے بہت بڑا بوجھ ہے، انٹرنیٹ میں —— سنا گیا ہے —— فحاشی اپنی آخری حدوں تک پہنچ چکی ہے، ترقی یافتہ ممالک انسانی جان کو تلف کرنے اور آبادیوں کو ویران کرنے کے لئے تو دن ورات کوشاں ہیں اور اس کے لئے سائنسی تحقیق شب و روز جاری ہے ؛ لیکن انٹرنیٹ کے بے حیائی پر مبنی پروگراموں کو روکا جائے ، اس کی کوئی تدبیر نہیں کی جاتی ؛ کیوں کہ یہ ان شیطانی مقاصد کو پورا کر رہے ہیں، جن کی مغرب تبلیغ کرتا ہے، اخبارات وجرائد میں بھی بے حیائی ایک اہم عنصر بن چکا ہے اور ماضی قریب میں ہندوستان میں بیرونی جرائد ورسائل کو سرمایہ کاری کی بے قید اجازت دے دی گئی ہے، یہ دراصل خطرہ کی گھنٹی اور اس بات کا اعلان ہے کہ جس قسم کی بے ہودہ چیزیں یورپ اور

امریکہ میں شائع ہوا کرتی ہیں، اب ہندوستان میں بھی شائع ہوا کریں گی۔

''ماحول'' کے بنانے اور بگاڑنے میں اس وقت ذرائع ابلاغ کا سب سے زیادہ موثر رول ہے؛ چنانچہ پچھلے دس سالوں میں اس بات کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے ماحول میں اخلاقی اعتبار سے تباہ کن بدلاؤ آیا ہے، مشرقی قدریں اب دقیانوسیت سمجھی جاتی ہیں، گرہست بوڑھی خواتین میں جو حیا باقی ہے، نوخیز اور نوجوان لڑکیوں میں اس کا تصور دشوار ہے، مسلم معاشرہ میں بھی اوڑھنیاں گلوبند بنتی جارہی ہیں، چہرہ چھپانے کی اہمیت ختم ہوتی جارہی ہے، نقاب یا تو استعمال نہیں کیا جاتا ہے، یا ایسے نقاب استعمال کئے جاتے ہیں، جن کا مقصد اپنے آپ کو چھپانا نہیں ہے، نمایاں کرنا ہے، بیوٹی پارلر کی کثرت اور نئے نئے فیشنوں کی بہتات ہے، ''یوم عاشقاں'' اس اہتمام سے منایا جانے لگا کہ گویا یہ بھی کوئی تہوار ہو، یہ وہ ماحول ہے، جس نے نوجوان نسل کو اخلاقی بندھنوں سے آزاد؛ بلکہ ان کا باغی بنادیا ہے اور اس کی مخالفت کرنے والوں کو مُلّا اور ''مسجد کا لوٹا'' کہا جاتا ہے۔

''تعلیم'' انسان کے دماغ اور اس کی فکر کو متاثر کرنے والا طاقت ور ہتھیار ہے، ماحول سے تو عام لوگ متاثر ہوتے ہیں؛ لیکن تعلیم کی پڑھے لکھے لوگوں کے ذہن پر حکمرانی ہوتی ہے، ایک زمانہ میں تعلیمی مواد میں اخلاقیات بھی شامل ہوا کرتی تھیں، مسلمانوں کے زیر انتظام اداروں میں اسلامیات کی تعلیم بھی ہوا کرتی تھی، لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کے بجائے جداگانہ تعلیم کو ترجیح دی جاتی تھی، اساتذہ کے لئے اچھے اخلاق کے حامل ہونے کو ضروری خیال کیا جاتا تھا، مختلف مذاہب کی عبرت آمیز باتیں اور کہانیاں بھی نصاب میں شامل ہوتی تھیں، اس سے طلبہ وطالبات میں مثبت سوچ جنم لیتی تھی، اگر بتقاضۂ عمر اخلاقی ذمہ داریوں کی طرف سے غفلت بھی ہوتو بہر حال ان کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوتی تھی کہ حیا، تواضع، دوسروں کی جان ومال اور عزت وناموس کی حفاظت، بزرگوں کا احترام اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت اعلیٰ قدریں ہیں، اور یہی انسان کی شرافت کے لئے معیار ہیں؛ لیکن اب ہمارے تعلیمی نظام میں اخلاقیات کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی، اسکولوں میں جنسیات کی تعلیم نے رہی سہی اخلاقی قدروں کو بھی تباہ کردیا ہے، جداگانہ تعلیمی نظام کے بجائے مخلوط تعلیمی نظام کا نہ صرف غلبہ ہوگیا؛ بلکہ اس کو قابل فخر شمار کیا جانے لگا، اسکولوں کے

اشتہارات میں بھی خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا جاتا ہے، افسوس کہ مسلم انتظامیہ کے تحت چلنے والی اکثر درسگاہیں بھی اسی طرز پر چل رہی ہیں، ان کے یہاں بھی لڑکیوں کے یونیفارم میں ٹانگوں کے کھلا رکھنے، سر کے بے پردہ ہونے اور بازؤں کے نظر آنے کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے، کلچرل پروگرام کے نام پر ڈانس سکھائے جاتے ہیں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے ڈانس پروگرام رکھے جاتے ہیں۔

غرض کہ انسان کے افکار و اعمال پر اثر انداز ہونے والے یہ تین مؤثر ترین ذرائع —— ذرائع ابلاغ، ماحول، تعلیم —— اس وقت برائی، بے حیائی اور مادہ پرستی کے نقیب بنے ہوئے ہیں اور بحیثیت مجموعی ان کی وجہ سے نئی نسل اخلاقی تباہی و بربادی کے آخری کنارے پر کھڑی ہوئی ہے، ان حالات میں ہر انسان اور خصوصاً ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کے بارے میں فکرمند ہو اور انہیں اس تباہی سے بچانے کی کوشش کرے، صورت حال یہ ہے کہ بے دینوں کا تو کیا پوچھنا؟ جو لوگ بظاہر دین دار ہیں، ان کے بچے بھی مغرب کی حیا سوز قدروں کے دل دادہ ہیں اور دین و اخلاق کو ایک بوجھ سمجھنے لگے ہیں، یہ صورت حال فرقہ وارانہ فسادات، معاشی پسماندگی اور تعلیمی پچھڑاپن سے بھی زیادہ قابل توجہ اور قابل فکر ہے، تعلیم گاہوں کا نظام کچھ ایسا ہے کہ بہت چھوٹی عمر میں بچوں کو اسکول پہنچا دیا جاتا ہے، اسکولوں کے تعلیمی اوقات اور کبھی لوگوں کے مقام رہائش سے ان کا فاصلہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ انہیں صبح میں جلد سے جلد گھر سے روانہ ہو جانا پڑتا ہے، پھر نصاب اتنا بھاری بھرکم ہے کہ اکثر بچوں کو ٹیوشن بھی کرنا پڑتا ہے؛ چنانچہ گھر واپس ہونے کے بعد ٹیوشن پڑھتے ہیں، پھر ہوم ورک اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد وہ اس میں لگ جاتے ہیں اور بعض اوقات تو پڑھنے لکھنے کے درمیان ہی چھوٹے بچوں کو نیند آجاتی ہے، یہ وہ صورت حال ہے، جس میں بچوں سے ان کا بچپن چھین لیا گیا ہے، انہیں جوانوں سے بھی بڑھ کر کام کرنا ہوتا ہے، اس کا اثر صحت پر تو پڑتا ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ ان کے پاس روزانہ دینی تعلیم کے لئے کوئی وقت باقی نہیں رہتا، ہفتہ میں ایک دن اتوار کو چھٹی ہوئی تو ماں باپ اور بچے دونوں اپنا حق سمجھتے ہیں کہ اس دن کو ایک ساتھ تفریح میں گذارا جائے، اس طرح روزمرہ کے معمول میں دینی و اخلاقی تعلیم کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہ جاتی۔

موسم گرما میں اسکولوں اور کالجوں میں جو تعطیل دی جاتی ہے، یہی ایک ایسا موقع ہے، جسے ہم اپنے نونہالوں کی دینی تعلیم وتربیت کے لئے استعمال کر سکتے ہیں، یہ تعطیل کم وبیش پچاس دن کی ہوتی ہے، اگر اس میں سے چالیس دن بھی ہم بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے نکالیں اور روزانہ چھ گھنٹے ان کو تعلیم دلائیں تو دوسو چالیس گھنٹے ہوتے ہیں، عام طور پر تعلیم گاہوں میں سال میں دوسو دنوں تعلیم ہوتی ہے تو گویا سال کے لحاظ سے روزانہ ایک گھنٹہ سے زیادہ تعلیم کا اوسط ہوا، اگر ان اوقات کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے، تو یہ کم نہیں ہیں، ان اوقات میں بچوں کی استعداد اور ان کی عمر کے لحاظ سے قرآن مجید کا ناظرہ، کچھ سورتوں کا حفظ، ضروری دینی مسائل، سیرت نبوی، اردو پڑھائی ولکھائی، وضوء ونماز کی عملی مشق، جیسے اہم موضوعات سے طلبہ وطالبات کو آشنا کیا جا سکتا ہے، اور چند سالوں میں ان کو معتد بہ تعلیم دی جا سکتی ہے، اس مقصد کے لئے دینی اداروں اور تنظیموں کو گرمائی کلاسس کھولنے چاہئیں اور جو ادارے ان کلاسوں کا نظم کر رہے ہیں، طلبہ وطالبات کو ان سے استفادہ کرنا چاہئے، گھروں میں اچھے اساتذہ کے ذریعہ ٹیوشن پڑھوانا چاہئے، دینی جماعتیں اگر کوئی تعلیمی وتربیتی پروگرام چلاتی ہوں تو ان سے استفادہ کرنا چاہئے، میرے تجربہ میں نوجوان اگر کچھ عرصہ تبلیغی جماعت میں نکل جائیں تو انہیں بڑا دینی نفع پہنچتا ہے، کم وقت میں وہ نماز وغیرہ کے ضروری مسائل سے واقف ہوجاتے ہیں ؛ اس لئے اگر سرپرست حضرات اپنے بچوں کو اس سے وابستہ کریں تو ان شاءاللہ بہت مفید ہوگا، دینی جماعتوں سے نوجوانوں کے وابستہ ہونے کا ایک بڑا نفع یہ ہے کہ ان کو اچھے دوستوں کا حلقہ مل جاتا ہے، اور بری صحبتوں سے حفاظت ہوجاتی ہے، اور نوجوانوں کے لئے اس کی بڑی اہمیت ہے، — بہر حال سرپرستوں کو چاہئے کہ گرمائی تعطیل کی اس مہلت کو اپنے بچوں کی دینی تعلیم وتربیت اور انہیں اخلاق اور بہتر اعمال سے آراستہ کرنے میں استعمال کریں کہ اس سے بڑھ کر ان کے حق میں کوئی اور بھلائی نہیں ہو سکتی۔

۲۴/ اپریل ۲۰۰۹ء

شمع فروزاں

گردوپیش

نیا جال لایا پرانا شکاری

اردو زبان کا ایک محاورہ ہے،''نیا جال لایا پرانا شکاری''یعنی ہوشیار اور چالباز شکاری اپنے جال بدلتا رہتا ہے؛ تاکہ اپنے شکار کو دھوکہ دے سکے اور اپنے دامِ فریب میں پھنسانے میں کامیاب ہو جائے، اسی محاورہ کا مصداق دینی مدارس کے ساتھ حکومت کا موجودہ رویہ ہے، کبھی تو ایوانِ حکومت سے مدارس کے خلاف دہشت گردی کا الزام لگایا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ یہاں دہشت پسند لوگوں کو پناہ فراہم کی جاتی ہے اور کبھی ان کے ساتھ ہمدردی وحسن سلوک کے''نمائشی برتاؤ'' کی کوشش کی جاتی ہے اور ان کے تعاون کی بات کہی جاتی ہے، اس وقت مرکز میں برسرِ اقتدار یو، پی، اے ہے، جو مسلمانوں کی تائید سے تختِ اقتدار پر پہنچی ہے، جس کی سب سے اہم شریک جماعت ''کانگریس'' ہے، کانگریس نے شروع سے اپنے آپ کو ایک سیکولر جماعت کہا ہے، اسی کانگریسی حکومت کے ایک ناکام ونامراد وزیر اعظم نرسمہاراؤ نے مساجد کو حکومت کے زیر اثر لانے کی کوشش کی تھی اور ائمہ کے لئے تنخواہوں کے وعدے کئے تھے، اور ان کی ایما پر ایک غیر معروف امام مسجد (جو عالم کم تھے اور عامل زیادہ) نے حکومت سے ائمہ کو تنخواہ دلانے کی تحریک چلائی تھی، اس تحریک کی پورے ملک کے مسلمانوں نے اور خود علماء وائمہ نے شدید مخالفت کی، جس کے نتیجہ میں یہ تحریک ناکام ہوگئی، اب موجودہ حکومت مسلمانوں کے دوسرے دینی مرکز''مدارس'' کے گرد دام پھیلانے کی کوشش کر رہی ہے۔

پچھلے دنوں وزارتِ تعلیم کی طرف سے'مرکزی مدرسہ بورڈ' قائم کرنے کی بات کہی گئی تھی، سنا ہے کہ اس کے لیے ایک بل بھی مرتب ہو چکا ہے، جسے پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی تیاری ہے، اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے ایک ذمہ دار نے اربابِ مدارس کی میٹنگ بھی طلب کی تھی، جس میں مدرسہ بورڈ کے قیام، اس بورڈ کے واسطے سے مدارس کے تعاون، اور اساتذہ کے لیے مالی

سہولتوں کا ذکر کیا گیا، اس تجویز کو' آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ' اور مسلمانوں کی مختلف تنظیمیں نہایت قوت کے ساتھ رد کرچکی ہیں ، افسوس کہ کچھ ایسے لوگ — جو حقیر سیاسی مفادات اور معمولی سرکاری عہدوں کی طلب میں ملت کے مفادات کو فروخت کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں ،— سرگرم ہوگئے ہیں اور حکومت کے اس ناروا منصوبہ کو کامیاب کرنے کے لئے کوشاں ہیں !

مسلمانوں کو چاہیے کہ اس مسئلہ کو اس کے وسیع تناظر میں دیکھیں ،صورتِ حال یہ ہے کہ سچر کمیشن کی حالیہ رپورٹ کے مطابق ان مدارس میں پڑھنے والے طلباء کی تعداد چار فیصد کے قریب ہے، اس تعداد میں وہ طلبہ اور طالبات بھی شامل ہیں، جو صباحی ، مسائی ، یا ہمہ وقتی مکاتب میں ناظرہ قرآن اور ابتدائی دینیات پڑھتے ہیں ، ان طلباء کی غالب اکثریت عصری تعلیم گاہوں سے متعلق ہوتی ہے، یا وہاں چلی جاتی ہے، اس لیے اگر ان طلباء کا تناسب دیکھا جائے جو باضابطہ دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں تو ان کی تعداد ڈیڑھ دو فیصد سے زیادہ نہیں ہوگی ، پھر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ ابتدائی جماعتوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں میں سے بہت کم طلبہ شعبۂ حفظ تک پہنچتے ہیں، اور ان سے بھی کم بچے شعبۂ عالمیت میں آتے ہیں اور شعبۂ عالمیت کو مکمل کرنے والوں کی تعداد کا تناسب اور بھی کم ہوجاتا ہے، آپ چند مدارس کا جائزہ لے کر دیکھیں، آپ کو وہاں شعبۂ ناظرہ میں طلباء کی تعداد اگر پچاس ملے گی تو بمشکل اس میں دس طلباء شعبۂ حفظ میں پہونچتے ہیں ، اور شعبۂ ناظرہ سے براہِ راست اور شعبۂ حفظ سے بالواسطہ شعبۂ عالمیت میں آنے والوں کی تعداد عام طور پر پانچ سے زیادہ نہیں ہوتی ، پھر یہ پورے پانچ طلبہ عالمیت وفضیلت تک نہیں پہونچ پاتے ، اس میں سے دو تین طالب علم ہی عالمیت یا دورہ تک پہونچ پاتے ہیں ، اسی لیے آپ کو مدارس میں زیرِ تعلیم طلبہ کی تعداد اور ہر سال فارغ ہونے والوں کی تعداد میں کوئی مناسبت نظر نہیں آئے گی ، اس طرح پڑھنے والے مسلمان طلبہ میں سے اگر ڈیڑھ دو فیصد دینی مدارس میں پڑھتے ہیں، تو اس ڈیڑھ دو فیصد کا ڈیڑھ دو فیصد ہی اس تعلیم کو مکمل کرپاتا ہے، جو طلبہ تعلیم مکمل نہیں کرپاتے ہیں، ان میں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد عصری درسگاہوں میں چلی جاتی ہے اور ایک اچھی خاصی تعداد گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے تعلیم چھوڑ دیتی ہے؛ اس لیے اگر مسلمان تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد ڈیڑھ دو فیصد مدرسوں میں جاتی ہے، تو فارغ ہونے والوں کا تناسب شاید ایک

فیصد کا بھی نہ ہو۔

اب یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک ڈیڑھ فیصد مسلمان بچوں کی حکومت کو اتنی فکر ہے؛ لیکن ستانوے اٹھانوے فیصد بچوں کی تعلیم اور روزگار کی اس کو فکر نہیں، اگر حکومت ان بچوں کے لیے ریزرویشن دے، مسلمانوں کے لیے اپنی طرف سے میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج قائم کرے تو اس سے واقعی مسلمانوں کا بھلا ہوگا، اور جب مسلمان روزگار سے لگیں گے، تو ان سے دینی مدارس کا بھی تعاون ہوگا؛ لیکن حکومت کو اس کی کوئی فکر نہیں ہے، کانگریس خود مذہب کی بنیاد پر مسلمانوں کو ریزرویشن دینے کی مخالفت کر رہی ہے، اور اس نے اردو زبان کو روزگار سے جوڑنے کی آج تک کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی ہے، 'مولانا آزاد اردو یونیورسٹی' کی تشکیل پارلیمنٹ کے ذریعہ ہوئی اور یہ ایک سنٹرل یونیورسٹی ہے، اس کے باوجود بعض محکموں میں اس کی سند کو قبول نہیں کیا جاتا ہے، درجۂ چہارم کی ملازمتوں — جس میں کوئی خاص علمی لیاقت مطلوب نہیں ہے — میں بھی مسلمانوں کا تناسب ان کی آبادی کے لحاظ سے بہت ہی کم ہے، اگر حکومت ان امور کی طرف توجہ دیتی تو یقیناً مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچتا، اسی طرح جو سہولتیں چیریٹیبل اداروں کو حکومت کی طرف سے مہیا ہیں، وہ سہولتیں دینی مدارس کو فراہم کی جائیں، مدارس کی اسناد کو یونیورسٹیاں تسلیم کریں، اور ان کو گریجویشن ایم، اے اور پی، ایچ، ڈی کرنے کا موقع دیں، یہ مدارس کا حقیقی تعاون ہوگا۔

یہ کھلا ہوا راز ہے کہ اس خیر خواہی کا سرِ رشتہ دراصل امریکہ اور مغربی طاقتوں سے ملتا ہے، ایک عرصہ تک مدرسوں کے بارے میں لوگ سمجھتے تھے کہ یہ سادہ لوح از کار رفتہ اور آثارِ قدیمہ قسم کے لوگ ہیں، یہ قوتِ فکر سے محروم اور جوشِ عمل سے عاری ہیں، یہ اپنی بے شعوری اور بے استعدادی کی وجہ سے مغرب کے اسلام دشمن ایجنڈے میں حارج نہیں ہو سکتے؛ لیکن ایرانی انقلاب اور اس کے بعد افغانستان میں طالبان کی حکومت نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا کہ یہ بوریہ نشین تخت و تاج پر بیٹھنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں، اگر ایرانی انقلاب نے دنیا کی ایک سپر طاقت امریکہ کو شکست دی تو افغانستان کے مجاہدین نے دوسری سپر طاقت روس کو شکست فاش سے دوچار کیا، ایرانی انقلاب کے بعد مغرب نے اسے ناکام کرنے کے لئے سوجتن کر لیئے؛ لیکن اسے ذرا بھی کامیابی حاصل نہیں ہوسکی اور ایران نے اس دوران میں مذہبی راہ پر گامزن ہونے کے ساتھ ساتھ مادّی ترقی کی منزلیں

بھی کامیابی کے ساتھ طے کی ہیں، اسی طرح افغانستان مدتوں سے افراتفری کا شکار تھا اور لوگ امن و امان سے محروم تھے، طالبان حکومت نے وہاں بے نظیر امن و امان قائم کیا، وہ ترقیاتی کاموں کا بھی آغاز کرنا چاہتے تھے، مگر بہ جبر اس ملک پر قبضہ کرلیا گیا؛ لیکن وہاں لوگوں کے قلوب پر اب بھی طالبان کی حکومت ہے اور امریکہ اور مغرب ان کے جذبۂ سرفروشی کے آگے اپنی تمام تر طاقتوں کے باوجود مجبور ہے، افغانستان کے بعد عراق میں اس وقت جو گروہ مغرب کی غاصب افواج کے ساتھ متصادم ہے، اور جس نے اپنی قوتِ ایمانی کے ذریعہ آتش و فولاد کی قوت کو پانی پانی کر رکھا ہے، وہ وہی لوگ ہیں جو وہاں کے علماء کے زیرِ اثر ہیں، خواہ سنی ہوں یا شیعہ، یہ وہ حقیقت ہے جس نے مغرب پر یہ بات کھول دی ہے کہ ان مدارس کو از کار رفتہ سمجھنا ان کی بہت بڑی بھول تھی ۔

پھر آج پوری دنیا میں مسلمانوں کی نوجوان نسل کی دین سے بڑھتی ہوئی وابستگی اور احیائے اسلام کی عالمگیر کوششیں کن کی رہین منت ہیں؟ براہِ راست یا بالواسطہ انہی مدارس کی، وہ کون سی قوت ہے جو مغرب کے بے لباس معاشرہ میں مسلمان لڑکیوں سے برقعہ پہنواتی ہیں؟ یہ کس طاقت کا کرشمہ ہے کہ عیش و طرب اور رقص و سرود کے ماحول میں سانس لینے والے نوجوان لڑکوں کے چہروں پر ڈاڑھیاں اور سروں پر ٹوپیاں ہیں؟ یہ کس کی دین ہے کہ آج امریکہ، یورپ اور مغرب کے شراب و شباب کے کلچر میں بھی مسلمان نوجوان ان میکدوں اور کلبوں سے گریزاں ہیں؟ یہ کن کوششوں کا نتیجہ ہے کہ گرجے تو ویران ہو رہے ہیں؛ لیکن میخاروں کی بستی میں اگر کوئی مسجد ہے تو وہ خدا کی بندگی سے آباد ہے؟ کلیسا انسان کی ہر ہوس پر مہر جواز لگاتی جا رہی ہے، یہاں تک کہ اس نے ہم جنسوں کے درمیان نکاح کو بھی سندِ جواز دے دیا ہے، یہی حال کم و بیش دوسرے مذہبی پیشواؤں اور رہنماؤں کا بھی ہے؛ لیکن کیا بات ہے کہ مسلمانوں کے دار الافتاء نے ابھی بھی شراب و زنا پر قدغن لگا رکھی ہے، اس نے اس دورِ ''ترقی'' میں بھی عورتوں کو تارِ لباس سے آزاد ہونے کی اجازت نہیں دی ہے، اس کے یہاں آج بھی سود حرام ہے، اس نے ابھی تک زندگی کو مذہب و اخلاق کی حدود سے آزاد ہونے کی اجازت نہیں دی ہے؟ یہ کیا بات ہے کہ مسلمانوں نے اب بھی خدا کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں لٹکا رکھا ہے اور جس طرح مغرب نے خدا کو زندگی کے احکام سے (نعوذ باللہ) بے دخل کر دیا ہے، مسلمان اس کے لیے تیار نہیں ہیں؟

مسلمانوں میں یہ دینی حمیت ظاہر ہے کہ سیاسی قیادتوں نے نہیں پیدا کی ہے، اس کی تبلیغ دانشوروں نے نہیں کی، یہ جذبہ مسلمان حکمرانوں اور فرمانرواں نے بیدار نہیں کیا، یہ پیغام مسلمانوں کو ذرائع ابلاغ سے نہیں ملا، مسلم ماہرین، قانون دانوں، ڈاکٹروں، انجینئروں، صنعت کاروں، اور تاجروں کو نہ اتنی فرصت ہے کہ اس جانب توجہ دیں، نہ ان کے اندر اتنی علمی وفکری بصیرت ہے کہ وہ مسلمانوں کو متاثر کرسکیں، اور نہ امت میں ان کو ایسا اعتماد حاصل ہے کہ لوگ ان کی بات کو قبول کریں، یہ دَین ہے انہیں دینی مدارس کی، دشمن جن کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے خیال میں جن کو نکمّا سمجھتے ہیں اور جن کی خستہ حالی کا مذاق اڑاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں دینی جذبات کا بقاء؛ بلکہ ان کا احیاء مدارس ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، دنیا میں اس وقت جتنی دینی تحریکات چل رہی ہیں، ان کو مدارس ہی سے غذا ملی ہے، تبلیغی جماعت ایک ایسی جماعت ہے، جس کا اس وقت پوری دنیا میں پھیلا ہوا وسیع ترنیٹ ورک مانا جاتا ہے، اس کی بنیاد کس نے رکھی اور اس کی قیادت کن ہاتھوں میں رہی ؟ علماء کے ہاتوں میں رہی، برِّصغیر کی ایک اہم تحریک جماعت اسلامی ہے، جس کے اثرات آج مشرق سے مغرب تک پہونچ چکے ہیں، اس میں بھی مدارس کا خونِ جگر شامل ہے، عالمِ عرب کی سب سے مضبوط، مؤثر اور ہمہ گیر تحریک ''الاخوان المسلمون'' ہے، عرب ممالک عام طور پر جمہوریت سے محروم ہیں اور جن ملکوں میں محدود جمہوریت موجود ہے اور کسی قدر غیر جانبدارانہ انتخاب ہوتا ہے، تو اخوان کو کامیابی نصیب ہوتی ہے، فلسطین میں ''فتح'' کو تو مغرب نے خرید کرلیا ہے، لیکن حماس کی دینی حمیت کو خریدا نہیں جاسکا، یہ وہ تحریکیں ہیں جو علماء سے وابستہ تھیں اور ہیں، مدارس کے اس اثر انگیز کردار کی وجہ سے مغرب لرزہ براندام ہے اور وہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کی دینی بیداری، ایمانی حمیت اور مذہبی شعور کا یہ سرچشمہ بند ہوجائے۔

افسوس کہ عالمِ اسلام اس وقت ایسی بے ضمیری اور بے حمیّتی کا ثبوت دے رہا ہے، کہ شاید ہی ماضی میں اس کی کوئی مثال مل سکے، اسرائیل کی نصابی کتابوں میں مسلمانوں اور عربوں کے خلاف نفرت انگیز؛ بلکہ اہانت آمیز اسباق پڑھائے جاتے ہیں، مغربی ملکوں میں مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے والے کارٹون چھاپے جاتے یں، اور اس کو'' آزادیٔ صحافت'' کا نام دیا جاتا ہے؛ لیکن مسلمان ملکوں سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے نصاب سے آیاتِ جہاد اور یہود

ونصاریٰ سے متعلق تنقیدی موادکونکال دیں، مصر، کویت اور بعض مسلم ملکوں نے ’’آقا‘‘ کے اس حکم کو پورا کر دکھایا ہے، پاکستان اور بعض مسلمان ملکوں میں اس حکم کی تعمیل کے لیے کوششیں جاری ہیں، اور عجب نہیں کہ کچھ دنوں میں خبر آئے کہ وہ بھی ان احکام کی تعمیل سے فارغ ہو چکے ہیں؛ بلکہ اب تو بات یہاں تک آ چکی ہے کہ نمازوں میں یہود و نصاریٰ کے لیے بد دعا بھی نہ کیجئے، مبادا اس سے مغرب ناراض نہ ہو جائے، واقعہ ہے کہ عالمِ اسلام اور بالخصوص عرب حکمرانوں کا حال دیکھ کر بعض بزرگوں کے سا قول پر ایمان تازہ ہوتا ہے کہ جو اللہ سے ڈرتا ہے، دنیا کی ساری چیزیں اس سے ڈرتی ہیں اور جو اللہ سے نہیں ڈرتا، اسے ہر چیز سے ڈرنا پڑتا ہے:

’’من یخاف اللّٰہ یخافہ کلُّ شیء و من لا یخاف اللّٰہ یخاف کلَّ شیء‘‘

مغرب نے محسوس کرلیا ہے کہ مسلم حکومتیں ان کے سامنے سجدہ ریز ہیں، جدید تعلیم یافتہ طبقوں کو وہ اپنے فکر و نظر کی شراب پلا کر پوری طرح مدہوش کر چکے ہیں، صرف اہلِ مدارس ہی کا یہ طبقہ ایسا سخت جان ہے کہ اس کا ضمیر مارے نہیں مرتا، اور ان فقیروں اور خستہ حالوں کے دل و دماغ خریدے نہیں جا سکتے، یہی چیز ہے جس نے مغرب کے سینہ کو مدارس کے خلاف آتشِ غضب کی انگیٹھی بنا دیا ہے، اب اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ایک قطبی نظام کی وجہ سے امریکہ پوری دنیا پر اپنا ایجنڈا مسلّط کر رہا ہے، لوگ خواہی نخواہی اس کو پورا کرنے پر مجبور ہیں، ہندوستان پر بھی اس وقت امریکہ اور مغربی ملکوں کا سخت دباؤ ہے، اور ہندوستان سے نیوکلیئر سہولتوں کی قیمت مختلف صورتوں میں وصول کی جا رہی ہے، یہی اصل میں مجوزہ مدرسہ بورڈ کی شانِ ولادت ہے؛ لیکن حکومت کو محسوس کرنا چاہیے کہ ہندوستان کے حالات مختلف ہیں، یہاں جمہوریت اور مذہبی آزادی ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک مذہبی اور اخلاقی قدروں کا حامل ملک بھی ہے، پڑوسی ملک میں بھلے ہی مغربی طاقتوں کے اکسانے پر دینی مدارس جہادی تحریکوں میں شریک رہے ہوں؛ لیکن ہندستان کے مدارس نے ہمیشہ اپنے آپ کو اشاعتِ علم کے لیے یکسو رکھا ہے، انہیں اپنے ملک سے محبت ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس ملک کا دستور انصاف اور تمام طبقوں کے ساتھ مساوات پر مبنی ہے، اور اس ملک کی اکثریت بھی امن پسند، انسانیت دوست اور روادار ہے اور فرقہ پرستوں کو خود

برادرانِ وطن نے ٹھکرادیا ہے؛اس لیے یہاں مدارس کا کردار ہمیشہ ہی تعمیری اور مثبت رہا ہے۔

دینی نقطۂ نظر سے قطع نظر اگر خالص ملکی مصالح کے پہلو سے بھی دیکھا جائے اور جنگ آزادی میں مدارس اور علماء کی خدمات سے صرف نظر کرتے ہوئے موجودہ حالات ہی میں مدارس کی خدمات کا جائزہ لیا جائے ،تب بھی ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے ، سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق چار فیصد طلبہ مدارس میں داخل ہوتے ہیں ، اتنی آبادی کو مفت تعلیم مہیا کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے ، اس وقت ملک میں خواندگی بڑھانے کی مہم چل رہی ہے ، اس پر کروڑوں روپئے خرچ ہورہے ہیں اور یہ مہم حروف شناسی اور نوشت وخواند تک محدود رہتی ہے ، اس پہلو سے دیکھئے کہ کسی خرچ کے بغیر مدارس کتنی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں!

عام طور پر دینی مدارس کو عصری تعلیم کے فروغ میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے ؛ لیکن معروف داعی مولانا محمد کلیم صدیقی کے بہ قول ۲۰۰۳ء کے ایک سروے کے مطابق دینی مدارس کے تحت نیز مدارس کی انتظامیہ کے زیر نگرانی چلنے والے پرائمری ، مڈل اور ہائی اسکولوں میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد تقریباً اکیانوے لاکھ تھی ، اس کے علاوہ کئی جونیئر ، ڈگری اور اعلیٰ تعلیم کے عصری ادارے نیز فنی تعلیم اور ووکیشنل تربیتی ادارے ان مدارس کے تحت چلتے ہیں ، اگر ان اداروں کے اعداد وشمار کیئے جائیں تو مدارس کے ذریعہ کم وبیش ایک کروڑ سے زیادہ طلبہ مختلف سطح کی عصری تعلیم حاصل کررہے ہیں ، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خود عصری تعلیم کی فراہمی میں مدارس کے نیٹ ورک کی کیا اہمیت ہے؟

تعلیم کے بعد دوسرا اہم پہلو 'امن وامان' کا ہے ، اس وقت تعلیمی اداروں میں امن وامان کا مسئلہ بڑا اہم ہوگیا ہے ، کالجوں اور یونیورسیٹوں میں آئے دن قتل وغارتگری ، آتش زنی ، عصمت ریزی ، توڑ پھوڑ وغیرہ کے ایسے واقعات پیش آرہے ہیں کہ پڑھنے والوں کی روش جاہلوں کو بھی شرمسار کررہی ہے ، چند ہی ماہ پہلے ایسی روح فرسا خبر آچکی ہے کہ شاگردوں نے اپنے استاذ کو قتل کردیا اور ایک خبر کے مطابق طلبہ نے اپنی ہی خاتون استاذ کی اجتماعی آبروریزی کی ، اس سے اس سلوک کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جو طلبہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ یا باہر کے لوگوں کے ساتھ روا رکھتے ہوں گے ، ریگنگ کے نام پر نئے طلبہ کے ساتھ پرانے طلبہ جو بدتمیزیاں کرتے ہیں

اور جس قسم کی زیادتی اور بے حیائی روا رکھتے ہیں، آئے دن اخبارات میں ان کی اطلاعات شائع ہوتی رہتی ہیں، اگر طلبہ وطالبات کے خلاف ہونے والے F.I.R کے اعداد وشمار جمع کیے جائیں، تو میرا اندازہ ہے کہ ان کی تعداد ہزار ہا ہزار تک پہنچ جائے گی، لیکن وزارتِ داخلہ کے جمع کیے ہوئے اعداد وشمار کے مطابق مدارس کے متعلقین وفضلاء کے خلاف شکایات ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۳ء کے درمیان 438، ۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۴ کے درمیان 513 اور ۲۰۰۴ء سے ۲۰۰۵ء کے درمیان 463 درج کی گئی ہیں، جبکہ معلوم ہے کہ پولیس میں جو شکایتیں درج کرائی جاتی ہیں، ان میں پچاس فیصد سے بھی کم ہی سچائی پر مبنی ہوتی ہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ کبھی یہ بات نہیں سنی گئی کہ اِن مدارس کے طلبہ نے اپنے استاذ پر قاتلانہ حملہ کیا ہے، یا ایک طالب علم نے دوسرے طالب علم کی جان لے لی ہے، یا کسی طالب علم یا استاذ کو لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ خوانی میں پکڑا گیا ہے یا وہ زنا بالجبر یا راہ زنی کے کیس میں ماخوذ ہوئے ہیں؛ کیوں کہ مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ہے، اور طلبہ کے لیے جو ماحول فراہم کیا جاتا ہے، اس میں انسانیت، محبت، بڑوں کا احترام، چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور اخلاق وکردار کی حفاظت کا مزاج بنتا ہے اور اس کی وضع قطع خود اسے جرم کے قریب جانے سے باز رکھتی ہے۔

معاشی پہلو سے دیکھئے تو مدارس کے فضلاء غریب تو ملیں گے، لیکن شاید ایسی کوئی مثال نہیں ملے گی کہ کوئی عالم بھیک مانگ رہا ہو، یا رکشہ چلا رہا ہو، یا اس نے معاشی تنگی سے عاجز آکر خودکشی کر لی ہو، یا کسی کے گھر میں ڈاکہ ڈالنے پر مجبور ہوا ہو، ہر سال ایک اندازہ کے مطابق ساڑھے چھ ہزار سے اوپر علماء، فضلاء اور مفتیان تیار ہوتے ہیں، اور ڈھائی ہزار سے اوپر حافظ وقاری سند لے کر نکلتے ہیں، ان میں سے بڑی تعداد وہ ہے جو پھر مدارس ہی سے وابستہ ہو جاتی ہے، یا وہ امامت وخطابت، تصنیف وتالیف، صحافت وغیرہ کی خدمات انجام دیتے ہیں؛ لیکن بہر حال فارغین کی تقریباً نوّے فیصد تعداد دوبارہ مدارس سے جڑ جاتی ہے، ہر سال یہ مدارس ہزاروں لوگوں کو روزگار سے جوڑتے ہیں اور جو لوگ پہلے سے مدرسوں سے جڑے ہوئے ہیں ان کی تعداد اس کے علاوہ ہے، اگر اس پہلو سے غور کریں اور اساتذہ کے علاوہ مدرسہ کے عملہ وغیرہ کو بھی شامل کر لیں، تو لاکھوں افراد کا روزگار انہی مدارس سے جڑا ہوا ہے، اس طرح یہ ادارے ملک میں بے روزگاری کو روکنے

میں بھی بڑا اہم کردار ادا کر رہے ہیں، ان کے علاوہ فضلاءِ مدارس کی ایک بہت بڑی تعداد بیرونی ممالک خاص کر خلیجی ممالک میں برسرِ روزگار ہے، ان کے ذریعہ کثیر زرمبادلہ ملک کو حاصل ہوتا ہے، پھر بہت سے مدارس وہ ہیں جنہیں F.C.R.A حاصل ہے، چار سال پہلے کی رپورٹ کے مطابق دینی مدارس کو دو کروڑ ڈالرس کھاتہ سے حاصل ہوئے؛ لہٰذا اگر اس پہلو سے غور کیا جائے تو ایک طرف مدارس کے ذریعہ کڑوڑوں ڈالرز زرمبادلہ حکومت کو حاصل ہو رہے ہیں، دوسری طرف لاکھوں افراد کے روزگار کا نظم ہو رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک کروڑ بچوں کی عصری تعلیم مدرسوں کے ذریعہ انجام پا رہی ہیں، یہ خالص دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کے علاوہ ہیں، اس طرح حکومت کثیر صرفہ سے بچ جاتی ہے؛ کیوں کہ ۲۰۰۵ء کے اعداد وشمار کے مطابق حکومت پرائمری کے ایک طالب علم پر سالانہ -/1326 خرچ کرتی ہے، اس لحاظ سے اوپر ذکر کیے گئے اعداد وشمار کے مطابق 91 لاکھ بچوں کی تعلیم پر ایک ارب بیس کروڑ روپئے کے اخراجات آتے ہیں، اس ذمہ داری کو مدارس پورا کر رہے ہیں۔

مدارس کی ایک اچھی خاصی تعداد وہ ہے، جن کے تحت خدمتِ خلق کے ادارے بھی ہیں، خاص کر ہسپتال، طبّی امداد اور غرباء، یتامیٰ، بیوگان کی امداد کے ادارے، اس سلسلہ میں اعداد وشمار محفوظ نہیں ہیں؛ لیکن اگر مدارس کے زیرِ انتظام ہسپتالوں اور غیر سودی قرضوں، بیواؤں، یتیموں کی امداد وغیرہ کے ذیلی شعبوں کا جائزہ لیا جائے تو ان سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد لاکھوں ہوگی —— اگر حکومت ان پہلوؤں کو ملحوظ رکھے اور کھلے ذہن کے ساتھ مدارس کی خدمات کا جائزہ لے تو اسے اندازہ ہوگا کہ یہ ملک کی سب سے بڑی غیر سرکاری آرگنائزیشن ہے، اور اس کی خدمات کا دائرہ دوسری N.G.O کے مقابلہ نہایت وسیع، سماج کی تعمیر پر مبنی اور کرپشن سے پاک ہے؛ اس لیے حکومت کو کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا چاہیے جس سے مدارس کی آزادی اور اس کے نظام پر زد پڑتی ہو۔

یہ تو وہ گذارشات ہیں، جو حکومت کی خدمت میں پیش کرنی تھیں؛ لیکن خود اہلِ مدارس کے لیے بھی یہ امتحان کا وقت ہے، ان مدارس کا مقصد صرف تعلیم وتعلّم نہیں ہے، یہ درسگاہیں صرف اس لیے نہیں ہیں کہ یہاں کے پروردہ افراد کسبِ معاش کی جد وجہد میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کریں، ان مدارس کی عظمت خشت وسنگ کی عمارتوں، خوب صورت اور خوش منظر

سبزہ زاروں، وسیع وعریض زمینوں اور تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی کثرتِ تعداد سے نہیں ہے، بلکہ ان کی قیمت اس کردار سے ہے، جس کے لیے بزرگوں نے تحریکِ مدارس کی بنیاد رکھی ہے، مغلیہ دور کے زوال کے بعد جب علماء ومشائخ نے محسوس کیا کہ اب مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہو رہا ہے تو انہوں نے اس عزم کے ساتھ اس تحریک کی بنیاد رکھی کہ اس دیار میں اسلام کی حفاظت کا جو فریضہ سلاطین انجام دیا کرتے تھے، اب اسے یہ بوریہ نشین درویش انجام دیں گے، ان کے پاس نہ تاج وتخت ہوگا، نہ دولت وثروت ہوگی، نہ لوگوں کی نگاہوں کو خیرہ کرنے والے مادّی وسائل ہوں گے؛ لیکن ان کا سینہ ایمان ویقین کی دولت بے کراں سے معمور ہوگا، دل دردمند اور فکر ارجمند ان کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوگا، یہ مادّی وسائل کے بجائے خدا کے خزانہ پر نظر رکھنے والے ہوں گے، خدا کی محبت اور خدا کے دین کے لیے سب کچھ نثار کردینے کا جذبہ حکومت کی طرف سے آنے والی آزمائشوں اور فقر وافلاس کی تلخیوں میں ان کو ثابت قدم رکھے گا، نہ لوہے کی زنجیر ان کو خوف زدہ کرسکے گی اور نہ سونے کی زنجیر ان کو خرید سکے گی۔

تحریکِ مدارس کے بانیوں اور مؤسسوں نے اولِ روز سے اس کے لیے یہی ہدف مقرر کیا تھا اور اسی کے مطابق اس کا طریقۂ کار وضع کیا تھا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند نے نظامِ دارالعلوم کے لیے جو آٹھ اصول مقرر فرمائے، ان میں نہ صرف حکومت کی مدد کو قبول کرنے سے منع کیا گیا، بلکہ اس بات سے بھی روکا گیا کہ مدارس کی توجہ آمدنی کے مستقل ذرائع کی طرف ہو جائے، کیوں کہ اس سے خدا پر توکل ختم ہو جائے گا، اور یہی توکل ان اداروں کا اصل اثاثہ ہے۔

ان مدارس کے نظام میں یہ بات شامل رکھی گئی ہے کہ عوامی تعاون سے ان کی ضروریات پوری کی جائیں، اس کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ انتظامیہ کی توجہ ہمیشہ اللہ کی طرف ہوتی ہے، اللہ کے خزانہ سے حاصل کرنے اور اسی سے امیدیں وابستہ رکھنے کا جذبہ باقی رہتا ہے، ہوسکتا ہے کہ عام لوگوں کو یہ تکلّف وتصنّع کی بات محسوس ہو؛ لیکن مدارس کے ذمہ داروں کے لیے یہ روزمرہ کی آپ بیتی ہے، جب مدرسہ کا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے تو اکثر مدارس میں دو چار مہینے کے اخراجات بھی بہ مشکل ہوتے ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد سے آہستہ آہستہ سال بھر کی ضروریات مکمل ہوتی ہیں،

اور بعض دفعہ اس طور پر پوری ہوتی ہیں کہ ان کے نصرت غیبی ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا؛ اس لیے واقعہ ہے کہ جو لوگ مدارس کے نظام سے وابستہ ہیں، یہ کیفیت ان کے ایمان ویقین کو بڑھانے میں مدد ومعاون ہوتی ہے۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جب اربابِ مدارس اپنی قوم سے دس دس بیس بیس روپئے جمع کرتے ہیں تو انہیں محاسبہ کی فکر بھی دامن گیر رہتی ہے اور انہیں اپنے معاونین کے سامنے اس تعاون کے نتائج بھی پیش کرنے پڑتے ہیں، خلق اللہ کے محاسبہ کا یہ خوف انہیں راہِ راست پر قائم رکھتا ہے، دوسری طرف قوم میں یہ مزاج بنتا ہے کہ وہ اپنے دین کی حفاظت، دعوت وارشاد، اور اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام خود کریں، وہ حکومت یا دوسروں کے محتاج نہ بنیں، امت ان مدارس کے واسطے سے ملک بھر میں قوم کے لاکھوں نونہالوں کی اجتماعی کفالت کر رہی ہے جو کسی زمانہ میں اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہوا کرتی تھی۔

اسی لیے مدارس اور اہلِ مدارس کو یہ بات طے کرلینی ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کی طرح معمولی تنخواہوں پر گذر بسر کریں گے، خس پوش عمارتوں میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دیں گے، مشقتوں اور مجاہدوں سے گذریں گے؛ لیکن ہم حفاظتِ دین کے اس نظام کا سودا نہیں کریں گے، اگر آٹھ آٹھ دس دس سال شب وروز قال اللہ اور قال الرسول پڑھتے ہوئے خدا کی رزاقیت پر یقین اور اللہ کی رضاء کے لیے دنیا کی اس متاعِ حقیر کی قربانی کا سبق بھی ہم نہیں پڑھ پائے تو اس سے بڑھ کر محرومی کی بات اور کیا ہوگی؟ مدارس جن اعلیٰ مقاصد کے لیے قائم کیے گئے ہیں اور ان کی جو روشن روایات رہی ہیں، ان کو چند مادّی ٹھیکروں کے بدلہ فروخت کردینا یقیناً دین وعلمِ دین کی بے توقیری اور اس کو بے آبرو کرنے کے مترادف ہے:

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

حکومت کی طرف سے یہ بات کہی جارہی ہے کہ ہم مدارس کے اندرونی نظام میں کوئی دخل نہیں دیں گے اور اس کے نصاب میں اپنی طرف سے کوئی بڑی تبدیلی نہیں لائیں گے؛ لیکن یہ محض بہلاوے کی بات ہے، ایک دفعہ جب مدارس کسی نہ کسی درجہ میں حکومت سے وابستہ ہوجائیں گے تو بتدریج ساری تبدیلیاں آئیں گی، نصاب بدلے گا، نظام میں تبدیلی آئے گی، مدرسین میں نیک

وبد کی تمیز ختم ہوگی، اگر مرد وعورت اور مسلمان وغیر مسلم کے امتیاز کو بھی آہستہ آہستہ نا قابلِ قبول قرار دیا جائے تو عجب نہیں، تربیت کا پہلو ختم ہوجائے گا، دینی شعائر کی عظمت کا ماحول باقی نہیں رہے گا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اِس گئے گذرے دور میں بھی مدارس سے نکلنے والے فضلاء میں جو دینی حمیّت اور ایمانی غیرت ہوتی ہے، جو انہیں فتنۂ ارتداد سے ٹکرانے کا حوصلہ دیتی ہے اور جو مسلمانوں کی بے دینی پر انہیں تڑپاتی اور بے چین کرتی ہے، یہ کیفیت ختم ہوکر رہ جائے گی، ہندوستان کی حکومت تو کجا اکثر مسلمان ملکوں میں بھی جو دینی تعلیمی ادارے حکومتوں کے زیرِ اثر آگئے ہیں، وہ اپنے آزادانہ اور جرأت مندانہ کردار سے محروم ہوگئے ہیں اور اللہ تعالیٰ معاف کرے وہ ایک ایسی مہر بن گئے ہیں جس کو ہر اس تحریر پر ثبت کیا جاسکتا ہے، جو حکومت کی خواہش اور اس کے مقصد کی تکمیل کرتی ہو؛ اس لیے موجودہ حالات میں مدارس کے لیے مستحسن ہی نہیں؛ بلکہ فرض ہے کہ وہ تحریص وترغیب کے دام میں نہ آئیں اور اپنی آزادی کو خود حکومت کے ہاتھوں گروی نہ رکھیں کہ پنجرہ چاہے سونے کا ہو وہ پنجرہ ہی ہوتا ہے:

اے طائرِ لاہوتی ! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مدارس کے سلسلہ میں عام مسلمانوں کو بھی اپنی سوچ درست رکھنے کی ضرورت ہے، کچھ مسلمانوں میں یہ سوچ پیدا ہورہی ہے کہ دینی تعلیم پر اتنا سارا پیسہ خرچ کرنا عبث ہے، ان پیسوں کو عصری تعلیم پر خرچ کرنا چاہیے اور مسلمانوں کے معاشی حالات کو بہتر کرنے میں لگانا چاہیے، افسوس! انہوں نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا کہ قومیں پیٹ سے زندہ نہیں رہتیں، دل ودماغ سے زندہ رہتی ہیں اور وہ اپنی فکر اور اپنی تہذیب سے باقی رہتی ہیں، ہندوستان میں اگر مسلمان صرف اپنی زکاۃ ہی حساب سے ادا کردیں تو یہاں کے مدارس کو نہ حکومت کی اعانت کی ضرورت ہوگی اور نہ کاسۂ گدائی لے کر ملک سے باہر جانے کی نوبت آئے گی، نیز ملک میں کوئی مسلمان اپنی بنیادی ضروریات سے محروم نہیں رہے گا، جب ہم اِس دین پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی سے دنیا وآخرت کی فلاح کا یقین کرتے ہیں تو کیا اس دین کی حفاظت اور اپنی آنے والی نسلوں کی دینِ حق سے وابستگی کو برقرار رکھنے کے لیے اس پر دو چار فیصد بھی خرچ نہیں کرسکتے؟ اگر میدانِ حشر میں رسول اللہ ﷺ ہمارے

گریبان تھام لیں کہ تم نے اپنی خوراک و پوشاک کی خواہشات کو پوری کرنے اور عیش وعشرت کے نقشوں میں رنگ بھرنے کے لیے تو کتنا سارا خرچ کیا؛ لیکن کیا یہ ہمارا لایا ہوا دین اتنا بھی حق نہیں رکھتا تھا کہ اپنی آمدنی کے دو چار فیصد اس کے لیے خرچ کرو تو ہمارا کیا جواب ہوگا؟

بعض اہلِ دانش چاہتے ہیں کہ مدارس میں زیادہ سے زیادہ عصری مضامین شامل کئے جائیں، عالم ڈاکٹر، عالم انجینئر، عالم پلمبر، عالم الیکٹریشن وغیرہ تیار کئے جائیں— اولاً تو یہ ایک ناقابلِ عمل بات ہے کہ دو ایسے علوم جن کے دائرے خود بہت وسیع ہیں، ایک شخص ان دونوں کو اپنے اندر جمع کرلے، یہ ایسی ہی ہے کہ جیسے کسی ڈاکٹر سے انجینئر اور کسی انجینئر سے وکیل بننے کا مطالبہ کیا جائے؛ لیکن اس سے قطع نظر ایسا شخص بہتر معاش حاصل کرنے والا ایک فرد تو بن سکتا ہے کہ جیسے ڈاکٹر فیس کے بغیر کسی مریض پر نگاہِ غلط ڈالنے کو بھی تیار نہیں ہوتا اور وکیل وقت کی پوری پوری قیمت وصول کیے بغیر ابتدائی مشورہ دینے کو بھی آمادہ نہیں ہوتا، اسی طرح یہ عالم بھی سکہ بنانے والی مشین کی صورت اختیار کرلے؛ لیکن یہ سوچنا فضول ہے کہ ایسے فاضل کا دماغ امت کے دکھ درد اور اس کی ایمان وعمل سے دوری کے لیے بے چین بھی ہوگا، اس کا دل اعتقادی اور تہذیبی ارتداد کو دیکھ کر تڑپ اٹھے گا، مسلم سماج کا بگاڑ اس کی آنکھوں کو بے سکون کرے گا، اور امت کے مسائل کی فکر اس کے دل کی انگیٹھی کو سلگا دے گی، وہ ایک زیادہ کمانے والا اور بہتر معاشی زندگی گذارنے والا دینی معلومات کا حامل شخص تو ہوسکتا ہے؛ لیکن اس کے اندر اس کردار کو تلاش کرنا فضول ہے، جو ایک عالم کے لیے وجہ امتیاز اور تمغۂ افتخار ہے، جو لوگ عصری جامعات سے عربی زبان اور اسلامک اسٹیڈیز میں ایم، اے اور پی، ایچ، ڈی کرتے ہیں، ان کی مثالیں سامنے ہیں کہ ان کی زندگی میں کتنے لمحات دین وملت کے لیے میسر آتے ہیں!

مجھے ایسے دانشور دوستوں کو علامہ اقبالؒ جیسے صاحبِ دانش کی وہ بات یاد دلانے کو جی چاہتا ہے، جو انہوں اپنے ایک نیاز مند، معروف شاعر اور ادیب حکیم احمد شجاع سے کہی تھی:

> ''جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی، میں بھی وہی کچھ چاہتا تھا جو تم چاہتے ہو، انقلاب! ایک ایسا انقلاب جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذب اور متمدن

قوموں کے دوش بدوش کھڑا کردے، یورپ کو دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی ہے، ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہیں مکتبوں میں پڑھنے دو، اگر یہ مُلّا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو، کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا، میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستان کے مسلمان ان مکتبوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح جس طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب الاخوتین کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا'' (اوراقِ گم گشتہ، از رحیم بخش شاہین، ص: ۳۷۵-۳۷۴)

علامہ سید سلیمان ندویؒ جن کو اللہ تعالیٰ نے جدید وقدیم دونوں حلقوں میں یکساں مقبولیت عطا کی تھی، ان کا ارشاد ہے:

''ہم کو یہ صاف کہنا ہے کہ عربی مدرسوں کی جتنی ضرورت آج ہے، کل جب ہندوستان کی دوسری شکل ہوگی اس سے بڑھ کر ان کی ضرورت ہو گی، وہ ہندوستان میں اسلام کی بنیاد اور مرکز ہوں گے، لوگ آج کی طرح کل بھی عہدوں اور ملازمتوں کے پھیر اور اربابِ اقتدار کی چاپلوسی میں لگے ہوں گے اور یہی ''دیوانے مُلّا'' آج کی طرح کل بھی ہوشیار ہوں گے؛ اس لیے یہ مدرسے جہاں بھی ہوں، جیسے بھی ہوں، ان کو سنبھالنا اور چلانا مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض ہے۔

ان عربی مدرسوں کا اگر کوئی دوسرا فائدہ نہیں تو یہی کیا کم ہے کہ یہ غریب طبقوں میں مفت تعلیم کا ذریعہ ہیں، اور ان سے فائدہ اٹھا کر ہمارا غریب طبقہ کچھ اونچا ہوتا ہے اور اس کی اگلی نسلیں کچھ اور اونچی ہوتی

ہیں اور یہی سلسلہ جاری رہتا ہے—— غور کی نظر اس نکتہ کو پوری طرح کھول دے گی‘‘

اس لیے اپنے دانشور بھائیوں سے عرض ہے کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ اس ملک میں مسلمانوں کی پہچان محض تاج محل اور لال قلعہ کی بے جان عمارتوں سے نہ رہے؛ بلکہ ان کا ملّی وجود باقی رہے، تو انہیں ان مدارس کو ایسے اداروں کی صورت میں باقی رکھنا ہوگا، جن کا مقصد وحید امت کو دین سے جوڑے رکھنا ہو، جن کا ہدف کسبِ معاش نہ ہو؛ بلکہ کسبِ معاد ہو اور جس کا نظام اسی مزاج پر ترتیب دیا گیا ہو، جو اس وقت ہمارے سامنے ہے!

۱۵، ۲۲، ۲۹ دسمبر: ۲۰۰٦

مسلمانوں میں منووادلانے کی کوشش

سچر کمیٹی کی رپورٹ منظر عام پر آچکی ہے، اس رپورٹ نے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافی کے ''سچ'' کو دستاویزی ثبوت فراہم کر دیا ہے اور اس سے ایک شمعِ امید روشن ہوئی ہے کہ شاید حکومت کا ضمیر بیدار ہو اور وہ اپنی ہی عوام کے ایک گروہ کے ساتھ کئے جانے والے امتیازی برتاؤ کا تدارک کرے، یہ رپورٹ اس قدر مدلّل اور اعداد وشمار کے اعتبار سے جامع ہے کہ فرقہ پرست تنظیمیں بھی اس کی مخالفت میں کوئی قابل ذکر بات کہنے کے موقف میں نہیں ہیں، مسلمانوں کا نقطۂ نظر واضح ہے، ہم نہ رعایت چاہتے ہیں نہ دوسرے مذہبی گروہوں کے مقابلہ خصوصی سلوک کے طلب گار ہیں، ہم صرف انصاف اور مساویانہ برتاؤ چاہتے ہیں، یہ ہمارا جائز حق ہے جو ہمیں ملنا چاہیے۔

آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ اس رپورٹ کی روشنی میں حکومت کیا کچھ کارروائی کرے گی اور عملی طور پر مسلمانوں کو اس کا کیا فائدہ پہونچے گا ؟ لیکن ایک بات جو اس وقت نہایت ہی شد و مد کے ساتھ کہی جارہی ہے اور جسے بہت سے مسلمان بھی اپنے حق میں مفید سمجھ رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں کچھ برادریوں کو ''دلت'' مان لیا جائے اور ان کو وہ رعایتیں دی جائیں جو دلتوں کو حاصل ہیں ؛ اگر چہ پہلے سے بھی مسلمانوں کی بعض برادریاں پس ماندہ طبقات کے زمرہ میں رکھی گئی ہیں ؛ لیکن ہندو کہلانے والے دلتوں کے جمِ غفیر میں ان مسلمان برادریوں کے لوگوں کو کم ہی اس سے فائدہ ہو پاتا ہے، اب اگر پس ماندہ ذاتوں کے کوٹہ میں سے ان مسلمان برادریوں کے لیے کوئی کوٹہ مقرر کر دیا جائے تو یقیناً کچھ لوگوں کو اس کا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مسئلہ پر وسیع تناظر میں غور کیا جائے اور اسلام کے مزاج و مذاق کو سامنے رکھ کر کوئی رائے قائم کی جائے ، برادرانِ وطن کے یہاں ذات پات کی

تفریق اور نسلی اونچ نیچ کا تصور عقیدہ کا حصہ ہے، ہندو معاشرہ میں مختلف اصلاحی شخصیتوں نے اس مزاج کو بدلنے کی کوشش کی جن میں گاندھی جی اور راجہ رام موہن رائے کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، لیکن اس کوشش میں انہیں دس فیصد بھی کامیابی حاصل نہیں ہوسکی، آریہ سماجی تحریک نے اس مذہبی تصور کی ایک نئی توجیہ پیش کی کہ برہمن، ویش، چھتری اور شودر کی تقسیم ذات پات کی بنیاد پر نہیں ہے؛ بلکہ یہ ''کرم''، یعنی عمل کی بنیاد پر ہے، جناب دیانند جی سرسوتی نے ''وید پرکاش'' میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، مگر یہ ایسی توجیہ تھی کہ شاید اس کو خود ان کے ضمیر نے بھی قبول نہ کیا ہو؛ کیوں کہ منوسمرتی میں ذات پات کی بنیاد پر تفریق اور پیدائشی طور پر کچھ لوگوں کا باعزت اور کچھ لوگوں کا ذلیل ہونا اتنا واضح ہے کہ اس کی تاویل دن کو رات کہنے سے کم نہیں، ہندو سماج میں اس کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ وہ اکھاڑے نہیں اکھاڑی جاتیں؛ حالاں کہ آج ہمارا ملک علم وسائنس کے اعتبار سے نہایت تیز رفتار ترقی کر رہا ہے اور پوری دنیا میں اس کی ایک شناخت قائم ہو چکی ہے، نیز اس تعلیمی ترقی نے روشن خیالی بھی پیدا کی ہے، توہمات کی زنجیریں کٹ رہی ہیں اور نئی نسل اپنے بزرگوں کے بہت سے فرسودہ خیالات سے چھٹکارا پا چکی ہے یا اس کے لیے کوشاں ہے؛ لیکن حیرت ہے کہ نسلی تفریق کا یہ بت جس نے دل و دماغ میں جگہ بنالی ہے، توڑے نہیں ٹوٹ رہا ہے۔

آج بھی ایسی خبریں آتی ہیں کہ ہریجن طبقہ سے تعلق رکھنے والے آفیسر کی جگہ برہمن یا اونچی ذات کا آفیسر آجائے تو وہ پورے آفس کو دھلوانا ضروری سمجھتا ہے، اور تو اور چند سال پہلے فیض آباد کے سیشن کورٹ کے ایک جج کا اسی طرح کا واقعہ نمایاں طور پر شائع ہوا، یہ بھی ایک کڑوی سچائی ہے کہ بعض دفعہ سرکاری دفاتر میں نیچی ذات کا آفیسر آگیا تو اس کے ماتحت کام کرنے والی اونچی ذات کے نوکروں نے اپنا تبادلہ کرالیا، جن لوگوں کی عمر تیس سال سے متجاوز ہوگی انہیں یاد ہوگا کہ جب اندرا گاندھی کے شکست کھانے کے بعد جنتا پارٹی برسر اقتدار آئی تو اس وقت انتظامی قابلیت، سیاسی تجربہ اور صاف ستھری شبیہ کے اعتبار سے جگ جیون رام کی شخصیت سب سے نمایاں تھی اور لوگوں کا عام تاثر تھا کہ وہی وزیر اعظم بنائے جائیں گے؛ لیکن چرن سنگھ (جن کا تعلق جاٹ برادری سے تھا) نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ جاٹ کسی ہریجن وزیر اعظم کے تحت کام نہیں کریں گے؛ چنانچہ مرار جی ڈیسائی وزیر اعظم ہوئے، چرن سنگھ وزیر داخلہ اور جگ جیون رام وزیر

دفاع، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ طبقاتی تقسیم کی جڑیں برادرانِ وطن میں کس قدر گہری ہیں، اس کے ردِعمل میں یہ بات بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ بہار اور یوپی میں جب نچلی ذات کے لوگ اقتدار پر آئے تو انہوں نے اونچی ذات کے لوگوں کے ساتھ انتقامی کارروائی شروع کردی اور سماج کے بہت سے باعزت لوگوں کو بے آبرو کر کے ہی مطمئن ہوئے؛ بلکہ یوپی کی ایک سابق خاتون چیف منسٹر کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ وہ اونچی ذات کے افسروں کو مغلظ گالیاں دینے میں بھی تکلف سے کام نہیں لیتی تھیں۔

کچھ لوگ اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ مسلمانوں کو بھی ذات پات کے نام پر بانٹ دیا جائے، آنجہانی کانشی رام تو بار بار اپنی تقریروں میں بھی اس بات کو کہہ چکے ہیں اور بعض مقامات پر انہیں اس میں جزوی کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے، اس کوشش کا ایک سبب یہ ہے کہ جو لوگ ہندو کہے جاتے ہیں، ان کی تعداد تو اس ملک میں اسّی فیصد کے قریب ہے؛ لیکن اس کے باوجود یہ طبقاتی تقسیم ان کے ووٹ کو متحد نہیں ہونے دیتی، ہریجن سمجھتا ہے کہ برہمن اور راجپوت کو اپنا ووٹ دینا گویا دشمنوں کو ہتھیار دینا ہے، اونچی ذات کے لوگ نیچی ذات کے لوگوں کو ووٹ دینے کے روادار نہیں ہوتے یا کم سے کم خوش دلی کے ساتھ ووٹ نہیں دیتے، ہزار اختلاف کے باوجود مسلمان فرقہ پرست عناصر کے جواب میں ایک حد تک اپنے ووٹ کو تقسیم سے بچا لے جاتے ہیں، اسی کے نتیجہ میں گذشتہ الیکشن میں بی، جے، پی بہت ہی برے حال سے دوچار ہوئی، اس لیے سیاست کے بازی گر فکرمند ہیں کہ کس طرح مسلمانوں کے اختلاف کو ابھارا جائے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے؟

مسلمانوں میں اگر یہ طبقاتی تقسیم جڑ پکڑ گئی تو یہ امت جو پہلے سے مسلکی اور تنظیمی اختلافات کی وجہ سے بے وزن سی ہو کر رہ گئی ہے اور بھی بے قیمت ہو جائے گی اور الیکشن کے موسمِ بہار میں کچھ قائدین جو اس کے آنسو پونچھنے آجاتے ہیں اور کچھ وعدہ وعید کر کے ووٹ کا سودا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اشک شوئی کی یہ روایت بھی ختم ہو جائے گی؛ لیکن سماجی پہلو سے جو نقصان ہوگا وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے، اونچ نیچ کی یہ تقسیم ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ سے دور کر دے گی، باہمی ارتباط کمزور ہوتا جائے گا اور جو طبقہ اپنے آپ کو مظلوم و کمزور سمجھے گا، اس کی دوسرے مذہبی

گروہوں سے قربت بڑھ جائے گی اور اس سے جو نقصان ہوگا وہ محتاجِ اظہار نہیں، اس سلسلہ میں ایک ایسے واقعہ کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو خود اس حقیر کے ساتھ گزرا ہے، میں ایک مسجد کے افتتاح کے سلسلہ میں آندھرا پردیش کے ایک دور دراز کے دیہات میں مدعو تھا، وہاں مختلف آبادیاں تھیں، میں نے پوچھا کہ یہ آبادیاں کن لوگوں کی ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ فلاں آبادی ہندوؤں کی ہے، اس سے ذرا فاصلہ پر جو آبادی ہے وہ دلتوں کی ہے، یہ مسلمانوں کی آبادی ہے اور اس سے قریب جو آبادی نظر آرہی ہے، وہ نور باش لوگوں کی ہے، نور باش یا ندّاف اصل میں روئی دھننے والے کو کہتے ہیں؛ حالاں کہ اب یہ لوگ سنگ تراشی کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہیں؛ لیکن ان کے آباء واجداد کے پیشہ کی نسبت سے اب بھی انہیں نور باش یا ندّاف ہی کہا جاتا ہے، حاصل یہ ہے کہ اس برادری کو مسلمانوں نے اپنے دائرہ سے باہر تصور کرلیا ہے، ہم لوگ جب نور باش محلّہ میں لے جائے گئے تو وہاں ایک عجیب منظر دیکھا، مرد دھوتی پہنے ہوئے، عورتیں گھاگرا پہنے ہوئیں، لڑکے چوٹیاں رکھے ہوئے اور ہاتھ جوڑ کر سبھوں نے سلام کیا، انہیں گو اپنے مسلمان ہونے کا احساس تھا؛ لیکن وہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کے تہوار بھی مناتے تھے اور ان کے نام بھی ملے جلے قسم کے تھے، اس صورت حال کے ذمہ دار جہاں باشعور مسلمان ہیں کہ انہوں نے دیہات کے بچھڑے ہوئے بھائیوں کو اپنی توجہ سے محروم رکھا ہے، وہیں یہ اس طبقاتی تقسیم کا بھی اثر ہے، جو اس طبقہ سے متعلق عام مسلمانوں کے ذہن میں قائم ہوگئی ہے، اگر گردوپیش کا جائزہ لیا جائے تو قریب قریب پورے ملک میں اس طبقہ کے ساتھ دوسرے مسلمانوں کا یہی سلوک ہے، وہ انہیں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کا ایک گروہ سمجھتے ہیں، اگر ایسے لوگوں کو ارتداد کا دامِ فریب اپنے قابو میں کرلے تو حیرت نہ ہونی چاہیے۔

اگر مسلمانوں میں اونچی اور نیچی ذاتوں اور اسلامی برہمنوں اور اسلامی دلتوں کا تصور پیدا ہو جائے — جو سراسر اسلام کے مزاج کے خلاف ہے — تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ آہستہ آہستہ ان کے درمیان وہی دوریاں پیدا ہو جائیں گی، جو آج برادرانِ وطن کی مختلف ذاتوں کے درمیان ہیں؛ اس لیے چاہے وقتی طور پر اس سے کچھ فائدہ ہو جائے؛ لیکن مستقبل میں اس کے نتائج نہایت خطرناک ہوں گے، اسلامی تعلیمات اس سلسلہ میں بالکل واضح ہیں کہ مسلمانوں میں نہ کوئی برہمن

ہے نہ ذلت، کسی خاندان سے تعلق نہ اس شخص کے بہتر ہونے کی دلیل ہے اور نہ کم تر ہونے کا سبب، قرآن مجید نے واضح کر دیا ہے کہ خاندان وقبائل تعارف اور پہچان کے لیے ہیں نہ کہ باہم تفاخر یا کسی گروہ کی تحقیر کے لیے، عزت وشرافت اور علوِ مرتبت کا معیار انسان کا کردار ہے، جس کو ''تقویٰ '' سے تعبیر کیا گیا ہے:

﴿ وَ جَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ ﴾ (النساء:۱۲۹)

رسول اللہ ﷺ نے اس حقیقت کو کتنے واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

" قد أذهب اللّٰه عنكم عُبِّية الجاهلية و فخرها بالآباء ، مؤمن تقي ، و فاجر شقي ، و الناس بنو آدم و آدم من تراب "

(أبو داؤد : حدیث نمبر:۵۱۱۶، نیز دیکھئے:ترمذی: حدیث نمبر:۳۹۶۵)

''اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کے تکبر اور آباء واجداد پر فخر کو ختم کر دیا ہے، اب ایک شخص یا تو نیکوکار مومن ہوگا، یا بدکار فاجر، سارے لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں''

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خاندان کسی کو کم تر گردانے کے لیے نہیں ہے اور تم سب آدم کی اولاد ہو: '' **إن أنسابكم هذه ليست بسباب على أحد و أنتم ولد آدم** '' پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ فضیلت صرف دین اور عملِ صالح کی بنیاد پر ہے: ''**ليس لأحد فضل على أحد إلا بالدين أو عمل صالح** ''(مجمع الزوائد:۸/۸۴بحوالہ مسند احمد)

ایک اور روایت میں ہے کہ تم سب کا رب بھی ایک ہے اور تم سب کے باپ بھی ایک ہیں؛ لہٰذا کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، فضیلت صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے، (مجمع الزوائد عن ابی سعید:۸/۸۴بحوالہ طبرانی) ایک صاحب نے دوسرے کو ماں کی نسبت سے طعنہ دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے اندر کفر کی بو باقی ہے، ''**إن فيك شعبة من الكفر** ''(مجمع الزوائد عن ابی ہریرۃ:۸/۸۶بحوالہ مسند بزار)

فقہاء نے جو نکاح میں کفاءت کی گنجائش لکھی ہے، اس کا منشا بھی ذات کی اونچ نیچ نہیں

ہے؛ بلکہ خاندانی مناسبتیں ہیں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے خود اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا نکاح انصار کے ایک معزز سمجھے جانے والے قبیلہ میں کیا، بنو بیاضہ عرب کا ایک معزز قبیلہ سمجھا جاتا تھا، آپ ﷺ نے پیشہ سے حجام (پچھنا لگانے والے) صحابی ابو ہند رضی اللہ عنہ کا نکاح اس قبیلہ میں کیا، اس طرح کی کتنی ہی مثالیں عہد نبوی ﷺ میں موجود ہیں، رسول اللہ ﷺ کی ہدایت اس سلسلہ میں بہت ہی واضح ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: نکاح چار وجوہ کے تحت کیا جاتا ہے: مال، حسب، جمال اور دین، تو تم دیندار عورت کا انتخاب کر کے کامیابی حاصل کرو' **'فاظفر بذات الدين تربت يداك'**' (صحيح البخاری، كتاب النكاح، باب الأكفاء فی الدين ،حدیث نمبر: ۵۰۹۰) ایک اور روایت میں ہے کہ جب کوئی ایسا شخص تمہارے یہاں نکاح کا پیغام دے، جس کی دینی اور اخلاقی حالت سے تم مطمئن ہو تو نکاح کر دو، اگر ایسا نہیں کرو گے، تو یہ زمین میں بڑے فتنہ وفساد کا باعث بن جائے گا؛ (ترمذی عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ،حدیث نمبر: ۱۰۸۴) اسی لیے ائمہ اربعہ میں سے ایک ممتاز فقیہ امام مالکؒ کے نزدیک تو صرف دین میں کفاءت کا اعتبار ہے اور یہی ایک قول امام شافعیؒ کا ہے، (دیکھئے: المغنی: ۷/۱۶) اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی صرف دین میں کفاءت کو رشتہ کے انتخاب کی بنیاد بنانا افضل ہے: '' **و عندنا الأفضل إعتبار الدين و الاقتصار عليه** '' (بدائع الصنائع : ۲/۱۱۹، قدیم ایڈیشن)

رسول اللہ ﷺ نے یہ بات ضرور فرمائی کہ مسلمانوں کے ائمہ یعنی فرماں روا قریش میں سے ہوں '' **الأئمة من قريش** ''؛ لیکن یہ کوئی مستقل شرعی حکم نہیں تھا؛ بلکہ عرب کے اس وقت کے حالات کے پس منظر میں بطور حسنِ تدبیر کے تھا کہ عرب قریش کے علاوہ کسی اور کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو تیار نہیں ہوں گے، اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آزاد شدہ غلام کے بارے میں فرمایا کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو میں ان کو اپنا جانشین بناتا، حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے عہد میں اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ عہد صدیقی میں ایسی فوج پر امیر بنائے گئے، جن میں اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے؛ حالاں کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ آزاد کردہ غلام تھے اور عرب ایسے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، نماز کی امامت کے لیے بھی آپ ﷺ نے علم وعمل کو بنیاد بنایا ہے۔

غرض کہ اسلام میں خاندانی بنیاد پر اونچی اور نیچی ذات ہونے کا کوئی تصور نہیں، بلکہ اسلام نے اس تصور کو مٹایا ہے؛ اس لیے دلت مسلمان کے بجائے معاشی اور تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ مسلمانوں کی اصطلاح اختیار کی جاسکتی ہے کہ آمدنی کی ایک مقرر حد سے جو لوگ نیچے ہیں، ان کے لیے خصوصی مراعات رکھی جائیں، اسی طرح مثلاً جن خاندانوں میں گریجویٹ کی سطح تک تعلیم یافتہ لوگ نہیں ہیں، ان کو تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ سمجھا جائے اور ان کے ساتھ خصوصی مراعات کا معاملہ کیا جائے۔

۱۹/ جنوری ۲۰۰۷ء

ذات پات کی بنیاد پر ریزرویشن

اسلام سے پہلے دنیا میں جو مذاہب موجود تھے، ان میں انسانوں کے ایک گروہ کو نسلی بنیاد پر دوسرے انسانوں پر افضل قرار دیا جاتا تھا، ایرانی آریہ نسل سے تعلق رکھتے تھے اور وہ اپنے آپ کو تمام انسانوں کا مخدوم اور پیدائشی طور پر حکمرانی کا اہل تصور کرتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ شاہی خاندان کے بارے میں یہ مبالغہ آمیز تصور بھی پایا جاتا تھا کہ ان کی رگوں میں خدا کا خون دوڑتا ہے، یہودیوں اور عیسائیوں کا تصور تھا کہ وہ چونکہ حضرت اسحاق ں کی نسل سے ہیں، اس لیے انہیں پوری انسانیت پر فضیلت حاصل ہے اور وہ خدا کے قریبی لوگ ہیں، آریوں ہی کا قافلہ ایران سے ہندوستان آیا اور رفتہ رفتہ طبقاتی تقسیم اور گہری ہوتی گئی؛ چنانچہ یہاں دڑاوردوں نے جو قانون مرتب کیا، جسے ''منو'' کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس میں انسانیت کو مستقل طور پر چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، ایک گروہ کے بارے میں کہا گیا کہ یہ خدا کے سر سے پیدا کئے گئے ہیں، یہ پیدائشی طور پر مقدس اور امتیازی شان کے حامل ہیں، عام لوگوں کا کام ہے کہ ان کی بارگاہ میں نذر و نیاز پیش کریں اور ان کو راضی رکھیں، اسی میں لوگوں کی نجات ہے، بادشاہوں کو بھی اس گروہ کے تابع رکھا گیا، یہ گروہ برہمنوں کا ہے، دوسرا گروہ ویش کا ہے، جو خدا کے بازوؤں سے پیدا کئے گئے ہیں، ان کا کام کاروبارِ حکومت کو چلانا ہے، تیسرا گروہ چھتریوں کا ہے، جو ان کے عقیدہ کے مطابق خدا کی رانوں سے پیدا کئے گئے ہیں، محنت و مزدوری کرنا ان کی ڈیوٹی ہے، چوتھا گروہ شودر کا ہے، جن کے بارے میں اس کا تصور ہے کہ یہ خدا کے پاؤں سے پیدا کئے گئے ہیں، ان تینوں گروہوں کا بنیادی کام برہمنوں کا خدمت کرنا اور ان کو خوش رکھنا ہے؛ لیکن خود ان تینوں طبقوں کے درمیان درجات و مراتب میں بڑا تفاوت ہے، شودر تو جانوروں سے بھی بدتر ہیں، ان پر علم کا دروازہ بند ہے، ان کا سایہ بھی اس لائق نہیں ہے کہ اونچی ذات والوں پر پڑ سکے، اونچی ذات والوں کے مندروں کے

دروازے ان پر بند ہیں، عام طور پر دڑاوردی ہندوستان کے اصل باشندے تھے، وہ بیچارے اس حقیر سلوک کے مستحق قرار دیئے گئے اور انہیں شمالی ہند؛ بلکہ پورے ملک سے کھدیڑ کر جنوبی ہند کی آخری ساحلی پٹی میں مقیم ہونا پڑا، جو اس زمانہ میں شہری سہولتوں اور تہذیب وثقافت کی کرنوں سے دور کا علاقہ تھا۔

ہندوستان کے لوگوں میں صدیوں اس تصور کی تبلیغ کی گئی اور یہ بات اس طرح ذہن میں راسخ کردی گئی کہ نیچ سمجھے جانے والے لوگ خود بھی اس حیثیت پر قانع ہوگئے، اس سوچ کو مزید پختہ کرنے اور مظلوم شودروں کو احتجاج سے روکنے کے لئے برہمنوں نے آواگون کا تصور دیا، یعنی انسان اپنے اعمال کے اعتبار سے دنیا میں بار بار جنم لیتا رہتا ہے، اس طرح شودروں کو بتایا گیا کہ تمہارا شودر ہونا بلا سبب نہیں ہے، یہ پچھلے جنم کے اعمال کا نتیجہ ہے، اگر اس جنم میں تمہارے اعمال اچھے رہے اور تم نے برہمنوں کی خدمت کا حق ادا کیا، تو تم اگلا جنم ایک برہمن کی صورت لے سکتے ہو، یہ وہ تصور تھا جس نے نیچ سمجھے جانے والے لوگوں کو مطمئن کردیا، —— اس غیر انسانی تصور کو چونکہ مذہبی رنگ دے دیا گیا، اس لیے اس کی جڑیں اتنی گہری ہوگئیں کہ متعدد اصلاحی کوششوں کے باوجود آج پڑھے لکھے لوگوں میں بھی یہ سوچ موجود ہے، اور عملاً برہمنوں اور اونچی ذات والوں کی فرمانروائی کا سکہ چل رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے دنیا کو جو انقلابی تصورات دیئے، ان میں ایک وحدت انسانیت کا تصور بھی ہے، قرآن نے صاف اعلان کردیا کہ تمام انسان ایک ہی شخص کی اولاد ہیں، انسانوں کا کوئی گروہ نہ خدا کی اولاد ہے اور نہ پیدائشی طور پر خدا کو زیادہ محبوب ہے، خدا کے نزدیک نسلی بنیادوں پر کوئی اونچا اور نیچا نہیں؛ بلکہ انسان کے باعزت ہونے کا معیار اس کا عمل اور برتاؤ ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے تاریخی خطبہ میں اس بات کا بہت واضح طور پر اعلان فرمادیا کہ کسی عربی کو غیر عربی پر عرب ہونے کی بنا پر اور کسی سفید فام کو سیاہ فام پر چمڑے کی رنگت کی بنا پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے؛ بلکہ خدا کے نزدیک انسان تقویٰ کی وجہ سے باعزت شمار ہوگا:

" لا فضل لعربي على العجمي ولا لأبيض على الأسود إن أكرمكم عند الله أتقاكم " (مسند احمد ،حدیث نمبر:۲۳۵۳۶)

اس فکر کو راسخ کرنے کے لیے قرآن نے دو بنیادی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے: ایک یہ کہ انسان کا مقام و مرتبہ اس کے عمل وکسب سے متعلق ہے، اتفاقات سے متعلق نہیں ہے، یعنی کسی انسان کا کسی خاندان میں پیدا ہونا، کسی خاص زبان میں اپنے مافی ضمیر کو ادا کرنا اور کسی علاقہ میں اس کی رہائش کا ہونا، یہ سب اتفاقی امور ہیں، ان کی وجہ سے کوئی انسان بلند و برتر نہیں ہوتا، علم انسان اپنی محنت سے حاصل کرتا ہے، اخلاقی رویہ کو انسان اپنے نفس کی تربیت کے ذریعہ درست کرتا ہے، انسان جو عمل کرتا ہے، اس میں انسان کی محنت کو دخل ہوتا ہے، گویا یہ اکتسابات ہیں، یہ محنت وکاوش کے ذریعہ حاصل کی جانے والی خوبیاں ہیں؛ اس لیے ان ہی سے انسان کی فضیلت وسربلندی متعلق ہے؛ اسی لیے حدیث نبوی ﷺ میں فضائل سے متعلق تمام ارشادات 'علم وعمل اور اخلاق' کے گرد گھومتے ہیں۔

دوسرا بنیادی تصور یہ ہے کہ خدا اور بندوں کے درمیان اس کے سوا کوئی واسطہ حائل نہیں ہے، سوائے اس کے کہ قدسی صفت پیغمبروں اور رسولوں کے ذریعہ اللہ کا پیغام انسانیت تک پہنچا ہے، ہر شخص براہ راست خدا سے مانگ سکتا ہے، ہر شخص کو براہ راست خدا کی عبادت کرنا ہے، ہر شخص کے لیے خدا کی طرف سے آنے والے علم کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اس تصور سے انسانی مساوات کی فکر کو تقویت پہنچتی ہے، جن لوگوں نے انسانوں کو مختلف خانوں میں تقسیم کیا تھا، انہوں نے انسانوں کے ایک گروہ کو خدا اور بندوں کے درمیان واسطہ بنادیا تھا اور تصور دیا تھا کہ ہر عام وخاص کی خدا تک رسائی نہیں ہوسکتی، اسی لیے مسلمانوں میں پڑوسی قوموں سے تعصب کی وجہ سے کبھی کبھی علاقائی، لسانی اور نسلی تعصب کی آگ بھڑک اٹھی ہے؛ لیکن چوں کہ یہ اس امت کے بنیادی عقیدہ اور اساسی فکر کے خلاف ہے؛ اس لیے اس کو مسلمانوں میں کبھی بھی دوام واستمرار حاصل نہیں ہوا، اور نہ امت کے دیندار طبقہ نے کبھی اسے قبول کیا۔

عرصہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کا مطالبہ رہا ہے کہ انہیں تعلیم، ملازمت اور سیاسی نمائندگی میں ریزرویشن دیا جائے؛ تاکہ وہ موجودہ پسماندگی سے باہر آسکیں اور یقیناً یہ حکومت کی ذمہ داری ہے؛ اس لیے کہ یہ پسماندگی مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی جانے والی تنگ نظری اور ناانصافی کا نتیجہ ہے، اور حکومت کو خود اپنی ناانصافی کی تلافی کرنی چاہیے، اس ریزرویشن کی بنیاد

معاشی پچھڑا پن ہونا چاہیے، نہ کہ ذات پات، اس لیے اسلام میں قبائل وخاندان اونچ اور نیچ کو ظاہر نہیں کرتے ؛ بلکہ خاندان تعارف و پہچان کے لیے ہے، جیسے انسان الگ الگ صورتوں سے پہچانا جاتا ہے، الگ الگ ناموں سے اس کی شناخت ہوتی ہے، مختلف مقامات اور شہروں کی نسبت سے لوگوں کی سکونت کا علم ہوتا ہے، اسی طرح اپنے مورث اعلیٰ کی نسبت سے بھی انسان کی شناخت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا ہے:

﴿إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا﴾ (الحجرات :۱۳)

خوشی کی بات ہے کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ کے نتیجے میں ریزرویشن سے متعلق مسلمانوں کے دیرینہ مطالبہ پر مرکزی اور ریاستی حکومتیں غور کر رہی ہیں ؛ لیکن حکومت کا رخ یہ ہے وہ ریزرویشن ذات پات کی بنیاد پر دے، یعنی مسلمانوں کے ایک طبقہ کو اونچی ذات کا تصور کیا جائے، جیسے سید، شیخ، پٹھان وغیرہ اور ایک طبقہ کو نیچی ذات سمجھا جائے، جیسے انصاری، نداف، سبزی فروش وغیرہ اور اس دوسرے طبقہ کو ذات پات کی بنیاد پر تحفظ دیا جائے، سچر کمیٹی میں پہلے طبقہ کو اشراف (شریف کی جمع) اور دوسرے طبقہ کو ارذال (رذیل کی جمع) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مجھے جسٹس سچر پر کوئی حیرت نہیں ؛ کیوں کہ وہ جس معاشرہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس میں کچھ لوگوں کو پیدائشی طور پر شریف اور رذیل سمجھا جاتا ہے ؛ لیکن ظاہر کہ اسلام میں نہ کوئی شخص محض کسی خاندان میں پیدا ہونے سے شریف ہوتا ہے اور نہ کسی مسلمان کے لیے اس بات کا تصور بھی ممکن ہے کہ وہ کسی صاحب ایمان کو رذیل و کمین سمجھے، یہ تعبیر بجائے خود تکلیف دہ اور انسانی وحدت واسلامی اخوت کے تصور کے خلاف ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ ایسے ریزرویشن سے مسلمانوں کو جتنا فائدہ پہنچ سکتا ہے، یہ تقسیم اس سے زیادہ نقصان دہ ہے، اولاً تو یہ تقسیم خلافِ واقعہ ہے، ہندو سماج سے متاثر ہونے کے باوجود آج بھی مسلمان معاشرہ میں ذات پات کی جڑیں اتنی گہری نہیں ہیں ، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو محض خاندان کی نسبت سے حقیر نہیں سمجھتا، ایسا نہیں ہے کہ بعض مسجدیں سادات وشیوخ کے لیے مخصوص ہوں اور دوسروں کو اس میں داخل ہونے کی اجازت نہ ہو، ایسا نہیں کہ کوئی انصاری

اور نداف امام ہو تو مغل اور پٹھان ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیں، ایسا نہیں ہے کہ خانقاہوں میں اصلاح و مشیخت کے منصب پر صرف سادات و شیوخ ہی فائز ہیں، گو ہندوستان کے بعض علاقوں میں شادی بیاہ کے مسئلہ میں خاندانی نسبت کو مبالغہ آمیز حد تک پیش نظر رکھا جاتا ہے؛ لیکن آج بھی اکثر شہروں میں ایسی تقسیم نہیں ہے، مختلف خاندانوں میں باہم شادی بیاہ کے تعلقات ہیں، اور جہاں ذات کو زیادہ ملحوظ رکھا جاتا ہے، وہاں بھی یہ ایک روایتی اور رواجی عمل ہے، ورنہ کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ اپنے خاندان سے باہر دوسرے مسلمانوں سے شادی درست نہیں ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شادی میں خاندانی نسبت کا لحاظ رکھنے کے سلسلہ میں جو غلو پایا جاتا ہے، وہ بہت سے مفاسد کا باعث ہے اور اسے دور کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرے جب کوئی عمل مسلسل ہونے لگتا ہے، تو وہ عقیدہ بن جاتا ہے، یعنی شروع میں تو اس عمل کے پیچھے کوئی اعتقاد اور گہری فکر کارفرما نہیں ہوتی؛ لیکن بتدریج وہ انسانی فکر کا ایک حصہ بن جاتا ہے؛ اس لیے اگر ذات پات کی بنیاد پر ریزرویشن دیا گیا، تو یہ ابتداءً تو ایک سیاسی عمل ہوگا؛ لیکن آہستہ آہستہ لوگوں کے دل بھی تقسیم ہو جائیں گے، ان کی سوچ بھی بدل جائے گی اور مسلمانوں میں بھی برادرانِ وطن کی طرح ذات پات کی گہری تقسیم خدانخواستہ پیدا ہو جائے گی، اب غور کیجئے، جو دین اس طبقاتی تصور کو مٹانے کے لیے آیا اور جس نے انسانی وحدت کا تصور دیا، اسی دین کی حامل امت اپنے آپ کو اونچے نیچے طبقات میں تقسیم کر لے، اس سے زیادہ بدقسمتی کی کوئی بات ہو سکتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے اپنے آخری خطبہ میں ارشاد فرمایا:

> ''اللہ نے تم سے جاہلیت کے تکبر اور آباء و اجداد پر فخر کرنے کو ختم کر دیا ہے، اب یا تو وہ مومن ہے جو تقویٰ رکھتا ہو، یا وہ بدکار ہے جو خدا کی نافرمانی کرتا ہے، تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں، اور آدم مٹی سے بنائے گئے ہیں'' (ابوداؤد: حدیث نمبر: ۵۱۱۶)

ایک اور روایت میں ہے:

> ''تم لوگ اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اپنے بھائی پر ظلم کرتا ہے، نہ اسے رسوا کرتا ہے اور نہ اسے

حقیر سمجھتا ہے، انسان کے شریر ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے'' (مسلم عن ابی ہریرہؓ، حدیث نمبر: ۲۵۶۴)

اس لیے اس تصور کو قبول کرنا اسلام کی بنیادی فکر کے مغائر ہے۔

اس تقسیم کا نہایت منفی اثر مسلمانوں کی سیاسی قوت پر پڑے گا، یہ بات ظاہر ہے کہ اس ملک میں ہندوؤں کی آبادی اپنے مختلف گروہوں کے ساتھ غالب ہے؛ لیکن ذات پات کی تقسیم نے ان کو اس طرح ٹکڑیوں میں بانٹ رکھا ہے کہ کوئی بھی سیاسی جماعت محض 'ہندو ووٹ بینک' کی بنیاد پر برسر اقتدار نہیں آسکتی، اس کے برخلاف مسلمان ووٹ دینے میں اتحاد کا مظاہرہ کرتا ہے، اس اتحاد کی وجہ سے وہ اس ملک میں بادشاگر کا درجہ حاصل کر چکا ہے؛ اسی لیے مختلف سیاسی جماعتیں ہمارے آنسو پونچھنے پر مجبور ہوتی ہیں، اگر مسلمان ذات برادری کی بنیاد پر تقسیم ہو جائیں اور ان کا ووٹ بکھر گیا، تو پھر ان کا کوئی سیاسی وزن اس ملک میں باقی نہیں رہے گا، اور جو تھوڑی بہت رسمی داد و دہش کا معاملہ ان کے ساتھ کیا جاتا ہے، اس سے بھی وہ محروم ہو جائیں گے۔

خود جن مسلمان خاندانوں کو حکومت پست طبقہ قرار دیتی ہے اور اس بنیاد پر ان کو ریزرویشن کا حق دینا چاہتی ہے، وہ سوچیں کہ کیا ان کو اپنے لیے یہ بات پسند ہے کہ انہیں کم تر اور رذیل تصور کیا جائے اور اس بنیاد پر کچھ ملازمتوں کی بھیک دیدی جائے؟ پھر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ آئندہ نسلوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا، برادرانِ وطن میں جو لوگ دلت کہلاتے ہیں، ان کے اندر اپنی کمتری کا احساس اس درجہ راسخ ہو چکا ہے کہ نکالے نہیں نکلتا، اگر آج مسلمانوں کے کچھ خاندانوں کو پسماندہ ذات قرار دے دیا گیا، تو پچاس سو سال کے بعد ان کی آنے والی نسلیں بھی ایسے ہی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جائیں گی؛ اس لیے مسلمانوں کو متفقہ طور پر اس بات کا مطالبہ کرنا چاہیے کہ انہیں معاشی بنیاد پر ریزرویشن دیا جائے، نہ کہ ذات پات کی بنیاد پر۔

۸/ جون ۲۰۰۷ء

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر......

گجرات میں مسلمانوں کا جس طرح قتلِ عام کیا گیا اور خود قانون کے رکھوالوں نے قانون کی دھجی اڑائی، آزاد ہندوستان کی تاریخ میں شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے، اس واقعہ نے مرادآباد اور بھاگلپور کی خونچکاں داستانوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا، اگر انسانیت کے ساتھ ظلم و جور اور بربریت قابل انعام بات ہوتی تو امریکہ اور اسرائیل کے بعد گجرات اور اس کے چیف منسٹر نریندر مودی یقیناً اس کے مستحق ہوتے، جو مزاج حکمرانوں کا ہوتا ہے، وہی ان کی رعایا کا بھی ہوتا ہے، اس لیے مودی کے تحت کام کرنے والے سرکاری آفیسروں نے بھی خوں آشامی اور آدم خوری کا وہی راستہ اختیار کیا جو خود مودی کا ہے، چنانچہ سہراب الدین شیخ اور اس کی بیوی کوثر بی کے فرضی انکاونٹر کے سلسلہ میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل بارڈر رینج ڈی جی 'ونجارا' اور راجستھان کے آئی پی ایس آفیسر دنیش کمار اور ایک اور آئی، پی، ایس راجکمار پانڈین کی گرفتاری عمل میں آچکی ہے، جب کہ نریندر امین مفرور ہے اور اب تو ونجارا نے اپنے گناہ کا اعتراف بھی کرلیا ہے۔

سہراب الدین شیخ کا واقعہ حقیقت میں کوئی حیرت انگریز انکشاف نہیں ہے، گجرات حکومت اور گجرات پولیس کے بارے میں پہلے سے لوگ اسی قسم کی توقع رکھتے ہیں، اور نہ جانے اس طرح کے کتنے واقعات ہوں گے، جو ابھی گمنامی کے مدفن میں ہیں، سہراب الدین شیخ کے اس کیس پر عدالت کے منصفانہ ردعمل کی وجہ سے دوسرے مظلوم ورثہ کو بھی حوصلہ مل رہا ہے اور اب وہ بھی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کو تیار ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے اور عدالت کے رخ کو درست رکھے۔

اس واقعہ میں مسلمانوں کے لیے خصوصاً اور ملک میں بسنے والے تمام شہریوں کے لیے عموماً عبرت وموعظت کے کئی پہلو ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ خدا کو اپنی اس کائنات میں ظلم و جور پسند نہیں

ہے؛ چونکہ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے؛ اس لیے انسان کے ہاتھ پاؤں باندھ نہیں دیئے گئے ہیں، کہ وہ زورآوری اور ظلم وزیادتی پر قادر ہی نہ رہے؛ لیکن خالق کائنات کو اس کے لگائے ہوئے گلشن میں یہ رویہ پسند نہیں ہے، وہ نہیں چاہتا کہ یہ گلستان پھولوں کے بجائے کانٹوں کی جگہ بن جائے، یہ بستی محبت کے بجائے نفرت کی بستی بن جائے، یہاں عدل وانصاف کے بجائے ظلم و بربریت کا دور دورہ ہو جائے، اسی لیے قرآن وحدیث میں جس قدر ظلم وجور کی مذمت کی گئی ہے، شرک کے علاوہ شاید ہی کسی اور گناہ کی اس درجہ مذمت کی گئی ہو؛ بلکہ خود شرک کو بھی ظلم کی فہرست میں شامل رکھا گیا ہے، ﴿ **إن الشرک لظلم عظیم** ﴾ (لقمان :۱۳)

قرآن مجید میں کم از کم ایک سونوے بار مختلف پیرایہ میں ظلم کو ایک مذموم عمل قرار دیا گیا ہے اور اس سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے، حدیثیں تو اس سلسلہ میں بے شمار ہیں، جن میں دو باتیں بہت اہم ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق کے بارے میں ہونے والی کوتاہیوں کو تو معاف فرما سکتے ہیں، کہ وہ غفور رحیم ہیں؛ لیکن بندوں کے حقوق میں ہونے والی زیادتیاں اللہ کی طرف سے معاف نہیں ہوتیں، اور قیامت کے دن مظلوں کو ان کا بدلہ دلایا جاتا ہے، چونکہ قیامت میں چلنے والا سکہ انسان کے اعمال ہیں؛ اس لیے اعمال ہی کی صورت میں مظلوم کو بدلہ دیا جائے گا، پہلے ظالم کی نیکیاں مظلوم کے نامۂ اعمال میں شامل کی جائیں گی، اور اگر یہ کافی نہ ہوں تو پھر مظلوم کے گناہ ظالم کے نامۂ اعمال میں داخل ہوں گے، (بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۴۹) ایک روایت میں ایسے ہی شخص کو حقیقی مفلس قرار دیا گیا ہے، کہ جب وہ خدا کے دربار میں پہنچے گا تو بہت سی نیکیاں اس کے ساتھ ہوں گی، لیکن حق داروں کے حقوق چکاتے چکاتے بالآخر اتنے گناہوں کا بوجھ اس پر ہو جائے گا کہ وہ دوزخ میں لے جایا جائے گا، اللہ تعالیٰ ایسی مفلسی سے ہر شخص کو بچائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مظلوم اپنے جسم وجثہ کے لحاظ سے تو کمزور وعاجز ہوتا ہے؛ لیکن اس کی آہ میں خدا نے بڑی طاقت رکھی ہے، ایسی طاقت جو فولاد کو بھی پگھلا دے اور پتھروں کو بھی ریزہ ریزہ کردے؛ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مظلوم کی بددعاء سے بچو؛ کیوں کہ وہ آگ کی طرح آسمان کی طرف چڑھتی ہے، (مستدرك حاكم :۱/۲۹) ایک روایت میں ہے کہ مظلوم کی بددعاء اور خدا کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے، ''**اتق دعوة المظلوم فإنه لیس بینها و بین**

اللّٰہ حجاب ''(بخاری، حدیث نمبر:۱۴۹۶)ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ تین شخص وہ ہیں جن کی دعاء رد نہیں ہوتی، پھر آپ ﷺ نے ان میں مظلوم کی بد دعاء کا ذکر فرمایا، (بیہقی فی شعب الإیمان :۲/۳۹۹)اسی کو علامہ اقبال نے کہا ہے:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

مومن کا کام یہ ہے کہ وہ پیش آنے والے واقعات کو خود اپنے کردار کے لیے آئینہ بنالے، وہ خار راز میں سے بھی — اگر مل جائے — تو عبرت وموعظت کے پھول چن لے، وہ کیچڑ سے بھی ہیرے تلاش کر لے، اور اپنی زندگی میں اس سے فائدہ اٹھائے، آج ہمارے سماج میں مختلف نوع کے مظالم عام ہیں، قتل اور اقدام قتل کے واقعات دن رات پیش آتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ بعض دفعہ ان خونی رشتوں کو بھی خاطر میں نہیں لایا جاتا جن کی الفت ومحبت سے مثال دی جاتی ہے، مالی حقوق کا غصب کرنا تو عام ہے، یہاں تک کہ بھائی بھائی کی زمین پر قبضہ کر لیتا ہے، والدین اور اولاد کے درمیان چند سکوں کے کے لیے دراڑیں آجاتی ہیں، یتیم، بھتیجے اور بھتیجیوں کے حقوق سلب کر لیے جاتے ہیں، بہنوں کو ان کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے، والدین خود بیٹیوں کو غیر منقولہ جائیداد میں حصہ دینا نہیں چاہتے، پارٹنر شپ میں خیانت اور بدعہدی عام ہے، غرض کہ ہمارے معاشرہ میں ظلم کی مختلف صورتیں کثرت سے مروج ہیں، ہمیں اس صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہیے، ہمیں اپنے دشمنوں سے تو بہت سی شکایتیں ہیں؛ لیکن ہم نے خود ایک دوسرے کے ساتھ کیا رویہ اختیار کر رکھا ہے؟

اس واقعہ میں دوسرا پہلو عبرت کا یہ ہے کہ مجرم خواہ کتنا ہی طاقت ور ہو، وہ جرم کے نشانات کو پوری طرح مٹا نہیں پاتا، قرآن مجید نے کہا ہے کہ انسان رائی کے دانہ کے برابر بھی نیکی کرے تو قیامت کے دن اسے دیکھے گا، اور اگر اتنی ہی برائی کا مرتکب ہو تب بھی قیامت میں اسے پائے گا:

﴿فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ ، وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ﴾ (الزلزال :۷،۸)

قرآن وحدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمین اور انسان کا جسم بھی انسان کی مجرمانہ

حرکتوں کا گواہ بن جاتا ہے، یہ گواہی دنیا میں بھی سامنے آرہی ہیں، جس کی ایک مثال اس وقت جینٹک ٹیسٹ ہے، اور آخرت میں تو یہ گواہی اور زیادہ واضح ہوجائے گی، یہاں تک کہ یہ تمام بے زبان چیزیں خود گویا ہوجائیں گی اور جرم کی کہانی اس طرح سنائیں گی کہ کوئی مجال انکار باقی نہیں رہے گا، یہ حقیقت جرم سے باز رکھنے میں معاون بنتی ہے، ظلم کرنے والے ہاتھ کو کبھی بھی مطمئن نہیں ہونا چاہیے کہ آج اگر اس کے پنجوں کو تھامنے والی طاقت موجود نہیں ہے تو وہ ہمیشہ اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے گا اور قدرت کے طاقت ور ہاتھوں سے بھی پنجہ آزمائی کر سکے گا؛ کیوں کہ:

جو چپ رہے گی زبان خنجر
لہو پکارے گا آستیں کا

تیسری بات یہ ہے کہ انسانی اخوت کا بھی تقاضا ہے اور اسلامی اخوت کا بھی، کہ مظلوموں کو ظالم کے بھروسہ پر چھوڑ نہیں دیا جائے، بلکہ مظلوم کی مدد کرنے اور ظالم کے ہاتھ تھامنے کی کوشش کرے، رسول اللہ ﷺ نے ایک بار ارشاد فرمایا: تم اپنے بھائی کی مدد کرو، چاہے ظالم ہو یا مظلوم، صحابہ ؓ نے عرض کیا کہ مظلوم کی تو ہم مدد کریں گے، ظالم کی کیسے مدد کریں گے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس طرح کہ تم ان کا ہاتھ تھام لو''تأخذ فوق یدیہ ''(بخاری، حدیث نمبر:۲۴۴۴) حضرت براء بن عازب ؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ہمیں سات باتوں کا حکم دیا اور ان میں سے مظلوم کی مدد کو بھی شمار کیا، (بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۴۵)، اس مضمون کی مختلف روایتیں آپ ﷺ سے منقول ہیں؛ کیوں کہ مظلوم کی مدد ایک شخص کی مدد نہیں ہے؛ بلکہ پورے سماج کی مدد ہے، جیسے درندہ کے منہ سے جب ایک بار انسان کا خون لگ جاتا ہے تو اس کی لذت اسے مستقل آدم خور بنا دیتی ہے، اسی طرح جب کوئی شخص ایک دفعہ ظلم کرتا ہے اور کوئی ہاتھ اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش نہیں کرتا، دیکھنے کے باجود کوئی زبان ٹوکنے کو تیار نہیں ہوتی، آنکھیں اس پر نفرت اور تحقیر کے تیر نہیں پھینکتیں اور سماج میں وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتا تو اس کا حوصلہ بڑھتا رہتا ہے، اور اس کی مثال اس پاگل کتے کی ہوجاتی ہے جو ہر گذرنے والے کو کاٹ کھانے کی تاک میں رہتا ہے۔

مظلوم کی مدد ہاتھ پاؤں سے بھی ہوتی ہے، پیسوں سے بھی ہوتی ہے، اور قانون سے بھی ہوتی ہے، دہلی میں ہندو سکھ فساد 1984ء میں ہوا؛ لیکن سکھ کمیونٹی نے اس زخم کو فراموش نہیں کیا، وہ

برابر قانون کی لڑائی لڑتے رہے، یہاں تک کہ ظالموں پر شکنجہ تنگ ہو گیا، خود اس مقدمہ میں اگر سہراب الدین کے بھائی رباب الدین کھڑے نہ ہوتے اور انہوں نے مسلسل پیروی نہ کی ہوتی تو ہرگز یہ معاملہ روشنی میں نہیں آتا، اور مجرم کے چہرہ سے نقاب ہٹ نہیں پاتا، ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اس سلسلہ میں مربوط اور مسلسل کوشش کریں، اس طرح کے سینکڑوں فرضی انکاونٹر ہیں، جو ملک کے مختلف شہروں میں ہوتے ہیں، گجرات، کشمیر، حیدرآباد، دہلی اور ممبئی ہی میں ایسے واقعات جمع کئے جائیں تو کئی درجن ہو جائیں گے، اگر ان واقعات کی پہلے خود چھان بین کی جائے پھر قانون کی مدد لی جائے اور اس سلسلہ میں مالی وسائل خرچ کئے جائیں تو بہت سے ''ونجارا'' مجرم کے کٹہرے میں ہوں گے، اور اس کی وجہ سے مستقبل میں خونخوار آفیسروں کو ایسے جرائم کرتے ہوئے سو بار سوچنا پڑے گا، یہ اپنے مظلوم بھائیوں کی نتیجہ خیز اور ثمر آور مدد ہوگی!

ایک پہلو اور بھی قابل توجہ ہے، اگر کہیں طلاق کا یا حرمتِ نکاح کا کوئی واقعہ پیش آئے تو خواتین کے حقوق سے متعلق تنظیمیں بے چین ہو جاتی ہیں، اور ان کی بیان بازی کی مہم قابل دید ہوتی ہے، وہ ایسے مگر مچھ کے آنسو بہاتی ہیں کہ سخت سے سخت دل آدمی کی آنکھیں بھی نم ہو جائیں، لیکن کوثر بی کے بہیمانہ قتل کے واقعہ پر ان کی زبانیں گنگ ہیں اور ان کو حکومت گجرات کے خلاف احتجاج کرنے اور اس ظلم کو میڈیا کی اسکرین پر نمایاں کرنے کی کوئی فکر نہیں ہے، اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تنظیمیں عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں مخلص نہیں ہیں، یہ مذہبی اور اخلاقی قدروں کی باغی ہیں، اور جھوٹ کا سہارا لے کر ذرائع ابلاغ میں نمایاں ہونے کی خواہش مند رہتی ہیں، مسلمان خواتین کو کوثر بی واقعہ کے آئینہ میں ان کا حقیقی چہرہ دیکھنا چاہیے اور ان کے دامِ ہم رنگ زمین سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے!

۱۸/مئی ۲۰۰۷ء

روحانیت پر مادیت کا غلبہ

اللہ تعالیٰ نے انسان سے دو چیزیں متعلق کی ہیں، ایک اس کا مقصد ہے اور دوسری اس کی ضروریات ہیں، انسان کا مقصد خدا کی بندگی کا حق ادا کرنا ہے، ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴾ (الذاریات:۵۶) ''عبد'' کے معنی غلام کے ہیں، غلام خود اپنا مالک نہیں ہوتا، اس کی جان، اس کا مال، اس کا وقت اور سب کچھ اس کے مالک کی ملکیت ہوتی ہے، انسان اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے حوالہ کردے، یہی بندگی ہے، جب انسان حقیقی بندہ بن جاتا ہے تو اپنی تمام خواہشات کو خدا کی مرضیات کے تابع کر دیتا ہے، جس بات میں خدا کی خوشنودی ہوتی ہے وہی بات بندہ کو شادکام کرتی ہے، اور جس بات سے خدا ناراض ہوتا ہے، وہ بات بندوں کو بھی ناخوش کرتی ہے، اسی کو قرآن نے رضا سے تعبیر کیا ہے: ﴿ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ﴾ (البینہ :۸)

ضروریات وہ چیزیں ہیں جو دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں، انسان غذا اور پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اس کو ایک ایسی چھت بھی چاہیے جس کے سایہ میں وہ سکون حاصل کر سکے، اس کے لیے کپڑے بھی مطلوب ہیں ؛ تاکہ وہ اپنا تن ڈھک سکے، یہ ساری ضروریات مال کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں ؛ بلکہ خود بھی مال ہیں، اسی لیے رزق کو ''فضلِ خداوندی'' سے تعبیر کیا ہے، (الجمعہ :۱۰) یعنی وہ چیزیں ہیں جس پر انسانی زندگی کا بقاء موقوف ہے۔

خدا سے تعلق اور اس کی بندگی کا شعور، انسان کی روح کی غذا ہے؛ اسی لیے اسے 'روحانیت' کہا جاتا ہے اور انسان کی جسمانی ضروریات کی تکمیل مادی چیزوں سے ہوتی ہے، اسی لیے اسے 'مادّ' کہتے ہیں، دنیا کے بعض مذاہب وہ تھے، جس نے روحانیت کے لیے مادہ سے بالکل قطع تعلق کر لینے کو ضروری قرار دیا تھا، جیسے ہمیشہ روزہ رکھنا، نکاح نہیں کرنا، جسمانی راحت کی چیزوں سے فائدہ نہیں اٹھانا، یہ چوں کہ ایک غیر فطری بات ہے؛ اس لیے اسلام نے اس طریقۂ کار کو پسند نہیں کیا،

قرآن مجید میں اسے 'رہبانیت' کہا گیا ہے، اور بتایا گیا کہ یہ انسانوں کا من گھڑت طریقہ ہے، خدا نے کبھی اس کا حکم نہیں دیا: ﴿ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا ﴾ (الحدید: ۲۷)، اس کے مقابلہ میں وہ لوگ ہوئے، جنہوں نے دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ لیا، ان کو اس بات سے انکار ہے کہ کسی خالق و مالک نے ان کو پیدا کیا ہے، اور پھر ان کو دنیا کے اعمال کا جواب بھی دینا ہے، یہ زندگی گذارنے کا وہ تصور ہے جسے قرآن ''اتباع شہوات''، یعنی نفس پرستی سے تعبیر کرتا ہے، (النساء: ۲۷) گویا ان کو پورا یقین مادہ پر ہے۔

اسلام نے زندگی گذارنے کا جو طریقہ بتایا ہے، یہ ان دونوں کے درمیان ہے، اس نظامِ زندگی کا حاصل یہ ہے کہ انسان کی کوششوں کا اصل محور روحانی ترقی اور خدا کی خوشنودی کا حصول ہونا چاہیے؛ کیوں کہ انسان کا اصل مقصود یہی ہے: ﴿ إِنَّ صَلاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ﴾ (الأنعام: ۱۶۲) یعنی میری زندگی، میری موت اور میری عبادتیں اور نمازیں خدا ہی کے لیے ہیں، جو پوری کائنات کا رب ہے؛ لیکن دنیا کے اسباب بھی خدا ہی نے پیدا کئے ہیں اور اسی نے ان کو استعمال کرنے کی اجازت بھی دی ہے؛ اس لیے ان سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے؛ البتہ دنیا سے فائدہ اٹھانے میں دو باتوں کا لحاظ رکھا جائے، ایک یہ کہ شریعت نے حلال وحرام کی جو حدیں مقرر کی ہیں، انسان ان پر قائم رہے، وہ حلال اور جائز چیزوں سے فائدہ اٹھائے اور حرام سے اپنے آپ کو بچائے، دوسرے مادیت روحانیت پر غالب نہ ہو جائے، وہ بندۂ خدا کے بجائے بندۂ نفس نہ بن جائے، اور دنیا کی نعمتیں اسکی آرزؤں اور کاوشوں کا محور بن کر نہ رہ جائیں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے مستقل دعا سکھائی کہ اے اللہ! دنیا کو ہماری فکر کا سب سے بڑا مرکز نہ بنا دیجئے، ''**اللّٰهم لا تجعل الدنيا أكبر همنا**'' (سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۳۵۰۲)۔

یہ بات واقعی بڑی مشکل ہے کہ آدمی دنیا اور اسباب دنیا سے تعلق بھی رکھے؛ لیکن اس کا تعلق غالب نہ ہو جائے، اسی کو بعض صوفیاء نے ایک خوبصورت مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے کہ انسان دنیا کی نعمتوں کے درمیان اس طرح رہے، جیسے کشتی پانی میں چلتی ہے، کہ کشتی پانی سے بے نیاز نہیں ہو سکتی؛ لیکن پانی کو اپنے وجود سے باہر رکھتی ہے، اگر پانی کشتی کے اندر آ جائے تو اس کے لیے تباہی کا پیغام ہے، اسی طرح انسان مادہ سے فائدہ تو اٹھائے؛ لیکن اس کی محبت اس کے دل میں جاگزیں

نہ ہونے پائے ، رسول اللہ ﷺ کو امت کے بارے میں یہی خوف تھا، پچھلی قوموں کی تاریخ آپ کے سامنے تھی ، جب تک وہ تنگ دستی کی حالت میں تھے، اپنے خالق و مالک سے ان کا تعلق مضبوط تھا، ان میں خدا کی خوشنودی کے لیے جاں نثاری کا جذبہ تھا، تخت وتاج اور سیم وزر کی ان کی نگاہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں تھی ، لیکن جب فراخی اور خوشحالی آئی ، اور دنیا ان کے قدموں میں بچھنے لگی، تو آہستہ آہستہ روحانیت پر مادیت کو غلبہ حاصل ہونے لگا، اور خدا سے ان کا تعلق کمزور ہوتا گیا۔

چنانچہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ احد کے آٹھ سال بعد شہداء احد کے لیے اس طرح دعاء فرمائی جیسے آپ زندہ اور مردہ سب کو وداعی دعاء دے رہے رہوں، پھر آپ ﷺ ممبر پر بیٹھے اور خطاب فرمایا:

''میں تم لوگوں سے آگے جاتا ہوں اور تم پر گواہ ہوں ، اب میری تم سے ملاقات حوض پر ہوگی ، اور میں اُسے اِس وقت بھی دیکھ رہا ہوں ، مجھے اس بات کا خوف نہیں ہے کہ تم شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے ؛ لیکن مجھے تم پر دنیا کا ڈر معلوم ہوتا ہے کہ تم اس کے بارے میں ایک دوسرے سے آگے نہ بڑھنے کی کوشش کروگے ، یہ میرے لیے رسول اللہ ﷺ کا آخری دیدار تھا''

(بخاری، حدیث نمبر:۴۰۴۲، کتاب المغازی، باب غزوۃ اُحد)

ایک دفعہ بحرین سے ڈھیر سارا مال آیا، اس موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خدا کی قسم مجھے تم پر فقر و محتاجی کا اندیشہ نہیں ہے ؛ البتہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ تم پر دنیا اس طرح پھیلا دی جائے ، جیسے تم سے پہلوں پر پھیلائی گئی تھی ، پھر تم ان کے بارے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اور جیسے اس مال نے ان لوگوں کو ہلاک کیا تھا، تم لوگوں کو بھی ہلاک کر دے:

'' و لكن أخشى أن تبسط الدنيا عليكم ، كما بسطت على من كان قبلكم ، فتنافسوها ، كما تنافسوها ، فتهلككم كما أهلكتهم '' (الترغيب و الترهيب :۱۴۱/۵)

جب سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دربار میں فتح ایران کے بعد کسریٰ کا خزانہ آیا، تو مدینہ میں جشن کا منظر تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں اشکبار تھیں، لوگوں کو اس پر حیرت ہوئی تو آپ

نے فرمایا کہ جب بھی کسی قوم میں دولت کی افراط ہوتی ہے تو ان میں باہمی عداوات اور بغض و کدورت پیدا ہوجاتی ہے،''لم يؤت هذا قوم قط إلا أورثهم العداوة و البغضاء''۔

(بیھقی :۶/۳۵۸۸)

رسول اللہ ﷺ امت پر جس بات پر اندیشہ رکھتے تھے، آج اسے سر کی آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے، مادیت کے روحانیت پر غلبہ کے بہت سے مظاہر ہیں، جو دن رات سامنے آتے رہتے ہیں، انہیں میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کی روحانی ضرورتوں پر جو خرچ ہوتا ہے، اسے ایک طبقہ فضول سمجھتا ہے، اس کا خیال ہے کہ اگر یہ سرمایہ امت کی مادی ضرورت کے لیے خرچ کیا جاتا اور اس کی معاشی سطح کو اونچا کیا جاتا تو یہ زیادہ مفید بات ہوتی، اسی لیے بہت سے لوگ مدارس اور دینی تنظیموں اور کاوشوں پر ہونے والے اخراجات کو امت کے لیے ایک بوجھ سمجھتے ہیں، ان کا تصور ہے کہ اگر یہی رقم مسلمانوں کے لیے میڈیکل کالج، انجینیر نگ کالج اور فنی تعلیمی اداروں پر خرچ کی جاتی تو بہتر ہوتا اور قوم کو اس کا زیادہ نفع پہنچتا، دینی بیداری لانے اور روحانی اقدار کو فروغ دینے کے لیے مختلف مذہبی تنظیموں کی طرف سے اجتماعات رکھے جاتے ہیں، ایسے ہی اجتماعات میں ایک وہ 'تبلیغی اجتماعات' ہیں جو کئی سالوں کے توقف کے بعد مختلف صوبوں میں منعقد ہورہے ہیں، ان اجتماعات سے سیکڑوں جماعتیں جو ہزاروں افراد پر مشتمل ہوتی ہیں، مسلمانوں میں دینی محنت کے لیے نکلتی ہیں، اور گاؤں گاؤں پہنچ کر لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلاتی ہیں، ان محنتوں نے بے طلبوں تک دین کے پہنچانے اور دیہات وقریہ جات کے لوگوں کو اسلام پر باقی رکھنے اور ارتداد سے بچانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے، ابھی چند دنوں پہلی حیدرآباد میں بھی آندھراپردیش کی سطح پر اجتماع منعقد ہوا؛ لیکن کچھ ایسے لوگوں نے جو انفاق کے جذبہ سے محروم ہیں، اور جن کے سرمایہ کو خدا نے دین کے فروغ کے لیے قبول نہیں کیا ہے، پمفلٹ شائع کئے کہ جو رقم اس بڑے اجتماع پر خرچ کی جارہی ہے، اس میں اتنے میڈیکل کالج قائم کئے جاسکتے تھے، اتنے طلباء ڈاکٹر بن سکتے تھے، اور اتنے بچوں کو انجینئر بنایا جاسکتا تھا، نیز اتنے مسلمانوں کو غربت کی سطح سے اوپر اٹھایا جاسکتا تھا۔

یہ گرچہ ایک مخصوص واقعہ ہے؛ لیکن درحقیقت اس ذہنیت کا عکاس ہے جو آہستہ آہستہ

ہمارے معاشرہ میں پروان چڑھ رہی ہے، جس میں روحانیت اور تعلق مع اللہ کی اہمیت نہیں ہے؛ بلکہ مادیت کی اہمیت ہے، مسلمانوں میں ایمان کی روح بیدار ہو، بے نمازی نمازی بنیں، حلال و حرام کی پہچان پیدا ہو، نفس اور مادہ کا پرستار بننے کے بجائے انسان خدا کا پرستار بن جائے، ان کے بجائے اہمیت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کے پاس اچھے مکان ہوں، اچھی دوکانیں ہوں، کاروبار میں وہ آگے ہوں، اور مادی زندگی میں ان کو سبقت حاصل ہو، ظاہر ہے ایسے لوگوں کو دینی اداروں، تنظیموں، جماعتوں اور اجتماعات میں ہونے والے اخراجات فضول نظر آئیں گے۔

اسلام معاشی ترقی کے خلاف نہیں ہے، قرآن مجید میں زکوۃ دینے کا حکم بیسوں آیات میں ہے، اور زکوۃ لینے کا استحقاق صرف ایک آیت میں بیان کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اس موقف میں ہونا چاہیے کہ وہ دوسروں کو زکوۃ دیں نہ یہ کہ خود زکوۃ لیں؛ لیکن یہ روحانی قدروں کے انحطاط اور اس سے محرومی کی قیمت پر نہیں، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد معاشی ترقی نہیں تھا، روحانی ترقی تھا، اور اس امت کو بھلائی کی دعوت دینے کے لیے بھیجا گیا ہے، نہ کہ کاروبار کی دعوت دینے کے لیے (آل عمران: ۱۱۰) —— جو لوگ اس مریضانہ ذہن سے سوچتے ہیں، ان کو غور کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے پورے عالم کے صاحبِ استطاعت مسلمانوں کے لیے حج فرض فرمایا ہے؛ حالاں کہ یہ بات اللہ کے علم میں تھی کہ موجودہ دور میں ایک حج پر ایک لاکھ روپے کے اخراجات آئیں گے، اللہ تعالیٰ نے عمرہ کا حکم دیا ہے؛ حالاں کہ یہ بات اللہ کے علم میں تھی کہ ہمارے اس دور میں ایک شخص کے عمرہ کرنے کا خرچ ۳۵، ۴۰ ہزار روپے تک پہنچ جائے گا اور عورت کے لیے محرم کی شرط کی وجہ سے حج وعمرہ کے اخراجات دوگنا ہو جائیں گے، جس میں کسی غریب کا مکان بن سکتا تھا، اسی طرح قربانی کو واجب قرار دیا گیا، ایک ہی دن میں پوری دنیا میں کروڑوں جانور ذبح کئے جاتے ہیں، بعض اوقات ایک گھر میں دس دس قربانیاں واجب ہوتی ہیں، اگر ان کی قیمت بے روزگار لوگوں کو روزگار میں لگانے کے لیے خرچ کی جاتی یا غریبوں کے لیے مکان کی تعمیر پر صرف ہوتی تو کتنے لوگ روزگار سے لگ جاتے اور کتنے سارے بچوں کی فیس کا انتظام ہو جاتا؟

خدا نے جو انسان کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے خود انسان سے بھی زیادہ واقف ہے، ایسا حکم نہیں دیا؛ بلکہ ایسی عبادتوں کا حکم دیا، جن سے ایمان میں تازگی آتی ہے، جب ایک مسلمان حرم

اقدس میں پہنچتا ہے اور خدا کی نشانیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، جن سے اللہ کے نبیوں اور رسولوں کی یاد متعلق ہے تو خدا پر اس کا یقین بڑھتا ہے، اس میں روحانی قوت جاگ اُٹھتی ہے، اسی طرح قربانیوں کے ذریعہ انسان اللہ تعالیٰ سے اپنے عہد کی تجدید کرتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خدا کے لیے قربان کرنے کو تیار ہے، اس عمل سے ہر صاحبِ ایمان کے ذہن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کی یاد تازہ ہوتی ہے، اور ایک نیا جذبہ اور حوصلہ اس کے اندر بیدار ہوتا ہے، اگر مادی ترقی روحانی ترقی سے زیادہ اہم ہوتی تو دین میں اس طرح کے احکام نہیں دیئے گئے ہوتے؛ اس لیے یہ ایک بیمار سوچ ہے اور اس کا سرچشمہ مغربی تہذیب ہے، مغرب میں مادیت کے غلبہ کی وجہ سے روحانی قدروں کی کوئی اہمیت نہیں ہے، ان کا خیال ہے کہ انسان کی حیثیت بھی ایک ترقی یافتہ حیوان کی ہے، وہ اسی لیے پیدا ہوا ہے کہ دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے آنکھ بند کر کے فائدہ اٹھائے؛ کیوں کہ جو کچھ ہے وہ اسی دنیا کے لیے ہے، اس دنیا سے آگے کچھ اور نہیں ہے، اس تصور کے ساتھ ظاہر ہے کہ روحانیت اور خدا طلبی کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی، افسوس کہ مغرب زدہ مسلمان اس وقت ایک طرح کی دوعملی کے شکار ہیں، دل میں چھپی ہوئی ایمان کی چنگاری انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ دین کا لبادہ اتار پھینکیں، دوسری طرف مادیت کی نہ ختم ہونے والی پیاس نے انہیں ایسا بے قرار کر رکھا ہے کہ روحانیت اور خدا پرستی کی عظمت ان کے دلوں سے نکل گئی ہے، موجودہ ماحول میں اس مادہ پرستانہ ذہن کا مقابلہ کرنا اور مسلمانوں کو اس سے بچانا نہایت ضروری ہے !

۲۵/مئی ۲۰۰۷ء

عصر حاضر کے ابرہہ کی بکواس

قلم لرزہ براندام ہے اور زبان کا جگر شق ہوا چاہتا ہے، کیا لکھوں؟ اور کیوں کر لکھوں؟؟؟ صلیبی اور صہیونی طاقتوں کا بغض وعناد اب بہ بانگ دہل اپنی بولی بول رہا ہے، ابھی تک تو دہشت گردی کا سہارا لے کر اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کیا جاتا تھا اور القاعدہ اور طالبان کے عنوان سے بے قصور مسلمانوں کو ظلم وجور کا ہدف بنایا جارہا تھا، اب کھل کر مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ پر حملہ کی بات کی جارہی ہے، ظلم اور مسلسل ظلم اور جور و ناانصافی کا شکار بننا گویا امت مرحومہ کا مقدر بن چکا ہے، مسلمان حکمرانوں کی غفلت شعاری، غیرتِ ایمانی سے محرومی اور باہمی انتشار وافتراق نے ایسا برا وقت دکھایا ہے کہ جس کا تصور بھی ایک صاحب ایمان کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہے!!

امریکہ میں ری پبلکن صدارتی امیدوار ’ٹام ٹانگریڈو‘ کا یہ بیان کہ امریکہ نیوکلیر حملہ کی مزاحمت کے لیے مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ پر حملہ کیا جائے گا، اتنا تکلیف دہ ہے کہ اس تکلیف کو الفاظ کا پیکر بھی نہیں دیا جاسکتا، یہ بغض وعناد کے وہ بول ہیں، جو صلیبیوں اور صہیونیوں کے اندرونی جذبات کو ظاہر کرتے ہیں اور جو نفرت انہوں نے اپنے دلوں میں چھپا رکھی ہے، وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے:

﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاء مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ أَكْبَرُ﴾ (آل عمران: ۱۱۸)

پھر اس جسارت انگیز بول پر سوائے امریکہ کے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی ایک وضاحت کے بقیہ مغربی طاقتوں کا سکوت اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اسلام کی عداوت میں یہ سب ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے ہوئے ہیں اور وقتاً فوقتاً مسلمانوں کے صبر کا امتحان لیتے رہتے ہیں۔

انسان کے لیے سب سے اہم چیز اس کے جذبات ہیں، انسانی حقوق اور آزادی کا جو نعرہ

آج لگایا جارہا ہے، اِن سب کی بنیاد انسانی جذبات کی پاسداری ہی پرتو ہے، مغرب نے اس میں اس قدر غلو کیا ہے کہ اگر کسی شخص کا دل چاہتا ہو کہ وہ بے لباس رہے، اور کوئی انسان جذبات کی رو میں بہہ کر قانونِ فطرت سے بغاوت کرنے لگے اور اپنے ہی ہم جنس سے شادی کرنا چاہے، تب بھی اس میں رکاوٹ نہیں ڈالتا، دنیا کے ہر مذہب اور ہر مہذب قانون میں عدل کے ساتھ انسانی جذبات کا پاس ولحاظ رکھا گیا ہے، اسلام نے اس کی اتنی زیادہ رعایت کی ہے کہ مشرکین جن دیویوں اور دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے، اسلام کی بنیادی تعلیم 'توحید' کے خلاف ہونے کے باوجود قرآن نے کہا کہ ان دیوتاؤں اور دیویوں کو برا بھلا نہ کہو:

﴿ وَلاَ تَسُبُّواْ الَّـذِيْنَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّهِ فَيَسُبُّواْ اللّهَ عَدْواً بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (الأنعام :۱۰۸)

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بہ کثرت اس کی مثالیں ملتی ہیں، ایک مسلمان اور ایک یہودی میں بحث ہوگئی کہ حضور ﷺ افضل ہیں یا حضرت موسیٰ علیہ السلام؟ معاملہ بحث ومباحثہ سے گذر کر ہاتھا پائی تک پہنچ گیا، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مقدمہ آیا؛ حالاں کہ آپ ﷺ کی فضیلت تمام رسولوں پر ہے اور یہ خود آپ ﷺ کے ارشادات سے ثابت ہے؛ لیکن آپ ﷺ نے اس وقت ہمسایہ یہودیوں کے جذبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس بحث سے اعراض کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جزوی فضیلت بیان کردی، کہ قیامت میں جب سارے لوگ بیہوش کردیئے جائیں گے اور پھر دوبارہ ہوش میں لائے جائیں گے تو سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوش میں آئیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بیہوش ہی نہ کئے جائیں۔

ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو یہودی کی بیٹی ہونے کا طعنہ دیا گیا، وہ رورہی تھیں، حضور ﷺ کو معلوم ہوا، تو آپ ﷺ نے تسلی دی اور فرمایا کہ تم کیوں نہیں کہتی ہو کہ موسیٰ میرے باپ ہیں، ہارون میرے چچا ہیں اور محمد ﷺ میرے شوہر ہیں، آپ ﷺ نے حضرت صفیہ، حضرت جویریہ اور حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہن سے نکاح فرمایا، یہ سب اپنے اپنے قبیلہ کے سردار کی صاحبزادیاں تھیں اور ان سے نکاح کا ایک منشأ یہ بھی تھا کہ ان کے اعزاز اور عزت نفس کا خیال رکھا جائے؛ کہ سردار قبیلہ کی بیٹی ایک ایسے شخص کے نکاح میں گئی ہے، جس کو پورے عالم کی سرداری عطا کی گئی ہے۔

انسان کی جذباتی وابستگی اور محبت وعقیدت کے بہت سے مراکز ہیں، سعادت مند اولاد کو اپنے والدین سے جو محبت وعقیدت ہوتی ہے، وہ محتاج اظہار نہیں، ماں باپ کو اپنی اولاد سے جذباتی تعلق ہوتا ہے، شاگرد کو اپنے استاذ سے احترام اور اعتقاد کی نسبت ہوتی ہے؛ لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ جذباتی وابستگی ہے، جو کسی شخص کو اپنے مذہب اور کسی امت کو اپنے نبی سے اور مذہب اور نبی سے مربوط مقدس مقامات سے ہوتی ہے، یہ مقامات اس کی چشم عقیدت کا سرمہ اور اس کے دل کے لیے محبت وگداز کو مہمیز کرنے والی علامات ہوتی ہیں، اس کے لیے ان پر اپنا لہو نثار کر دینا اور اپنے بال بچوں کو بھینٹ چڑھا دینا بھی مشکل نہیں ہوتا۔

مسلمانوں کے جو مذہبی مقامات ہیں، ان کو قرآن مجید نے 'شعائر اللہ' سے تعبیر کیا ہے، گویا یہ خدا سے تعلق کی علامات اور پہچانیں ہیں اور ان کا احترام ایمان کا حصہ اور تقویٰ کی علامت ہے: ﴿وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ (الحج :۳۲) مسلمان نہ ان مقامات کی بے حرمتی کا تصور کر سکتا ہے، اور نہ اسے برداشت کر سکتا ہے، اسلام نے جہاں مسلمانوں کو ان کے مذہبی مقامات کی توقیر واحترام کا حکم دیا ہے، وہیں دوسری قوموں کے مذہبی مقامات کے احترام کو بھی ملحوظ رکھا ہے؛ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت کی گئی ہے، وہاں مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجا کا ذکر کیا گیا ہے:

﴿ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ
وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيراً﴾

(الحج:۴۰)

رسول اللہ ﷺ نے بنو نجران سے جو معاہدہ کیا، اس میں یہ صراحت فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی اور نہ مذہبی امور میں کوئی مداخلت کی جائے گی، (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر:۳۰۴۱) عہد صدیقی میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ذریعہ حیرہ کا علاقہ فتح ہوا، اہل حیرہ کے لیے انہوں نے جو دستاویز تیار فرمائی، اس میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے چرچ اور گرجے منہدم نہیں کئے جائیں گے، امام ابو یوسفؒ نے اسے نقل کیا ہے۔ (موسوعة الخراج :ص:۱۴۳)

مسلمانوں نے ہمیشہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے سلسلہ میں اس رویہ کو قائم رکھا،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں شام اور فلسطین کا علاقہ فتح ہوا، جہاں عیسائیوں کے بڑے بڑے چرچ اور گرجا تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے حال پر رکھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب فتح بیت المقدس کے موقع سے وہاں تشریف لے گئے اور کلیسا کے متولی کی اجازت؛ بلکہ خواہش پر ایک چرچ میں نماز ادا کی، تو پھر اسی چرچ کے لیے ایک خصوصی دستاویز مرحمت فرمائی کہ کہیں مسلمان اس کو مسجد میں تبدیل کر دینے کی کوشش نہ کریں، اس کے بعد متولیان چرچ کی خواہش کے باوجود آپ نے چرچ میں نماز ادا نہیں فرمائی کہ مسلمان جبراً اس کو اپنی عبادت گاہ بنانے کی کوشش کریں گے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دمشق کی جامع مسجد تعمیر فرمائی تو اس سے متصل ایک چھوٹا سا چرچ تھا، آپ رضی اللہ عنہ نے عیسائیوں سے پیش کش کی کہ منہ مانگی قیمت لے کر مسجد کو دے دیں؛ تاکہ مسجد کے صحن کو وسعت دی جاسکے، مگر عیسائیوں نے نہیں مانا تو آپ خاموش ہو گئے، حضرت عمر بن عبد العزیز اپنے گورنروں کو ہدایت فرماتے تھے کہ مفتوحہ علاقوں میں کوئی کلیسا یا آتش کدہ منہدم نہ کیا جائے، مصر کا علاقہ جہاں اہرام مصر واقع ہے اور جس میں فرعون کے مجسمے بھی ہیں، عہدِ فاروقی ہی میں فتح ہو گیا؛ لیکن مسلمانوں نے عہدِ شرک کی ان یادگاروں کو منہدم کرنے اور مٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ آج تک یہ عجائب عالم مصر کی زمین پر موجود ہیں، یہی حال دوسرے علاقوں کا ہے، فتحِ بیت المقدس کے موقع سے سلطان صلاح الدین ایوبی نے بھی اسی اسوۂ فاروقی کو سامنے رکھا اور مذہبی عبادت گاہوں کو اپنے حال پر باقی رکھا؛ بلکہ ان کے لیے مسلمان حکمرانوں نے عطایا بھی دیئے، ہندوستان میں کتنے ہی مندر ہیں، جو ہزاروں سال سے موجود ہیں، مسلمانوں کے دورِ حکومت میں بھی وہ اسی آب و تاب کے ساتھ باقی رہے اور ان کی حفاظت ونگہداشت کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا، اسی طرح دوسری قوموں نے بھی مذہبی عبادتگاہوں کے تقدس کو ملحوظ رکھا ہے، صلیبی جنگوں میں جب ایک مرحلہ پر عیسائی غالب آئے اور بیت المقدس پر قابض ہوئے تو انہوں نے مسجد اقصیٰ کو ہاتھ نہیں لگایا، ہندوستان میں بہت سے ہندو راجاؤں نے اپنی سلطنت میں نہ صرف مسجدوں اور دوسری عبادتگاہوں کی حفاظت کی؛ بلکہ تعمیر بھی کرائی اور ان پر جاگیریں بھی وقف کیں، اس لیے مذہبی مقامات کا احترام تمام مہذب قوموں کا مشترکہ ورثہ ہے۔

یہودی اور عیسائی دنیا پر اس ناشائستہ بیان کی نسبت سے ایک مسلمان کو جو غصہ آسکتا ہے

اوراس کے جذبات کی جو کیفیت ہوسکتی ہے، وہ محتاجِ اظہار نہیں ہے؛ لیکن اس سے بھی زیادہ افسوس عالمِ اسلام پر ہے، ان کی زبانیں گنگ ہوچکی ہیں، ان کی غیرت دینی سوچکی ہے اور ہمت وحوصلہ نے ان سے منہ موڑ لیا ہے، وہ اب اتنی جرأت بھی نہیں رکھتے کہ ایسے جسارت انگیز بیان پر بھی امریکہ کی اجازت کے بغیر کوئی بیان جاری کریں، اوران کا بیان آزادانہ اور جرأت مندانہ ہو، پھر کسی عملی اقدام کی ان سے کیا خاک توقع کی جاسکتی ہے؟ عالمِ اسلام کے مادی وسائل پر مغرب کی گاڑی چل رہی ہے، مگر آج کوئی شاہ فیصل موجود نہیں ہے، جو مغربی دنیا کو پٹرول کی دھمکی دے سکے۔

عجیب بات ہے کہ امریکہ دہشت گردی کے نام پر پوری دنیا میں اپنے جوروستم کو جواز عطا کررہا ہے، لیکن کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی دہشت گردی ہوگی کہ اتنی بڑی امت کے مذہبی مقامات کو نشانہ بنانے کی بات کہی جائے اور وہ بھی ایسا شخص کہے جو ملک کے اعلیٰ ترین ذمہ دارانہ عہدہ کے لیے امیدوار ہے، قول وفعل میں کیا اس سے بھی بڑھ کر کوئی تضاد ہوسکتا ہے؟؟

۱۰/ اگست ۲۰۰۷ء

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا؟

اردو کے ایک شاعر کا مشہور مصرعہ ہے:

بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا ؟

آج کل بہت سے لوگ شہرت و ناموری کے اسی فلسفہ پر عمل کرتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں انہیں خوب جانا اور پہچانا جائے، ان کی شہرت دور دور تک پہنچے، اس مقصد کے لیے ایسے کام بھی کیے جا رہے ہیں، جو حیا، اخلاق اور انسانیت کے تقاضوں کے خلاف ہیں، اگر انسان کوئی ایسی تحریر لکھ دے، جس میں سماج اور روایت سے بغاوت ہو، تو خود بہ خود اس کا نام مشہور ہو جاتا ہے، دنیا میں آج کل مختلف اہل قلم سستی شہرت کے اس طریقہ کو آزما رہے ہیں، اور اگر ایسا کالم نگار مشرق سے تعلق رکھتا ہو اور خاص کر اس کا نام مسلمانوں جیسا ہو، تب تو مغرب میں فوراً ہی اس کی پذیرائی اور مقبولیت کا گراف کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے اور انعامات اور ایوارڈس کی بارش ہونے لگتی ہے، سلمان رشدی وغیرہ کا نام اس سلسلہ میں ہر شخص جانتا ہے اور اب اسی صف میں بنگلہ دیش کی ادیبہ تسلیمہ نسرین بھی شامل ہیں، تسلیمہ کے ماں باپ نے تو اس کا نام اس نیک نیتی کے ساتھ تسلیمہ رکھا ہوگا کہ وہ اپنا سر تسلیم اپنے پروردگار کے سامنے جھکائے رکھے گی؛ لیکن انہیں کیا خبر رہی ہوگی کہ یہ پیشانی خدا کے بجائے شیطان کے سامنے اور شیطان نما انسانوں کے سامنے خم ہونے والی ہے، انہوں نے سوچا ہوگا کہ اس پیشانی میں خدا کی خوشنودی کے لیے سجدے تڑپیں گے، لیکن شاید ان کے تصور میں بھی نہیں رہا ہوگا کہ اس سر میں بے حیائی اور بے شرمی کا سودا سمجھا جائے گا اور اس کا قلم اسلامی اور اخلاقی قدروں کی حمایت میں اٹھنے کے بجائے بے حیائی اور بے شرمی کا نقیب بن جائے گا۔

تسلیمہ نسرین نے ایسے ناول لکھے ہیں، جن میں شرم وحیاء کی چادر کو تار تار کرنے کی کوشش

کی گئی ہے، جن میں اسلامی اور مذہبی قدروں کا مذاق اڑایا گیا ہے، اگر یہ تحریر کسی مرد کے قلم سے وجود میں آتی تو شاید کم باعث تعجب ہوتا؛ کیوں کہ مردوں کی نفسیات یہ ہے کہ وہ اپنی ہوس کے عفریت کو آسودہ کرنے کے لیے عورتوں کے لباسِ حیا سے کھیلتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے جسم پر ایک تارِلباس بھی باقی نہ رہے؛ لیکن عورتیں خود اپنی بے آبروئی پہ کمر بستہ ہوں اور اپنے آپ کو مردوں کا کھلونا بنانے پر بخوشی آمادہ ہوں، اس سے زیادہ افسوس کی بات اور کیا ہوسکتی ہے؟ ان کے اس جرم نے انہیں اپنے وطن سے راہ فرار اختیار کرنے اور جلاوطن ہونے پر مجبور کردیا، اس وقت وہ ہندوستان کے صوبہ مغربی بنگال میں مقیم ہیں، اگر مستقبل قریب میں ان کی حیاباختہ تحریروں پر نوبل ایوارڈ یا کوئی اور ایوارڈ مل جائے تو حیرت نہیں ہونی چاہیے؛ کیوں کہ مغرب میں اس وقت شرم وحیا عار کی چیز ہے اور بے حیائی قابلِ افتخار وانعام، ایسی مصنفہ کے لیے صحیح پناہ گاہ مغربی معاشرہ ہی ہے، حکومت ہند کا ایسی عورتوں کو اپنے یہاں پناہ دینا انتہائی افسوس ناک؛ بلکہ شرم ناک ہے، ہندوستان کی ایک روایت رہی ہے، یہ روایت اخلاقی قدروں کے پاس ولحاظ کی ہے، یہ روایت شرم وحیا کی ہے اور یہ روایت عورتوں کا احترام اور اس کی عزت وناموس کی رعایت کی ہے، رامائن کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ رام جی کے بھائی لکشمن اپنی بھابھی کو پہچان نہیں سکے، انہوں نے کہا کہ میں نے اپنی نگاہ کبھی بھابی کے قدموں سے اوپر نہیں اٹھائی، ہمارے ہندو بھائیوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ ہے ان کی تہذیبی روایت، یہ تہذیب کتنی روشن تہذیب ہے، اس میں کتنا وقار ہے، اس میں انسانی قدروں کا کتنا پاس ولحاظ ہے اور یہ اخلاق کی کتنی اعلیٰ سطح ہے، کیا ہم اسے چھوڑ کر مغرب کی اس تہذیب کو قبول کرنا چاہتے ہیں، جو انسانوں اور حیوانوں کے درمیان امتیاز نہیں رکھتی، جو انسان کو ایک ایسی مخلوق کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، جس کے پاس پیٹ اور نفسانی خواہشات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

تسلیمہ نسرین نے ایک پبلشر کی دعوت پر ابھی چند دنوں پہلے حیدرآباد کا خفیہ دورہ کیا اور اپنی ''شدھ'' نامی کتاب کے تلگو ایڈیشن کی تقریب رسم اجراء میں شرکت کی ناکام وناتمام کوشش کی، اس واقعہ نے مسلمانوں کے تمام طبقات کو صدمہ سے دوچار کیا اور بعض حضرات نے اس میٹنگ میں گڑبڑ بھی کی، جن لوگوں کو بعد میں اطلاع ملی، انہوں نے بھی اخباری بیانات کے ذریعہ

غیظ وغضب کا اظہار کیا، اس پر انگریزی ذرائع ابلاغ کافی برہم ہیں، ان کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا یہ اقدام اظہار خیال کی آزادی کے مغائر ہے اور مسلمانوں کی روایتی شدت پسندی اس اقدام کے پیچھے کارفرما ہے؛ لیکن کیا اظہار خیال کی آزادی کا یہی مطلب ہے؟ کیا اظہار خیال کی آزادی یہ ہے کہ آپ سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کا گالی دینا شروع کردیں اور کہیں کہ ہمیں اظہار خیالی کی آزادی ہے، ایسی آزادی انسانیت کے لیے نفع بخش ہے یا نقصان دہ؟ اسے سوچنے کی ضرورت ہے۔

آزادی فطرت انسانی کی آواز ہے، غلامی اور قید و بند سے انسانی طبیعتیں اِبا کرتی ہیں؛ لیکن اگر یہ آزادی غیر محدود ہوجائے اور اپنی حدود سے باہر چلی جائے تو یہ انسانی سماج کے لیے اتنی نقصان دہ بات ہے؛ کہ شاید اس سے زیادہ نقصان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا؛ اسی لیے ایک صاحبِ نظر کا قول مشہور ہے'' کہ آپ لاٹھی چلانے میں آزاد ہیں؛ لیکن یہ آزادی وہیں تک ہے جہاں کہ آپ کی لاٹھی کسی اور شخص کی ناک سے ٹکراتی نہ ہو''، دنیا میں جو قوانین بنائے جاتے ہیں، ان کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسان کی آزادی کی حدود مقرر کردی جائیں، انسان کی خواہشات اتنی آگے نہ بڑھ جائیں کہ دوسروں کے حقوق متأثر ہونے لگیں، انسان اپنی آزادی کی سرحدوں کو وسیع کرنے کے لیے دوسروں کو غلام بنانا شروع نہ کردے، قیود و حدود کے بغیر آزادی انسان کے لیے رحمت کے بجائے زحمت ہے، جو ممالک جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں، ان کے یہاں بھی اظہار خیال کے بارے میں کچھ پابندیاں ضرور ہیں، بہت سے عیسائی ملکوں میں حضرت عیسی علیہ السلام کی شان میں گستاخی اور بدکلامی کو جرم قرار دیا گیا ہے، ہندوستان ہو یا کوئی اور ملک، اگر کوئی ایسی تحریر لکھی گئی ہو جو بغاوت پر اکساتی ہو، تو یقیناً ایسے قلم کار کو سنگین مجرم سمجھا جائے گا، اسی طرح؛ بلکہ اس سے بڑھ کر انسان کے مذہبی جذبات کا معاملہ ہے، انسان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگنے سے جو تکلیف پہنچتی ہے، وہ کسی بھی ایذا رسانی سے بڑھ کر ہے، بشرطیکہ وہ مذہب کے معاملہ میں سنجیدہ بھی ہو، جو لوگ اپنے دل میں مذہب اور فکر وعقیدہ کے بارے میں سنجیدہ ہی نہ ہوں، ظاہر ہے کہ ان کے لیے مذہب کی تعریف میں کوئی بات کہی جائے یا مذمت میں، دونوں برابر ہیں؛ اس لیے ملک و وطن کے احترام کو جیسے اظہار خیال کی آزادی سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، اسی طرح مذاہب اور مذہبی شخصیات کو بھی اس دائرہ سے مستثنیٰ رکھا جانا چاہیے اور ایک آوارہ خیال مصنف کے خیال کو لاکھوں اور کروڑوں انسانوں

کے جذبات پر ترجیح نہیں دینی چاہیے۔

اسلام مذہب کے معاملہ میں جبر و زبردستی کا قائل نہیں ہے، قرآن نے واضح طور پر اعلان کر دیا ہے کہ دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں: ﴿ لاَ إِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ﴾ (البقرہ :۲۵٦) لیکن اس آزادی کا تعلق دین میں داخل ہونے سے ہے، کسی دین و مذہب کو برا بھلا کہنے سے نہیں، اسلام نے صحافت اور تالیف کے بھی اصول مقرر کیے ہیں، جس کی روح یہ ہے کہ انسان کے قلم کو اچھی باتوں کا داعی ہونا چاہیے اور بری باتوں کو روکنے کے لیے کوشاں ہونا چاہیے:

﴿ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ﴾ (آل عمران :۱۱۰)

یہ بھی ضروری ہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ حقیقت اور سچائی پر مبنی ہو، جھوٹ اور دروغ گوئی نہ ہو، خواہ اسے ایک سنجیدہ کتاب کے لب و لہجہ میں لکھا جائے یا ناول اور افسانہ کے اسلوب میں، بہر حال اسے جھوٹ سے محفوظ ہونا چاہیے، نہ وہ کسی فرد کے بارے میں جھوٹ ہو، نہ کسی سماج کی جھوٹی تصویر پیش کرتا ہو، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم جھوٹ سے خوب بچو؛ کیوں کہ جھوٹ برائی تک پہنچا دیتا ہے اور برائی انسان کو دوزخ میں لے جاتی ہے:

" إياكم و الكذب فإن الكذب يهدي إلى الفجور و الفجور
يهدي إلى النار " (أبو داؤد عن عبد الله ﷺ، حدیث نمبر:۴۹۸۹،
كتاب الأدب ، باب في التشديد في الكذب)

معاشرہ کو شائستہ اور مہذب رکھنا اور اسے انسانی اور اخلاقی دائرہ میں رکھتے ہوئے دنیا میں رہنے کا مزاج بنانا اسلام کی سماجی تعلیمات کا خاص مقصد ہے؛ اسی لیے قرآن نے اس بات کو سختی سے منع کیا ہے کہ ایسی باتیں کہی جائیں یا لکھی جائیں، جن سے بے حیائی کی باتوں کا چرچا ہوتا ہو اور برائی پھیلتی ہو؛ کیوں کہ جب معاشرہ میں کسی برائی کا ذکر ہونے لگتا ہے، تو اس سے بھی برائی کا رجحان فروغ پاتا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں برائی کی باتیں پھیلانے والوں کے لیے سخت عذاب کی خبر دی گئی ہے:

﴿ إِنَّ الَّـذِيْـنَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِيْ الَّذِيْنَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ﴾ (النور :۱۹)

اظہارِ خیال کی آزادی کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو کسی گروہ کی تذلیل اوراس کے استہزاء وتمسخر کے لیے استعمال کریں اوراپنی تحریروں میں کسی سماج سے پیدا ہونے والی ناراضگی کا بخار نکالیں ، یہ بہت ہی اوچھی اورانتہائی غیر شریفانہ حرکت ہے،اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا:تم طعن و تشنیع سے بچو، برے القاب سے ایک دوسرے کا ذکر نہ کرو،ایمان لانے کے باوجودایسا عمل نہایت ہی بری بات ہے:

﴿ وَلَا تَـلْـمِـزُوا أَنـفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الاِسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيْمَانِ ﴾ (الحجرات :۱۱)

ایک اورموقع پرفرمایا گیا کہ کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَى أَن يَكُونُوا خَيْراً مِّنْهُمْ ﴾ (الحجرات :۱۱)

اہل قلم کو یہ بات بھی زیب نہیں دیتی کہ وہ انسان کی نجی زندگی کواظہارِخیال کی آزادی کے نام پرطشت ازبام کریں،اللہ نے انسان کی سرشت میں خطائیں رکھی ہیں،انبیاء کےسوا کوئی انسان نہیں ہے جوانسانی کمزوریوں سے مبرا ہو،اردوزبان کے بعض ناول نگار —— جن کے نام سے اہل علم واقف ہیں —— نے اپنی نجی زندگی کے واقعات کوناولوں کا موضوع بنایا اوراس آپ بیتی یا جگ بیتی کو کچھ اس طرح لکھا کہ حیا کوشرمسار ہونا پڑا اوران تحریروں نے آوارہ طبیعت لوگوں کے لیے مرغوب غذا کا کام کیا،سوچئے کہ اظہارِخیال کی یہ آزادی انسانی سماج کے لیے فائدہ مند ہے یا نقصان دہ؟ یہ انسان کو جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے یا تباہی وبربادی کی طرف لے جاتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ کوئی شخص کسی کے گھر میں بلااجازت جھانکے،تو گھر والوں کے لیے جائز ہے کہ ایسے بدقماش لوگوں کی آنکھیں پھوڑ دیں:

’’ مـن اطـلـع عـلى قوم في بيتهم بغير اذنهم فقد حل لهم أن يفقئوا عينه ‘‘(مسنداحمد عن ابی ہریرہ،حدیث نمبر:۷۶۰۵،مسندابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

یہ بھی گویا اظہار خیال کا ایک اصول ہے کہ اظہار خیال کی آزادی کے نام پر لوگوں کی نجی زندگی میں داخل نہ ہو جائے ، اسی کا نام تجسس ہے اور قرآن مجید نے اس سے منع کیا ہے ، ﴿ وَلاَ تَجَسَّسُوْا ﴾ (الحجرات :۱۲) ہاں ! جرائم پیشہ لوگوں اور ملک کی سالمیت اور اس کی حفاظت کو خطرہ میں ڈالنے والوں کے حالات کا تجسس اس دائرہ سے باہر ہے ؛ کیوں کہ اس سے عوامی مفاد متعلق ہے اور شخصی اور انفرادی مفاد سے زیادہ اہمیت عوامی مفاد کی ہے۔

ایسی شخصیتیں —— جو اسلام ، اسلامی اقدار اور مسلمانوں کی توہین پر کمر بستہ ہوں ، —— کی آمد پر مسلمانوں کے جذبات کا مشتعل ہونا فطری بات ہے اور اگر اس کی وجہ سے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا ہے تو اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے ، جنہوں نے ایسی بدنام زمانہ مصنفہ کو دعوت دی ہو ؛ لیکن ایسے واقعات پر محض وقتی احتجاج کرنا کافی نہیں ، اس کے لیے کچھ دور رس اقدامات کی ضرورت ہے ، ان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسلمان مختلف مذاہب کے نمائندوں کو لے کر ایک منظّم کوشش کریں اور ایسے معاملات میں خود سنگھ پریوار کے لوگوں کو بھی ساتھ لیتے ہوئے ، نیز مختلف سیاسی جماعتوں کے قائدین سے گفتگو کر کے ان کو مطمئن کریں اور ایک ایسا قانون پاس کرائیں ، جو مذہبی کتابوں ، قرآن مجید ، ویدوں ، بائبل ، مذہبی شخصیتوں اور مذاہب کے مقدس مقامات کے خلاف تقریر یا تحریر میں اظہار خیال کو منع کرتا ہو ؛ کیوں کہ اس سے عوام کے بہت بڑے گروہ کے جذبات مجروح ہوتے ہیں ، اگر ایسی کتابیں بیرون ملک لکھی گئی ہوں تو یہ قانون ان کو اندرون ملک لانے پر روک لگاتا ہو اور جو شخصیتیں اس پہلو سے متنازعہ ہوں ، ان کے ویزے پر بھی پابندی لگاتا ہو ، نیز اظہار خیال کی ممانعت میں تقریر ، تحریر ، فلم اور کارٹون سب کو شامل رکھتا ہو اور اپنے مقصد میں واضح ہو ، نیز ہمیں فراخ دلی کے ساتھ برادرانِ وطن سے کہنا چاہیے کہ جیسے ہم سلمان رشدی ، تسلیمہ نسرین ، یا ڈنمارک کے کارٹونسٹ کے خلاف ہیں ، اسی طرح ایم ، ایف حسین کی اس تصویر کشی کے بھی خلاف ہیں ، جس میں ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کی عریاں تصویریں کھینچی گئی ہیں ، جب تک ہم ایسی منظّم منصوبہ بندی اور اجتماعی کوشش کے ذریعہ واضح قانون بنوانے میں کامیاب نہیں ہوں گے ، وقتی احتجاج ایسے واقعات کے تدارک کے لیے کافی نہیں ہوگا۔

ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہم ایک داعی امت ہیں ، اللہ نے ہمیں ایسے

دین سے نوازا ہے، جس میں دلوں کو کھینچنے کی طاقت اور دماغوں کو مطمئن کرنے کی صلاحیت ہے، اور محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ اتنی جامع اور حرف حرف روشن کا مصداق ہے کہ کوئی بھی صاحب فہم اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا؛ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ایسے مواقع کو ذرائع ابلاغ میں صرف اپنا احتجاج درج کرانے کا موقع نہیں بنائیں؛ بلکہ ایسے بدقماش مصنفین نے جو کچھ لکھا ہے، اخلاقی، عقلی اور تمدنی نقطۂ نظر سے دنیا پر اس کی حقیقت کو واضح بھی کریں اور بہتر ہو کہ ایسے آوارہ خیال مصنفین سے بھی خدا کے کچھ نیک بندے محض اللہ کی رضا و خوشنودی کے لیے اور شہادت حق کی نیت سے وقت لے کر سنجیدہ فضا میں تبادلۂ خیال کریں، خدا کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ وہ ان کی سوچ کے رخ کو تبدیل کر دے، کیا ابوجہل، ابولہب اور فرعون سے بڑھ کر بھی کوئی دشمنِ خدا و رسول ہو سکتا ہے؟ لیکن ہمارے آقا و مولیٰ ﷺ نے ابوجہل و ابولہب پر دعوت حق پیش فرمائی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا حکم ہوا کہ وہ اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ مل کر فرعون کے پاس جائیں، اس کے سامنے حق کی دعوت پیش کریں اور ہاں، اپنی بات نرم زبان میں کہیں، ﴿وَقُولاَ لَهُ قَوْلاً لَّيِّنًا﴾ (طٰہٰ: ۴۴) ـــــ ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں، کیا ہم نے ایسی کوششیں بھی کی ہیں؟ اور کیا ایک داعی امت کی حیثیت سے یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے؟؟

۱۷/ اگست ۲۰۰۷ء

پولیس اورعوام

انسان کا دل یوں تو دیکھنے میں جسم کا ایک ٹکڑا ہے؛ لیکن اسی ٹکڑے میں خواہشات کی ایک دنیا بسی ہوئی ہے، اس کی حرص وہوس کا حال یہ ہے کہ اگر ہفت اقلیم حاصل ہو جائے تب بھی آسودہ نہ ہو، اور ''**ھل من مزید**'' کی صدا جاری رہے، خواہشات کی کثرت انسان کو ٹکراؤ کی طرف لے جاتی ہے؛ کیوں کہ اس دنیا میں کروڑوں انسان بستے ہیں، اگر ایک انسان اپنی تمام خواہشات کو پورا کرنا چاہے، تو اسے اس بستی میں بسنے والے بہت سے انسانوں کو خواہشات کا خون کرنا ہوگا، اس کے بغیر وہ اپنی تمام چاہتوں کو پورا نہیں کرسکتا، انسان کی ان ہی ان گنت اور بے شمار خواہشوں اور چاہتوں کو کنٹرول میں رکھنے، دوسروں کے ساتھ ظلم وزیادتی کو روکنے اور اخلاقی حدود سے باہر نہ جانے کی غرض سے قانون بنائے جاتے ہیں؛ اسی لیے کسی بھی انسانی معاشرہ کے لیے قانون کی بڑی اہمیت ہے۔

قانون انسان کو مہذب بناتا ہے، قانون کے ذریعہ ہر شخص کو اس کا جائز حق ملتا ہے، قانون انسان کو اس بات کا پابند بناتا ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق میں بے جا مداخلت نہیں کرے، قانون اس بات کو بھی یقینی بناتا ہے کہ انسان اخلاق کے دائرہ میں رہتے ہوئے زندگی گزارے، کوئی گروہ قانونی نظام کے بغیر مہذب اور شائستہ زندگی نہیں گزار سکتا؛ اس لیے کسی بھی ملک میں نظام حکومت تین شعبوں پر منقسم ہوتا ہے، مقنّنہ، عدلیہ اور انتظامیہ، مقنّنہ کا کام قانون بنانا ہے، اسلام میں قانون کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ﴾ (یوسف:٦٧) لیکن انتظامی قوانین وضع کرنے کا حق حکومت کو حاصل ہے، عدلیہ قانون کی تشریح کرتی ہے اور جہاں ابہام ہو وہاں اس کی مراد متعین کرتی ہے، انتظامیہ قانون کو نافذ کرتی ہے۔

قانون کے نفاذ میں ایک اہم پہلو قانون کی حفاظت کا ہے، اس بات کی نگرانی بھی ضروری

ہوتی ہے کہ کہیں کوئی بندۂ ہوس قانون کوتوڑنے کا مرتکب تو نہیں ہورہا ہے، وہ دوسروں پر ظلم تو نہیں کررہا ہے؟ دوسروں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کرنے کا مرتکب تو نہیں ہورہا ہے؟ قانون اور حقوق کی حفاظت کی یہ ذمہ داری اندرون ملک جس گروہ سے متعلق ہے، وہ ہے''پولیس''، پولیس ہی معاشرہ کو کنٹرول کرتی ہے، لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ بے جا خواہشات کو اپنے کنٹرول میں رکھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ظلم و زیادتی نہ ہونے پائے، اس لئے معاشرہ میں عدل و انصاف کو قائم رکھنے اور ظلم و زیادتی اور حق تلفی سے بچانے میں پولیس کا نہایت اہم رول ہے۔

جو پولیس واقعی ان مقاصد کو پورا کرے وہ لوگوں کی آنکھوں کا تارا بن کر رہ سکتی ہے، مذہب اور اخلاق کے ترازو میں بھی اس کا بڑا درجہ ہے، عدل کو قائم کرنا اور معاشرہ کو ظلم سے بچائے رکھنا اتنی بڑی نیکی ہے کہ ایمان کے علاوہ شاید ہی کوئی اور نیکی اس کا مقابلہ کرسکے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو: " **وإذا حكمتم فاعدلوا** " (مجمع الزوائد :۵/۱۹۵، بحوالہ طبرانی) ایک اور روایت میں ہے کہ انصاف کرنے والے اللہ کے دائیں جانب نور کے منبر پر ہوں گے، یہ وہ لوگ ہوں گے، جو فیصلہ میں بھی انصاف کو قائم کریں گے، اپنے اہل و عیال کے سلسلہ میں بھی انصاف کو قائم رکھیں گے، اور جن لوگوں پر ذمہ دار بنایا جائے، ان کے بارے میں بھی: " **الذين يعدلون في حكمهم وأهليهم وما ولوا** " (صحيح مسلم ، عن عبد الله بن عمر ﷺ ، حدیث نمبر: ۱۸۲۷)—— آپ ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں تین باتوں کو نجات کا ذریعہ بتایا ہے، ان میں پہلے نمبر پر آپ ﷺ نے جو بات ذکر فرمائی، وہ یہ ہے کہ انسان غصہ میں بھی اور خوشی میں بھی انصاف پر قائم رہے: " **العدل فى الغضب والرضا** " (مجمع الزوائد :۱/۹۱)—— ہر دن انسان انصاف کا جو برتاؤ کرے گا اس کا شمار بھی صدقہ میں ہوگا:

" **كل يوم تطلع فيه الشمس يعدل بين الناس صدقة** "

(صحيح البخاری ، حدیث نمبر: ۲۷۰۷)

عدل و انصاف کے مقابلہ میں ظلم و زیادتی ہے، پولیس کا بنیادی فریضہ معاشرہ میں ظلم و زیادتی کو روکنا ہے، ظلم و زیادتی کو روکنا دراصل پورے سماج کا اخلاقی و مذہبی فریضہ ہے، پولیس گویا اس ذمہ داری کو پورے معاشرہ کی طرف سے ادا کرتی ہے، شرک کے بعد اسلام کی نظر میں ظلم جس قدر

مذموم فعل ہے، شاید ہی کسی اور فعل کو اس درجہ مذموم قرار دیا گیا ہو، آپ ﷺ نے مظلوموں کی مدد کرنے کا حکم دیا: " أعینوا المظلوم " (جامع الترمذی ،عن براء بن عازب ؓ، کتاب الإستئذان ، باب الجالس علی الطریق ،حدیث نمبر:۲۷۲۶) **آپ ﷺ نے اس بات سے اللہ کی پناہ چاہنے کی تلقین فرمائی ہے کہ انسان ظلم کرے یا اس پر ظلم کیا جائے:" تعوذوا باللہ من ... أن تظلم أو تظلم "** (سنن أبی داؤد ،حدیث نمبر:۱۵۴۴)**—— مظلوم کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی دعاء پر آسمان کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں اور اللہ فرماتے ہیں: میرے غلبہ کی قسم! میں اس کی مدد ضرور کروں گا، خواہ کچھ عرصہ بعد ہو:" وعزتي لأنصرنک ولو بعد حین "**(جامع الترمذی ، عن أبی ھریرۃ ؓ ،حدیث نمبر:۳۵۹۸)۔

ظالم کو ظلم سے روکنا نہ صرف مظلوم کی مدد ہے؛ بلکہ یہ ظالم کی بھی مدد ہے؛ کیوں کہ یہ اس کو غلط راستہ سے بچانا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، صحابہ ؓ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم مظلوم کی مدد تو کریں گے؛ لیکن ظالم کی مدد کس طرح کی جائے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ظالم کی مدد یہ ہے کہ ظلم سے اس کے ہاتھ تھام لو:" **أن تأخذوا فوق یدہ** " (صحیح مسلم ، عن أنس ؓ ،حدیث نمبر:۲۵۷۸)—— پس انصاف کا قائم کرنا اور ظلم کو روکنا دونوں ہی باتیں مذہب اور اخلاق کی نگاہ میں نہایت اونچے درجہ کا عمل ہے۔

اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ پولیس کو معاشرہ میں محبت اور قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ، مظلوم اور کمزور اسے دیکھ کر محسوس کرتے کہ ان پر رحمت کی گھٹا سایہ فگن ہوگئی ہے، ظالموں اور مجرموں کو پولیس کا وجود خوف زدہ کرتا، جرم کی طرف بڑھتے ہوئے قدم رُک جاتے اور ہر شخص کو اس بات کا یقین ہوتا کہ پولیس کا سلوک ان کے ساتھ منصفانہ اور خیر خواہانہ ہوگا اور اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی ، مگر افسوس کہ اس وقت ہمارے معاشرہ میں پولیس ایک ایسی چیز ہے جس کا نام لے کر مائیں معصوم بچوں کو ڈراتی ہیں، لوگ شاید درندوں سے بھی اس قدر خوف نہ کھاتے ہوں، جتنا خوف انہیں پولیس سے ہوتا ہے، یعنی پولیس کی تصویر اس کے پیشہ کے بالکل برعکس لوگوں کے ذہن میں بنی ہوئی ہے اور یہ تصویر دن بہ دن پختہ سے پختہ ہوتی جارہی ہے۔

پولیس جن لوگوں کو گرفتار کرتی ہے، ان میں زیادہ تر ملزم ہوتے ہیں، یعنی ان پر جرم کا الزام

ہوتا ہے؛ لیکن ابھی یہ الزام ثابت شدہ نہیں ہوتا، پولیس کا کام ہے کہ جرم کے شواہد عدالت میں پیش کرے اور ملزم کو مجرم ثابت کرے، اور جب تک یہ ثابت نہ ہوجائے اس کے ساتھ مجرم کا سا سلوک روا نہیں رکھے، پولیس قانون کی محافظ ہے، اسی لئے خود اس کو قانون پر پوری طرح عامل ہونا چاہئے ،لیکن پولیس جو رویہ زیر تحقیق مجرموں کے ساتھ اختیار کرتی ہے اور جھوٹے مقدمات ملزموں پر چلاتی ہے وہ درندوں کو بھی شرمندہ کرتے ہیں، اور ان کا جھوٹ ہونا زبان زدِ عام وخاص ہے، مار پیٹ کرنا ، گالی گلوج یہاں تک کہ کرنٹ کے ذریعہ تکلیف پہنچانا اور ملزموں کے ساتھ غیر اخلاقی حرکتوں کا ارتکاب گویا پولیس کے معمولات میں داخل ہے، گجرات اور بمبئی کے فسادات میں پولیس نے جس حیوانیت کا ثبوت دیا ہے، اس نے پوری دنیا میں ملک وقوم کو شرمندہ کیا ہے اور یقیناً ہندوستان کے سیکولرزم پر بدنما داغ ہے۔

ان کوتاہیوں کا حل تربیت ہے، پولیس کی اخلاقی اور فکری تربیت کا ایک ایسا جامع پروگرام ہونا چاہیے، جو اس کی شخصیت کو ایک رحم دل انسان اور مظلوموں کے مددگار کی حیثیت سے پیش کرے، انہیں انسانی نفسیات کے بارے میں بتایا جائے ظلم وجور کی قباحتیں ان پر واضح کی جائیں، انہیں ذہن نشیں کرایا جائے کہ ملزموں کے ساتھ ناروا سلوک اسے حقیقی معنوں میں ''مجرم'' بنا دیتا ہے، اصل مقصد انصاف قائم کرنا اور لوگوں کو ظلم سے بچانا ہے، اگر کسی انسان کے ساتھ ظلم وجور کا ارتکاب کیا جاتا ہے تو پھر باغیانہ ذہن پروان چڑھتا ہے اور وہ ''تنگ آمد بہ جنگ آمد'' کے مصداق مرنے مارنے پر کمر بستہ ہوجاتا ہے، اسی سے دہشت گردی وجود میں آتی ہے؛ اس لئے پولیس کی ظلم وزیادتی نہ صرف قانون کی پامالی اور اخلاقی قدروں کی خلاف ورزی ہے؛ بلکہ یہ جرائم میں اضافہ اور دہشت گردی کی پیدائش کا سبب بھی ہے، کاش! ہماری حکومتیں اس پر توجہ دیں۔

تربیت کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ ایک سے زیادہ خود گورنمنٹ کے مقرر کئے ہوئے کمیشنوں نے پولیس کے رویہ کی مذمت کی ہے، اور انسانی حقوق کی تنظیمیں دہشت گردوں سے زیادہ ان '' سرکاری دہشت گردوں'' کی خونخواری کا رونا روتی رہتی ہیں، تربیت کے اس نظام میں جہاں قانون اور مجرموں کے سلسلہ میں معزز عدالتوں کی ہدایات کو شامل ہونا چاہئے، وہیں ماہر نفسیات، سماجی رہنماؤں اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے انسانیت دوست مذہبی اسکالروں کی بھی شرکت

ہونی چاہئے ، جوانہیں انسانی جان و مال اورعزت وآبرو کی اہمیت ، رشوت ستانی اورظلم وتعدی کی شناعت ، نیز بغیرظلم وزیادتی کے ملزمین سے ان کی غلطیاں اگلوانے کے طریقوں کے بارے میں آگاہ کریں ، اور قانون کے محافظ کی حیثیت سے انہیں ایسے کردار کا حامل بنانے کی سعی کریں جو پریشان حال لوگوں کے درمیان مسیحا سمجھا جائے ، نہ کہ غارت گر اورلٹیرا۔

عوام میں بھی شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ حقیقی مجرموں کی پشت پناہی نہ کریں ، وہ ظالموں کے لئے معاون نہ بنیں ؛ بلکہ جولوگ واقعی مجرم ہیں اوران کے ظلم سے معاشرہ سسک رہا ہے ، ان کو کیفر کردار تک پہنچانے میں قانونی اداروں کا تعاون کیا جائے ،لوگ عام طور پر اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری ادانہیں کرتے ، اس کی وجہ سے معاشرہ میں ظلم و جور پنپتا ہے ، پولیس اگر اپنے فرائض کو صحیح طور پر انجام دے ،تو وہ عوام کا محسن ہے ؛ کیوں کہ بہت سی دفعہ اسے مسلح مجرموں کا مقابلہ کرنے نیز عوام کی املاک کوان کی ستم انگیزوں سے بچانے کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ عمل میں نکلنا پڑتا ہے ، بعض دفعہ امن وامان کو قائم رکھنے کے لئے مسلسل ۲۴/ گھنٹے ڈیوٹی انجام دینی پڑتی ہے ، یہ کوئی معمولی خدمت نہیں ہے ، اس لئے پورے طبقہ کے بارے میں ایک ہی طرح کی منفی رائے قائم کر لینا حقیقت پسندی کے خلاف ہوگا ، عوام کو بھی چاہیے کہ وہ انصاف پسند اور ذمہ دار پولیس عہدیداروں کی حوصلہ افزائی کریں ، انہیں اپنا محسن سمجھیں ، اور سنجیدگی کے ساتھ ان تک عوامی جذبات پہنچائیں ، کیوں کہ بہت سی دفعہ باہمی غلط فہمی کی وجہ سے ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں ، جو نفرت اورعناد کو جنم دینے کا باعث بنتے ہیں۔

۹/نومبر ۲۰۰۷ء

دو پیمانے

غزوۂ بدر کا موقع ہے، رسول اللہ ﷺ جاںنثاران اسلام کی صفیں آراستہ کررہے ہیں، ہاتھ میں ایک پتلی لکڑی ہے، ایک صاحب کے پیٹ پر لگی اور ہلکی خراش آگئی، وہ صاحب کہنے لگے میں بدلہ چاہتا ہوں، امتی اپنے نبی سے، غلام آقا سے اور محکوم حاکم سے ایک ایسے فعل پر بدلہ کا خواستگار ہے، جس میں قصد وارداہ کا کوئی دخل نہیں تھا اور وہ باعث تکلیف بھی نہیں تھا؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کو ان کا دعوی قبول کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا: بدلہ لے لو، ان صاحب نے عرض کیا: جب مجھے لکڑی لگی تو میرا پیٹ کھلا ہوا تھا، آپ ﷺ کے شکم مبارک پر کپڑا ہے، آپ ﷺ نے چادر ہٹادی، وہ آپ ﷺ سے چمٹ گئے، محبت ووارفتگی کے ساتھ شکم مبارک کو چومنے لگے اور کہنے لگے کہ یہی میرا بدلہ ہے، —— اس واقعہ سے جہاں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ صحابہ ؓ آپ ﷺ سے بے حد محبت کرتے تھے اور ہمہ دم آپ ﷺ پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے انصاف کا ایک ہی پیمانہ رکھا تھا، حاکم اور محکوم کے لئے الگ پیمانے نہیں تھے۔

آپ ﷺ کو اپنے آپ کو بدلہ کے لئے پیش کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوا؛ حالاں کہ نبی کو جو عظمت ورفعت حاصل ہے اور صحابہ ؓ کے دل میں آپ ﷺ کی جو محبت اور توقیر تھی، نیز آپ ﷺ کو جو معصومیت حاصل تھی، اس کے تحت آپ ﷺ پر یقیناً ایسے واقعات میں اپنے آپ کو بدلہ کے لئے پیش کرنا ضروری نہیں تھا؛ لیکن چوں کہ آپ ﷺ کی ذات کو پوری انسانیت کے لئے اسوۂ ونمونہ بنایا گیا ہے؛ اس لئے آپ ﷺ نے عملی طور پر ایسی مثال پیش فرمائی کہ انصاف کے تقاضوں کو تقویت حاصل ہو، اس طرح کے بعض اور واقعات بھی احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں، حضرت ابوسعید خدری ؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مال غنیمت کی تقسیم فرمارہے ہیں ایک صاحب آپ ﷺ کی

طرف بڑھے اور آپ ﷺ پر گر پڑے، دست مبارک میں ایک لکڑی تھی، آپ ﷺ نے اسی سے ان کو پیچھے ہٹانے کی کوشش فرمائی، لکڑی ان کے چہرہ پر لگ گئی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا آؤ بدلہ لے لو: ''**تعال فاستقد**'' ان صاحب نے کہا: نہیں؛ بلکہ اللہ کے رسول! میں نے معاف کیا: ''**بل عفوت یا رسول الله**'' (ابوداؤد، حدیث نمبر:۴۵۳۶)

یہی طریقہ آپ ﷺ کا تمام معاملات میں تھا، حضرت ابوہریرہ ؓ راوی ہیں، ایک یہودی کا کچھ آپ ﷺ کے ذمہ باقی تھا، اس نے تقاضہ کرتے ہوئے سخت کلامی کی، فطری طور پر صحابہ ؓ کو ناگواری ہوئی، وہ اس سے الجھنا چاہتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسے چھوڑ دو، حق دار کو کہنے کا حق حاصل ہے، پھر فرمایا کہ اس کا جو جانور میرے ذمہ باقی ہے، اسی طرح کا جانور اسے ادا کردو، رفقاء نے عرض کیا: اس سے بہتر جانور ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہی دے دو؛ کیوں کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہے، جو ادا کرنے کے اعتبار سے بہتر ہو: ''**فإن من خیر کم أحسنکم قضاءً**''

(بخاری، حدیث نمبر:۲۳۰۶، باب الوکالۃ فی قضاء الدیون)

سلوک میں مساوات و برابری اور قانون کی ملک کے تمام شہریوں کے لئے یکسانیت ہی سے سماج میں عدل وانصاف کا بول بالا ہوتا ہے، لوگوں کو اس بات کا اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ طاقت ور سے طاقت ور شخص بھی ہم پر ظلم نہیں کرسکتا، جہاں انصاف کے پیمانے الگ الگ ہوں، ایک ہی معاملہ میں حاکم ومحکوم، طاقت ور اور کمزور، دولت مند اور غریب کے درمیان فرق کیا جاتا ہو، مختلف قوموں اور ملکوں کے لئے الگ الگ رویہ اختیار کیا جاتا ہو، اور قانون میں یکسانیت نہیں ہو، وہاں حقیقی عدل قائم نہیں ہوسکتا، جب تک انصاف قائم نہیں ہوگا، معاشرہ میں امن وامان بھی قائم نہیں ہو سکے گا، اسی لئے اسلام نے قانونِ جرم وسزا کے باب میں حاکم اور رعایا کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا ہے، ملک کا ایک عام شہری بھی فرماں روائے وقت کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے، سچائی کی تحقیق اور جرم کی دریافت کے سلسلہ میں جو قواعد ایک عامی شخص کے لئے برتے جائیں گے، وہی قواعد حکمرانوں کے لئے بھی ہوں گے، غلطی کی مکافات اور بدلہ کے سلسلہ میں جو حکم ملک کے عام شہری کے لئے ہوں وہی ارباب اقتدار کے لئے بھی ہوگا اور قانون کی نظر میں سب برابر سمجھے جائیں گے۔

یہ نہ صرف شریعت کے احکام ہیں ؛ بلکہ اسے مسلمانوں کے مثالی حکمرانوں نے برت کر بھی دکھایا ہے، سیدنا حضرت عمر فاروق ﷛ کا عہد خلافت ہے، ان کے اور حضرت ابی بن کعب ﷛ کے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہے، دونوں نے حضرت زید بن ثابت ﷛ کی عدالت میں معاملہ پیش کیا، انہوں نے بیٹھانے میں حضرت عمر ﷛ کے ساتھ ترجیحی سلوک کرنا چاہا اور کہا: امیر المؤمنین ! آپ یہاں بیٹھ جائیں، یعنی اپنے بازو میں بیٹھنے کا اشارہ کیا، حضرت عمر ﷛ نے فرمایا: یہ پہلا ظلم ہے، جو آپ نے اس معاملہ میں کیا ہے، میں اپنے فریق کے برابر میں ہی بیٹھوں گا، پھر حضرت عمر ﷛ حضرت ابی ﷛ کے ساتھ سامنے بیٹھ گئے، حضرت ابی ﷛ نے اپنا دعوی پیش کیا، حضرت عمر ﷛ نے انکار کیا، اصولی طور پر حضرت عمر ﷛ کو قسم کھانی چاہئے تھی، حضرت زید ﷛ نے ابی بن کعب ﷛ سے کہا: بہتر ہوتا کہ تم امیر المؤمنین سے قسم کو معاف کر دیتے، میں ان کے علاوہ کسی اور کے لئے تم سے اس کی خواہش نہیں کروں گا، حضرت عمر ﷛ کو یہ رعایت پسند نہیں آئی، انہوں نے قسم کھائی، پھر دو بارہ قسم کھاتے ہوئے فرمایا کہ زید عہدۂ قضاء کے مستحق نہیں ہو سکتے، جب تک کہ ان کی نظر میں عمر ﷛ اور ایک عام مسلمان کی عزت وآبرو برابر نہ ہو جائے:

" لا یدرک زید القضاء حتی تکون عمر و رجل من عرض المسلمین عندہ سواء " (کنز العمال :۴۸۳/۵، حدیث نمبر:۲۶۶۳)

سیدنا حضرت علی ﷛ کا عہد خلافت ہے، ایک یہودی نے آپ ﷛ کی کمبل چوری کر لی ہے، آپ ﷛ نے قاضی شریح کی عدالت میں اس کے خلاف دعوی دائر کیا، یہودی نے انکار کیا اور کہا کہ یہ میری کمبل ہے، قاضی صاحب نے حضرت علی ﷛ سے گواہان طلب کیے، آپ ﷛ نے اپنے صاحبزادے نواسۂ رسول حضرت حسن ﷛ اور اپنے غلام قنبرہ کو پیش کیا، قاضی شریح نے حضرت حسن ﷛ کی شہادت رد کر دی ؛ کیوں کہ یہ آپ کے صاحبزادے تھے اور بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں مقبول نہیں، بعض روایتوں میں قنبرہ کی شہادت بھی رد کرنے کی بات آئی ہے ؛ کیوں کہ یہ آقا کے حق میں غلام کی گواہی تھی، حضرت علی ﷛ نے فرمایا: تمہیں معلوم ہے حسن کون ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کا کیا مقام ومرتبہ بتایا ہے؟ قاضی صاحب نے کہا: مجھے معلوم ہے ؛ لیکن چوں کہ آپ ﷺ ہی کا یہ حکم بھی ہے کہ ماں باپ کے حق میں اولاد کی گواہی معتبر نہیں ہوگی ؛ اس لئے میں اسے رد کرتا

ہوں، چنانچہ فیصلہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خلاف اور یہودی کے حق میں ہوا اور خود امیر المؤمنین نے اس فیصلہ کو بہ سروچشم قبول فرمایا ؛—— مقدمہ کی ہار نے یہودی کا دل جیت لیا اور اس نے اسلام کے بے لاگ انصاف کو دیکھتے ہوئے اسلام قبول کرلیا۔

یہی انصاف ہے جو معاشرہ میں امن وامان کو قائم رکھتا ہے، کیوں کہ جب انسان کے لئے قانونی راستہ موجود ہوتا ہے، تو وہ غیر قانونی راستہ اختیار نہیں کرتا، جب انصاف کے دو الگ الگ پیمانے ہو جاتے ہیں، تو ان خود ساختہ پیمانوں کی وجہ سے ایک گروہ مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہو جاتا ہے، تو وہ غیر قانونی راستہ اختیار کر لیتا ہے اور سماج کے امن وامان کو درہم برہم کر کے رکھ دیتا ہے، آج دنیا میں قدم قدم پر اس دوسرے رویہ کی مثالیں مل جائیں گی، اسرائیل کے نیوکلیئر عزائم پر کوئی لب شکایت نہیں کھول سکتا؛ لیکن ایران کے پرامن نیوکلیئر پروگرام پر بھی ہزار قدغنیں ہیں اور عربوں کو تو اس بارے میں سوچنے کی بھی اجازت نہیں، سوڈان میں حقوق انسانی کی فکر عالمی طاقتوں کو بے قرار کئے ہوئی ہے؛ لیکن طالبان افواج کے ساتھ جو درندگی کی گئی اور عراق وافغانستان اور فلسطین میں جو مظالم ڈھائے جا رہے ہیں اور حقوق انسانی کی پامالی ہو رہی ہے، ان کے بارے میں کچھ کہنا بھی جرم ہے، ایک طرف جمہوریت، آزادی اور عوامی حکومت کی باتیں کی جا رہی ہیں اور مسلم ممالک میں انہیں درآمد کرنے کا نعرہ لگایا جا رہا ہے، دوسری طرف فلسطین، ترکی اور مصر وغیرہ میں عوامی اقتدار کو کچلنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ابھی پچھلے دنوں پڑوسی ملک میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، جنرل مشرف نے اپنے اقتدار کو بچانے اور عدلیہ کے عتاب سے بچنے کے لئے ایمرجنسی نافذ کردی اور عدالت کے سینیئر ججوں کو سبکدوش کر کے نئے جج مقرر کئے، تا کہ فیصلے ان کو موافقت میں ہوں، اور اس ناشائستہ حرکت کو عنوان دیا گیا ہے ''ملک کو دہشت گردی سے بچانے'' کا؛ حالاں کہ ایسے واقعات دہشت گردی کو بڑھاتے اور بغاوت کے جذبات کو ابھارتے ہیں، خود ہمارا ملک جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے، حاکم اور محکوم کے درمیان انصاف کے الگ الگ پیمانے رکھتا ہے، آپ صدر مملکت، وزیر اعظم اور اسپیکر وغیرہ کے خلاف حکومت کی اجازت کے بغیر مقدمہ دائر نہیں کر سکتے، اسی طرح پولیس عہدہ داروں کے خلاف اجازت کے بغیر عدالت سے رجوع نہیں ہو سکتے، اسی کا نتیجہ ہے کہ

میرٹھ، بھاگلپور اور ممبئی فسادات کے مجرم پولیس عہدہ داروں کے خلاف انصاف حاصل کرنے میں مسلمان ناکام رہے اور سری کرشنا رپورٹ ردی کے ٹوکرے میں ڈال دی گئی، بابری مسجد کی شہادت کے پس منظر میں ممبئی کا بھیانک فساد ہوا اور اس فساد کے ردعمل میں بم بلاسٹ کا واقعہ پیش آیا، بم بلاسٹ کے مجرمین کو تو تیز رفتار خصوصی عدالتوں کے ذریعہ قرار واقعی سزائیں دے دی گئیں، مگر نہ ممبئی فساد کے مجرمین کو کوئی سزا ملی اور نہ بابری مسجد شہید کرنے والوں کو۔

جب تک انصاف کے لئے دوہرے پیمانے رہیں گے، معاشرہ میں عدل قائم نہیں ہو سکے گا اور سماج میں جب تک عدل قائم نہیں ہوگا، امن وامان بھی قائم نہیں ہو سکے گا، عمل اور ردعمل اور ظلم وانتقام کا سلسلہ جاری رہے گا، اس لئے آج عالمی سطح پر بھی اور ملکی سطح پر بھی سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ تمام افراد اور گروہوں کو یکساں انصاف فراہم کیا جائے اور محرومی و ناامیدی کے احساس سے بچایا جائے، یہ انصاف جیسے حکومتوں کی سطح پر ضروری ہے، ویسے ہی افراد کی سطح پر بھی ضروری ہے، ایک شخص چاہتا ہے کہ اسے اپنے بیچنے والے سے بہتر مال حاصل ہو؛ لیکن وہ خود اپنے گاہک کو گھٹیا مال فروخت کرتا ہے، ایک تاجر خواہش مند ہے کہ اس کا گاہک وعدہ کے مطابق اس کو پیسے ادا کر دے؛ لیکن وہ خود بحیثیت گاہک اپنے تاجر کے ساتھ یہ معاملہ نہیں رکھتا، والدین کا مطالبہ ہے کہ اولاد کا سلوک ان کے ساتھ سمع وطاعت کا ہو؛ لیکن خود ان کا سلوک اپنے والدین کے ساتھ بہتر نہیں ہے، شوہر چاہتا ہے کہ اس کی بیوی کو اپنے میکہ سے قانون شریعت کے مطابق حق میراث حاصل ہو، لیکن خود اپنی بہن کو والدین کے ترکہ میں سے اس کا حق دینا نہیں چاہتا، وہ اپنے ملازم کے ساتھ بدسلوکی و بدزبانی روا رکھتا ہے، لیکن اپنے آجر سے خوش اخلاقی کی توقع رکھتا ہے، غرض زندگی میں ہر ہر قدم پر ہم نے اپنے لئے اور دوسروں کے لئے الگ الگ پیمانے بنا رکھے ہیں، جب تک یہ تضاد دور نہ ہو، انسانی سماج محبت واخوت اور امن وآشتی کا گہوارہ نہیں بن سکتا۔

۲۳/نومبر ۲۰۰۷ء

تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

انسان کی کمزوری بھی ہے اور مجبوری بھی کہ وہ آنکھ سے زیادہ کان پر بھروسہ کرتا ہے اور جب ایک ہی بات کو بار بار سنتا ہے تو بڑے سے بڑے جھوٹ کو بھی سچائی تصور کر لیتا ہے، ایک طرف زندگی کے دوسرے شعبوں میں وہ ایسی دادِ تحقیق دے رہا ہے، جو بال کی کھال نکالنے کا مصداق ہے، اس کی کمندیں مریخ تک جا پہنچی ہیں، اس کے قدم نے چاند کے سینے کو پامال کیا ہے، اگر وہ بیمار ہو تو جسم کے ایک ایک جز کی تحقیق کراتا ہے اور اس کے بعد ہی علاج کو درست علاج سمجھتا ہے؛ لیکن دوسری طرف کسی فرد یا گروہ کے بارے میں جب کوئی خبر پہنچتی ہے تو اس کے تجزیہ اور اس خبر کے ذرائع پر تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، افسوس تو اس بات کا ہے کہ افراد و اشخاص ہی نہیں ؛ بلکہ ابلاغ کے ادارے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، اس کا نتیجہ ہے کہ خلافِ واقعہ خبروں کی وجہ سے بعض اوقات ہزاروں جانیں چلی جاتی ہیں اور کتنے ہی آدمیوں کا خون ہوتا ہے۔

اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مغرب نے یہی رویہ اختیار کیا ہے اور سیاسی و فوجی دباؤ کے تحت مشرقی ممالک بھی مغرب کی ہر صدا پر لبیک کہتے جا رہے ہیں، مغربی قوتیں انسانی نفسیات کی اسی کمزوری کا فائدہ اٹھا رہی ہیں کہ انسان ہر سنی ہوئی بات کی تحقیق نہیں کرتا اور جب ایک بات بار بار کہی جاتی ہے، تو لوگوں کے خیال میں وہ ایک مسلمہ حقیقت بن جاتی ہے؛ اس لئے جھوٹ کو اتنی کثرت سے بولا جائے کہ وہ سچ بن جائے اور اس پر دلیل و برہان کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے۔

افغانستان میں طالبان کی ایک جائز حکومت قائم تھی، جنہوں نے مدتوں سے امن و قانون سے عاری ملک کو امن و آشتی سے ہمکنار کیا، افغانیوں کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کئے اور ملک پر کنٹرول حاصل کیا؛ لیکن محض اس الزام پر کہ گیارہ ستمبر کے واقعہ میں افغان قائدین ملوث

تھے، اس جائز حکومت کو بزورقوت ختم کر دیا گیا اور ایک ایسے شخص کو حکمراں بنا دیا گیا، جو خود اپنے ملک میں اجنبی تھا اور جس کی حکومت آج تک کابل سے باہر نہیں جا سکی، عراق کو محض یہ کہہ کر تخت و تاراج کیا گیا کہ یہاں نیوکلیئر اسلحے چھپا کر رکھے گئے ہیں؛ حالاں کہ بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ یہ بالکل غلط دعوی اور جھوٹا پروپیگنڈہ تھا، یہی صورت حال دوسرے مسلم ملکوں میں پیش آ رہی ہے۔

جہاں مسلمانوں پر فوجی استبداد کے ذریعہ ظلم کیا جا رہا ہے، وہیں فکری اعتبار سے بھی اسلام کو مجروح اور امت مسلمہ کو بدنام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، ابھی گزشتہ ماہ یعنی اکتوبر میں ۲۲ تا ۲۶ تاریخ کو ایک خصوصی ہفتہ امریکن یونیورسٹیوں میں ''اسلاموفاشسٹ آگہی'' کا منایا گیا، اس پروپیگنڈہ مہم کے محرک یہودی اور دائیں بازو کی انتہا پسند تنظیمیں تھیں، اسلام مخالف پروپیگنڈہ کے لئے ایک پیشہ ور شخص ''ڈیوڈ ہورووٹز'' کی خدمات حاصل کی گئیں اور اسے اس مقصد کے لئے ڈیڑھ کروڑ ڈالر کا فنڈ دیا گیا، نیز اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ امریکہ میں نئے صدر کے انتخاب کے بعد ۲۰۰۸ء میں پھر اسی طرح کا ہفتہ منایا جائے گا، بعض یونیورسیٹوں میں اس پروگرام کو جو اہمیت دی گئی، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی میں برٹش نیشنل پارٹی کے رہنما ''نک گریفن'' کو بھی مدعو کیا گیا۔

اس ہفتہ میں تحریر وتقریر اور الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ مسلمانوں کو دہشت گرد، شدت پسند اور جنونی قوم کی حیثیت سے امریکیوں کے سامنے پیش کیا گیا اور مسلمانوں کے تئیں نفرت اور دشمنی کے جذبات ابھارے گئے، مغربی سامراج اسلام کو بدنام کرنے کے لئے نئے نئے الفاظ وضع کرتا رہتا ہے، ایک زمانہ میں رجعت پسند اور قدامت پرست جیسے الفاظ کہے جاتے تھے، پھر انہیں انتہا پسند اور بنیاد پرست کہا گیا، اس کے بعد دہشت گردی کی اصطلاح چل پڑی اور اب ''اسلامک فاشزم'' اور ''اسلاموفاشسٹ'' کا نیا عنوان اختیار کیا جا رہا ہے، رسول اللہ ﷺ سے عربوں کو دور رکھنے اور آپ ﷺ کو بدنام کرنے کے لئے اہل مکہ مختلف عنوان اختیار کرتے تھے، کبھی آپ ﷺ کو نعوذ باللہ مجنون کہا جاتا، کبھی مسحور کہا جاتا، کبھی کہا جاتا کہ آپ ﷺ جادوگر ہیں، کبھی پروپیگنڈہ ہوتا کہ آپ ﷺ ایک خاص جادو سے واقف ہیں، جس کے ذریعہ باپ بیٹے اور شوہر و بیوی میں جدائی پیدا کر دی

جاتی ہے، کوئی کہتا کہ آپ ﷺ کاہن ہیں، کوئی آپ ﷺ کو شاعر اور آپ ﷺ کے پیش کئے ہوئے دین برحق کو شاعرانہ تخلیات قرار دیتا، غرض کہ سچائی کو چھپانے کے لئے مختلف عنوان قائم کئے جاتے، یہی سنت آج آپ ﷺ کی امت مرحومہ کے ساتھ دہرائی جارہی ہے اور تاریک پسند دنیا بے چین ہے کہ کسی طرح حق کی اس روشنی کو بجھا دیا جائے؛ لیکن ان شاء اللہ کبھی ان کا یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہوگا: ﴿ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ (الصف :۸)۔

یونیورسٹیوں کو اس پروپیگنڈہ مہم کا مرکز بنانا کوئی اتفاقی بات نہیں ہے، یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے، قوم کی زمام اور ان کی فکر کی تکمیل پڑھے لکھے لوگوں ہی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، جو لوگ علم و دانش سے محروم اور فکر و شعور سے تہی دامن ہیں، ان کی تعداد خواہ زیادہ ہو؛ لیکن ان کے اثرات بہت محدود ہوتے ہیں، یہی یونیورسیٹوں میں پڑھنے والے لڑکے اور لڑکیاں حکومتوں کے مختلف شعبوں میں جاتے ہیں، انہیں کا دماغ حکومت کی پالیسی مرتب کرتا ہے، یہی صلح و جنگ کے سلسلہ میں حکومت کی رہنمائی کرتے ہیں، یہی کل ہوکر ذرائع ابلاغ کی زبان بنیں گے، وہ جو کچھ کہیں گے اور لکھیں گے، ذرائع ابلاغ کی وساطت سے اس کی حیثیت سکۂ رائج الوقت کی ہوجائے گی اور آنے والی نسل کی فکر پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوں گے، غور کیا جائے تو زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جس پر قوم کے تعلیم یافتہ گروہ کی گرفت نہ ہو۔

سوال یہ ہے کہ اس صورت حال میں مسلمان کیا کریں، وہ کس طرح اس فتنۂ کبریٰ کا مقابلہ کریں؟ ایک ایسی امت جس کی عداوت و مزاحمت پر تمام بڑی طاقتیں ایک دوسرے سے ہاتھ ملا چکی ہیں اور جس کو بدنام کرنے کے لئے مغرب سے مشرق تک ذرائع ابلاغ ایک دوسرے کے دوش بدوش ہیں، اس صورت حال میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے، یہ بات بہت ہی گہرائی کے ساتھ سوچنے اور تیزی کے ساتھ عمل کرنے کی ہے اور اگر اب بھی اس موضوع پر سنجیدگی سے نہیں سوچا گیا، تو اس غفلت کا نقصان ناقابل تلافی ہوگا کہ:

لمحوں نے خطا کی ہے صدیوں نے سزا پائی

اس سلسلہ میں مسلمانوں کو جو تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں، ان میں سے چند اہم نکات یہ ہیں:

۞ علماء امت اور امت کے جدید تعلیم یافتہ حضرات ، دونوں ہی ملت اسلامیہ کا اثاثہ ہیں، ان کے درمیان جو وسیع خلیج تھی ، اللہ کا شکر ہے کہ وہ بہ نسبت پہلے کے کم ہوئی ہے، خاص کر ہندوستان میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ اور اس کے بعد اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے قیام نے اس فاصلہ کو سمیٹنے اور کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے؛ لیکن ابھی بھی خاصا فاصلہ موجود ہے، صورت حال یہ ہے کہ علماء کی نگاہ کتاب وسنت اور دین کے مصالح ومقاصد پر ہے؛ لیکن ان کی غالب ترین اکثریت انگریزی زبان سے نابلد ہے، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری نے ایک سوسال پہلے تجویز منظور کی تھی کہ یہاں انگریزی زبان کی بھی تعلیم ہو؛ لیکن تین چار سال پہلے ہی عملاً دار العلوم میں انگریزی کا شعبہ قائم ہوا ہے، اب مختلف دینی درسگاہوں میں اس طرف توجہ دی جارہی ہے؛ لیکن ایسے علماء — جو اسلامی علوم میں گہری بصیرت رکھنے کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں اظہار خیال کی صلاحیت رکھتے ہوں — کی تیاری میں ابھی تقریباً بیس سال کا عرصہ چاہئے ، تب تک ان شاء اللہ اس صلاحیت کے حامل علماء کی معتد بہ تعداد میدان عمل میں اتر سکے گی ، دوسری طرف جو جدید تعلیم یافتہ حضرات ہیں، وہ اپنی حاصل کردہ تعلیم کی دنیا میں کتنے ہی ممتاز ہوں ، اسلامیات کے بارے میں ان کی معلومات بہت ہی معمولی ہوتی ہیں اور جو شخص کسی میدان کا آدمی نہیں ہوتا ، وہ اس میں تھوڑا پا کر بھی اپنے بارے میں خیال کرنے لگتا ہے کہ اس نے بہت پالیا ہے، یہ کم علمی ، لاعلمی سے زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے، بہت معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ بہت سے جدید تعلیم یافتہ حضرات کی نفسیات یہی ہے۔

ضرورت ہے کہ علماء اپنے ان بھائیوں کی طرف محبت کے ہاتھ بڑھائیں ، ان کی ناگوار باتوں کو ان کی مجبوری اور اسلام سے ناواقفیت کا نتیجہ اور اس ناواقفیت میں خود علماء کی کوتاہی کو خیال میں رکھتے ہوئے صبر وتحمل سے کام لیں اور جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی اس حقیقت کو سمجھیں کہ دین پر قائم رہنے میں وہ علماء کی رہنمائی کے محتاج ہیں ، پھر علماء علمی مواد فراہم کریں اور جدید تعلیم یافتہ حضرات اسے مغربی طرز استدلال کے سانچے میں ڈھالیں اور اس مواد کو خود ان کی زبان میں پیش کریں ، یہ باہمی تعاون اسلام کے خلاف پروپیگنڈوں کا جواب دینے میں مؤثر حصہ ادا کرسکتا ہے، سرسید احمد خانؒ ، علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ ، انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں سے

واقف نہیں تھے ، لیکن انہوں نے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے تعاون سے اہل یورپ کے اعتراضات کو سمجھا اور ان کا مسکت جواب دیا ، امت کی مختلف صلاحیتیں اگر جمع ہو جائیں اور ایک دوسرے کا تعاون کریں ، تو ہم یقیناً وقت کے اس سب سے اہم فریضہ کو ادا کر سکتے ہیں ۔

۞ دوسرا اہم مسئلہ ذرائع ابلاغ سے ہماری دوری کا ہے ، آج ذرائع ابلاغ نے دل و دماغ کے سوداگر کی حیثیت اختیار کر لی ہے ، وہ دن کو رات بنا سکتے ہیں اور رات کو دن ؛ لیکن اس شعبہ میں مسلمانوں کا قدم اتنا پیچھے ہے کہ وہ دور دور تک نظر بھی نہیں آتے ، اس وقت مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ دنیا کے مختلف ملکوں میں اپنے چینل قائم کریں ، یا جو چینل اس وقت چل رہے ہیں ، ان سے کچھ وقت خرید کریں ، اگر دشمن کے پاس ہوائی جہاز اور ٹینک ہوں اور آپ تلوار اور لاٹھی کے ساتھ مقابلہ پر آ جائیں ، تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ اخلاص کے ساتھ شہادت کی وجہ سے آپ جنت کے حق دار ٹھہریں ؛ لیکن ایسا کرنا بہر حال عقلمندی نہیں ہو سکتی ، اگر ایسا ہوتا ہو تو رسول اللہ ﷺ نے منجنیق استعمال نہ فرمائی ہوتی اور ایرانی طرز پر خندقیں نہ کھدوائی گئی ہوتیں ، اسلام کے خلاف جس قوت کے ساتھ معرکہ آرائی کی جا رہی ہے ، اسی قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ بھی کرنا ہوگا ، خود ہندوستان میں صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی نیشنل چینل قائم نہیں ہو سکا ؛ اس لئے جب الکٹرانک میڈیا ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم چلاتا ہے تو چند جلسوں یا محدود اشاعت کے حامل اپنے اخبارات کے سوا ہماری آواز نہیں پہنچ پاتی ۔

۞ اس وقت انٹرنیٹ بھی لوگوں تک رسائی کا ایک اہم ذریعہ ہے ، مسلمانوں کے سنجیدہ ، تعلیمی اور دعوتی اداروں کو انٹرنیٹ کے ذریعہ دفاع عن الاسلام اور دعوت دین کا فریضہ انجام دینا چاہئے اور چوں کہ اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے ، اس لئے اس جہت سے ہمیں غلبہ حاصل کرنا چاہئے ۔

۞ ہم ایسے واقعات پر تو احتجاج کرتے ہیں ، جس کا فکری اثر بہت محدود ہوتا ہے ، جیسے کارٹون کا مسئلہ ہے ، یقیناً ہمیں ایسے واقعات کی مذمت کرنی چاہئے ؛ لیکن کارٹون اظہار خیال کی ایک غیر سنجیدہ صورت ہے ، لوگوں کی فکر پر اس کا اثر وقتی ہوتا ہے ، اس کے برخلاف علم و تحقیق کے لباس میں جو بد دیانتی کی جاتی ہے ، اس کے اثرات گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں ، ایسے واقعات پر

ہمیں زیادہ متحرک ہونا چاہئے ، پوری دنیا سے ایسے تعصب انگیز پروپیگنڈے کے خلاف آواز بلند ہونی چاہئے ،خود امریکہ کے مسلمانوں کو اس ناشائستہ حرکت پر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے ، تعارف اسلام کی جوابی مہم چلانی چاہئے ، انہیں بتانا چاہئے کہ تشدد اور دہشت گردی کبھی تعصب اور تنگ نظری کا نتیجہ ہوتی ہے اور کبھی محرومیت ومظلومیت کی وجہ سے وجود میں آتی ہے، جب بوسنیا کے قتل عام کو عیسائی دہشت گردی، فلسطین کے ظلم وجور کو یہودی دہشت گردی، سکھوں کے خلاف ۱۹۸۴ء کے فسادات اور بھاگلپور و گجرات کے فرقہ وارانہ تشدد کو ہندو دہشت گردی نہیں کہا جاتا اور عراق وافغانستان کے مظالم کو امریکن دہشت گردی کا نام نہیں دیا جاتا تو کسی خاص واقعہ کو اسلامی دہشت گردی کا عنوان دینا کیا معنی رکھتا ہے؟

۞ موجودہ حالات میں یہ بات بھی ضروری محسوس ہوتی ہے کہ مسلمان انصاف پسند غیر مسلم بھائیوں کو ساتھ لے کر ایک ایسا گروپ تشکیل دیں، جو سچائی کا علمبردار ہو، جو پوری دنیا میں منصفانہ طریقہ پر جور وظلم کے خلاف آواز بلند کرے اور جو جھوٹے پروپیگنڈہ کے مقابلہ سچائی کا طرف دار ہو، رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں ''حلف الفضول'' اس کی مثال ہے،—— انسانی بنیادوں پر غیر مسلم بھائیوں سے تعلقات کا استوار نہ ہونا عام انسانی مسائل میں ابنائے وطن کو ساتھ لے کر جد و جہد سے گریز کرنا اور ہر مسئلہ میں اپنی الگ دنیا بنائے رہنا بھی ایک اہم سبب ہے جو ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کو تقویت پہنچاتا ہے؛ کیوں کہ دوریاں غلط فہمیوں کو جنم دیتی ہیں۔

ضرورت ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمان سر جوڑ کر بیٹھیں ،خوب گہرائیوں کے ساتھ مسائل کا تجزیہ کریں، دور رس اثر کے حامل منصوبے بنائیں اور باہمی تعاون کے ذریعہ انہیں کامیابی سے ہمکنار کریں۔﴿ اِنَّ اللّٰهَ لاَ يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ﴾ (الرعد :۱۱)

۳۰/نومبر ۲۰۰۷ء

۞۞۞۞۞۞۞۞۞۞۞

تم قتل کروہو کہ کرامات کروہو!

اردو کے ایک بڑے؛ بلکہ بہت بڑے شاعر حضرت میرؔ گذرے ہیں، عشق مجازی کی ناکامی ومحرومی اور ہجر کی بے سکونی نے ان کے دل ودماغ پر ایسی چوٹ لگائی کہ وہ خود پیکر رنج وغم بن گئے اور یہی غم جاناں جب شعر کے سانچہ میں ڈھل گیا تو ایک ایسی شاعری وجود میں آئی، جس پر آج تک اصحاب ذوق سر دھنتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ بہتوں نے میرؔ کے طرز سخن کو اختیار کرنا چاہا؛ لیکن وہ اس راہ پر چند قدم بھی نہیں چل سکے؛ کیوں کہ نقل کرنے والوں کا غم مصنوعی اور ان کا بیان ''جگ بیتی'' کے درجہ میں تھا؛ لیکن میرؔ کے لئے یہ غم آپ بیتی تھا اور یہ ان کے رگ وریشہ میں سرایت کر چکا تھا؛ اس لئے جو شعر ان کی زبان سے نکلتا وہ دلوں کے تار کو چھیڑے بغیر نہیں رہتا اور جب اس ساز سے آواز نکلتی تو وہ سراپا درد بن جاتی۔

میرؔ کے بہت عرصہ بعد اردو میں ایک اور شاعر پیدا ہوا، جس کی آنکھوں کے سامنے اس کا گھر لٹا اور جس کے بزرگوں کے لہو سے تقسیم ملک کے وقت ظالموں نے اپنی پیاس بجھائی، اگر میرؔ کے پاس غم جاناں کی سوغات تھی تو اس شاعر کے پاس غمِ دوراں کی تلخیاں، اس نے اسی غم کو اپنے لئے ''سرمایۂ حیات'' بنالیا اور جب اس نے شعر وسخن کا رنگ وروپ لیا تو شاعر کی ہر غزل گویا مرثیہ بن گئی، یہ زخم صرف ایک فرد کا نہیں تھا، ایک پورے خاندان کا تھا؛ اس لئے اس کی گہرائی میرؔ کے غم جاناں سے بھی بڑھ گئی، یہ ہمارے عہد کے شاعر حضرت کلیم عاجزؔ ہیں، ان کے اشعار میں میرؔ کا اسلوب بھی ہے، درد وفغاں بھی ہے، مظلوم کی سسک بھی ہے، کمزوروں کے لئے حوصلہ بھی ہے، ظالموں کو تنبیہ بھی ہے، انسانیت کا پیغام بھی ہے اور گاہے تیکھا پن بھی ہے، ایسے ہی کچھ تیکھے اشعار انہوں نے ہندوستان کے سیاسی پس منظر میں کہے ہیں، اسی رنگ کی ایک غزل جب پہلی بار لال قلعہ کے مشاعرہ میں پڑھی گئی اور ملک کی طاقتور ترین سیاسی قائد محترمہ اور وزیر اعظم اندرا گاندھی

سے خطاب کرتے ہوئے پڑھی گئی تو داد وتحسین کا زور اور تالیوں کا شور رو کے نہیں رکتا تھا، آج موضوع کی مناسبت سے بے تکلف اسی غزل کا ایک شعر نوکِ قلم پر آتا ہے:

خنجر پہ کوئی داغ ، نہ دامن پہ کوئی چھینٹ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو؟

شاعر نے قتل کا بھی عجیب نقشہ کھینچا ہے کہ مقتول کے خونِ جگر کی ایک ایک بوند بہہ جائے؛ لیکن قاتل ایسا مشاق یا خوش نصیب ہے کہ اس پر قاتل ہونے کی کوئی علامت نہیں، نہ خنجر پہ کوئی داغ ہے نہ دامن پہ کوئی چھینٹ ہے، مگر اس کے باوجود وہ مقتل کو آراستہ کرتا رہتا ہے، ایسا قتل زیادہ تر سیاست دانوں کے ذریعہ ہوتا ہے، جو لوگوں کی نعش پر کھڑے ہوکر اپنا قد اونچا کرتے ہیں اور مظلوموں کا لہو پی کر اپنی طاقت بڑھاتے ہیں، شاعر کے اس شعر کی مخاطب ایک خاص قیادت تھی؛ لیکن آج سیاسی دنیا میں بہت سے قائدین اس صلاحیت اور مزاج و مذاق کے پیدا ہو رہے ہیں، اسی کی ایک مثال گجرات کے چیف منسٹر نریندر مودی ہیں جو مسلسل تیسری بار امتیازی کامیابی حاصل کر کے ایوان اقتدار میں پہنچ چکے ہیں، ان کا قصر اقتدار خوش رنگ و سرخ فام ہے؛ لیکن یہ سرخی مظلوموں کے خون جگر کی ہے، ان کے بام و در روشنی میں نہائے ہوئے ہیں؛ لیکن یہ روشنی ان سینکڑوں غریبوں اور ستم زدہ لوگوں کی جھونپڑیوں کے چراغ سے حاصل کی گئی ہے، جنہیں جی بھر کر جلایا گیا ہے، اس میں دل و نگاہ کو اپنی طرف کھینچنے والے آبشار بھی ہیں؛ لیکن اس آبشار کی تعمیر ان بے شمار آنسوؤں سے کی گئی ہے، جو آج بھی بیواؤں، یتیموں اور غمزدہ بوڑھے ماں باپ کی آنکھوں سے جاری ہیں، یہ واقعی ایک ''کراماتی قتل'' ہے، جس میں مقتل سینکڑوں نہیں ہزاروں لاشوں سے سجا ہوا ہے؛ لیکن قاتل ایسا مردِ دانا ہے کہ نہ عدالت اس کے خنجر پر کوئی داغ دیکھ پاتی ہے اور نہ حکومت اس کے دامن پر خون کا کوئی دھبہ دریافت کر پاتی ہے، قاتل کا حال یہ ہے کہ وہ برسر اسٹیج اپنی درندگی کو جائز ٹھہراتا ہے، بے چارے مظلوم کی مظلومیت کا مذاق اڑاتا ہے؛ لیکن کیا مجال کہ پھر بھی اس اقراری مجرم کا جرم گرفت میں آسکے؛ بلکہ الٹے وہ فتح و کامیابی سے ہمکنار کیا جاتا ہے، ملک کے اعلیٰ قائدین؛ بلکہ وزیر اعظم تک ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں، مبارک بادیں دی جاتی ہیں اور پھولوں کا تحفہ گزرانا جاتا ہے۔

یہ بات کسی بھی معاشرہ کے لئے نہایت ہی بدبختی کی ہے اور ایسے لوگوں کی پذیرائی کسی بھی قوم کے لئے یقیناً شرم و عار کی بات ہے، اسلام نے نہ صرف ظلم سے بچنے کا حکم دیا ہے؛ بلکہ ظلم کو روکنے کا بھی حکم دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمائی کہ ظالم کا ہاتھ تھام لیا جائے؛ تاکہ وہ ظلم نہیں کر سکے، آپ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع سے جو فوج کشی کی اس کا بنیادی سبب یہی تھا کہ اہل مکہ کے حلیف بنوبکر نے بنوخزاعہ پر معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حملے کئے اور اہل مکہ نے بنوبکر کو روکنے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کی، نیز جب آپ ﷺ نے بنوخزاعہ کے مقتولین کی دیت (خون بہا) ادا کرنے کی بات اہل مکہ کے سامنے رکھی تو وہ اس کے لئے بھی آمادہ نہیں ہوئے، اس ظلم کو روکنے کے لئے آپ ﷺ نے بادل ناخواستہ فوج کشی فرمائی؛ حالاں کہ اس بات کا پورا امکان موجود تھا کہ حدود حرم میں جنگ کی نوبت آجائے، مگر پھر بھی آپ ﷺ نے اس سے گریز نہیں کیا، آپ ﷺ نے ایک مستقل قانون ''قسامہ'' کا مقرر کیا؛ کہ اگر کسی آبادی میں کوئی لاش پائی جائے اور قاتل کا پتہ نہیں چلے تو اس آبادی کے جن لوگوں پر قتل کا شبہ ہو، ان سب سے قسم لی جائے اور پوری آبادی سے اجتماعی طور پر دیت وصول کی جائے، گویا یہ اجتماعی جرمانہ کی ایک صورت ہے۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کو اس صورت حال کے تدارک کے لئے وہی طریقۂ کار اختیار کرنا چاہئے، جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں اختیار فرمایا تھا — ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ موجودہ قانون سے استفادہ کیا جائے اور ملک گیر سطح پر قانونی چارہ جوئی کا انتظام ہو، آپ ﷺ کے عہد میں قبائلی نظام کے تحت ''جوار'' اور ''امان'' کا قانون تھا، قبیلہ کا سردار یا اس قبیلہ کا کوئی شخص کسی کو اپنی پناہ میں لے لیتا تو وہ شخص اس پورے قبیلہ کی پناہ میں آجاتا اور اس کی حفاظت پورے قبیلہ کے ذمہ میں ہوتی، رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء نے اس سے فائدہ اٹھایا، حضرت ابوطالب کے انتقال کے بعد آپ ﷺ مطعم بن عدی کی پناہ میں آئے، دشمنانِ اسلام کے رویہ سے عاجز آکر حضرت ابوبکر ؓ مکہ چھوڑ کر جانا چاہتے تھے؛ لیکن ابن دغنہ نے کہا کہ آپ جیسا شخص مکہ کو نہیں چھوڑ سکتا، چنانچہ انہیں کی پناہ میں حضرت ابوبکر ؓ کی واپسی ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان جس سماج میں رہتے ہوں ظلم کو روکنے کے لئے وہاں کے مروجہ قانون سے استفادہ کرنا ان کا مذہبی فریضہ ہے، ہندوستان میں قانونی اعتبار سے ملزموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی گنجائش

موجود ہے؛ لیکن جب بھی فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے، ہم اس کے خلاف تقریریں کرتے ہیں، مضامین لکھتے ہیں، جمہوری طریقہ پر احتجاج کرتے ہیں، ذرائع ابلاغ میں ایسے واقعات کی مذمت کی جاتی ہے، پارلیمنٹ میں آواز اُٹھتی ہے اور بات آئی گئی ہوجاتی ہے، جمشید پور، راور کیلا، میرٹھ، ممبئی اور گجرات کتنے ہی خون ریز فرقہ وارانہ فسادات ہوچکے ہیں، خود سرکار کے بنائے ہوئے کمیشنوں کی رپورٹیں بھی آچکی ہیں؛ لیکن اس کے باوجود اس پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی، اگر حکومت انصاف کے حصول کے لئے مخلص ہوتی، تو ملزموں کا کیفر کردار تک پہنچنا چنداں دشوار نہیں تھا، جس کی مثال ۱۹۸۶ء کا ہندو سکھ فساد اور بھاگلپور کا فساد ہے، گو ان فسادات میں بھی مظلوموں کو پورا انصاف نہیں مل پایا ہے؛ لیکن جو کچھ ملا ہے اسے ہندوستان کی روایت کے لحاظ سے غنیمت کہا جاسکتا ہے، مسلم تنظیموں، جماعتوں، اداروں اور شخصیتوں کو چاہئے کہ وہ پورے ملک کی سطح پر مضبوط قانونی سیل خاص اس مقصد کے لئے بنائیں اور اس میں انسانی حقوق کی تنظیموں سے مدد لیں، جو فساد سے متعلق مقدمات دائر کرے، گواہان فراہم کرے، اور مسلسل پیروی کرے؛ تاکہ مجرم بچ نہ سکے، ملک گیر تنظیموں میں جمیعۃ العلماء، جماعت اسلامی ہند، ملی کونسل، مسلم لیگ، مجلس مشاورت اور ریاستی سطح کی تنظیموں میں امارت شرعیہ بہار، مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد اور مجلس تعمیر ملت وغیرہ اگر اس مقصد کے لئے اکٹھے ہوکر کوئی لائحہ عمل بنائیں تو انشاء اللہ یہ کوشش کامیاب اور نتیجہ خیز ہوگی۔

دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے لئے سیاسی اثر ورسوخ استعمال کرکے مؤثر قانون بنایا جائے، اسی طرح کا ایک قانون مرکزی حکومت کے زیر غور ہے، لیکن جن لوگوں نے اس بل کو دیکھا ہے، ان کا خیال ہے کہ اس میں خاصے نقائص موجود ہیں، اس قانون میں چند باتیں خاص طور پر شامل ہونی چاہئیں، اول اجتماعی جرمانہ —— یہ جرمانہ مجرم کے ساتھ ساتھ پورے سماج کو امن وامان قائم رکھنے میں ذمہ دار بناتا ہے؛ کیوں کہ ظلم کی روک تھام معاشرہ کی ذمہ داری ہے، اگر کسی معاشرہ میں ظلم ہوتا ہو؛ لیکن اس کی روک تھام نہیں ہوتی ہو، اس کی شہادتیں نہیں ملتی ہوں، لوگ مجرم کی پردہ داری کرتے ہوں یا مظلوم کے مقابلہ ظالم سے ہمدردی رکھتے ہوں تو وہ بھی جرم میں شریک ہیں؛ اسی لئے —— جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، —— اسلام نے قسامہ کا قانون رکھا ہے، نیز اسی لئے اسلام میں قاتل پر جو خون بہا عائد ہوتا ہے، اس کی ادائیگی میں

اس کے رشتہ داروں یا ہم پیشہ لوگوں کو بھی لازماً شریک ہونا پڑتا ہے، جن کو فقہ کی اصطلاح میں ’’عاقلہ ‘‘ کہا جاتا ہے، اس سے سماج کے مزاج میں تبدیلی آئے گی اور ایسے واقعات سے اپنے آپ کو بے تعلق رکھنے کا رجحان ختم ہوگا۔

دوسرا ضروری پہلو انصاف کے جلد سے جلد حاصل کرنے کو ممکن بنانا ہے، جیسے ہمارے ملک میں دہشت گردی کے مقدمات کو فاسٹ ٹریک عدالتوں کے ذریعہ فیصل کیا جاتا ہے اور مجرم کو کیفر کردار تک پہنچایا جاتا ہے، اسی طرح فرقہ وارانہ فسادات کے مجرمین کو بھی جلد سے جلد سزایاب کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، انصاف میں تاخیر بجائے خود ایک ناانصافی ہے، ایسے موقع پر اسلام کے نظام عدل کا نقشہ سامنے آتا ہے، جس میں گھنٹوں اور منٹوں میں فوجداری مقدمات کے فیصلے ہوا کرتے تھے اور آج بھی سعودی عرب جیسے مسلم ملک میں اس کا انتظام موجود ہے، اس سے نہ صرف مجرم میں خوف پیدا ہوتا ہے؛ بلکہ شہادت وثبوت کی فراہمی میں بھی آسانی ہوتی ہے، ورنہ آہستہ آہستہ ثبوت مٹادئے جاتے ہیں اور مجرم اپنے لئے سوراستے نکال لیتے ہیں۔

تیسرا ضروری نکتہ یہ ہے کہ کم سے کم اِس قانون کا تمام لوگوں پر مساویانہ اطلاق ہوتا ہو، الزام حاکم پر ہو یا محکوم پر، عوام کے منتخب نمائندوں پر ہو یا پولیس عہدہ داروں پر، ان پر مقدمہ دائر کرنے کے لئے قبل از وقت حکومت کی اجازت ضروری نہ ہو، اس طرح کا لزوم عام آدمی کے لئے حوصلہ شکنی کا باعث ہوتا ہے، جو لوگ سرکاری عہدوں پر ہوں، یا قیادت کی اگلی صف میں کھڑے ہوں، وہ تو عام لوگوں کے مقابلہ زیادہ جوابدہ ہیں؛ اس لئے ان کی جوابدہی کو ہلکا کرنا کوئی معقول بات نہیں ہے، اسلام کے نظام عدل میں اس بات کی بنیادی اہمیت ہے کہ کسی بھی عدالت میں کوئی بھی شہری سربراہ مملکت کے خلاف بھی مقدمہ دائر کرسکتا ہے، اور اس کو بھی اسی طرح اس الزام کا سامنا کرنا پڑے گا، جیسے دوسرے ملزمین کیا کرتے ہیں، خلافت راشدہ میں حضرت عمر ؓ اور حضرت علی ؓ کی نظیریں موجود ہیں، جو عام شہری کے دعوی پر عدالت میں حاضر ہوئے، کسی رو رعایت کے بغیر ان سے شواہد وثبوت طلب کئے گئے اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ خود ان کے خلاف قاضی کا فیصلہ ہوا۔

فسادات کی روک تھام سے متعلق قانون کے سلسلہ میں چوتھا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ

ہندوستان میں زیادہ تر فسادات سیاسی مقاصد کے لئے کئے ؛ بلکہ کرائے جاتے ہیں، ہندوتوا اور اب اس کی سخت گیر شکل ''مودی توا'' کا منشا یہی ہے کہ نفرت کی آگ اس قدر بھڑکائی جائے اور معاندانہ جذبات کو اتنا فروغ دیا جائے کہ ہندو قوم پرستی کے نام پر لوگ ووٹ دینے لگیں اور وہ سچائی اور انصاف کے معاملہ میں اندھے بہرے ہو جائیں، یہی حرکت کانگریس پارٹی بھی کرتی رہی ہے کہ فسادات کے ذریعہ مسلمانوں میں خوف کی نفسیات پیدا کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ کانگریس کے سوا ان کے لئے کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے، اگر قانون میں یہ بات شامل ہو کہ کسی عوامی نمائندہ یا نمائندگی کے امیدوار کی زبان، قلم اور عمل سے فرقہ وارانہ اشتعال کا ثبوت ملے گا تو اسے عوامی نمائندگی کے لئے نااہل سمجھا جائے گا اور اس پر سختی سے عمل کیا جائے تو اس بے لگام طبقہ پر کچھ نہ کچھ کنٹرول ہو سکے گا، ملک کی ترقی اور لوگوں کے حقیقی مسائل کو حل کئے بغیر فرقہ وارانہ جذبات کو ابھار کر ووٹ حاصل کرنا اور ایوان اقتدار میں پہنچنا نہایت ہی شرمناک بات ہے اور اس کے قابل مذمت ہونے میں دورائے نہیں ہو سکتی۔

کسی ذمہ داری کو حوالہ کرنے کے لئے صرف یہ بات کافی نہیں کہ اکیاون فیصد لوگ اس کے حق میں ووٹ دیدیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں اس ذمہ داری کو اٹھانے کی صلاحیت بھی ہو، قرآن مجید نے اس کے لئے بڑی جامع تعبیر اختیار کی ہے: ﴿ وَإِنَّ خَيْـرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْـقَوِيُّ الْأَمِيْنُ ﴾ (القصص :۲۶) یعنی: جس کو آپ کسی خدمت پر مامور کریں اس میں دو باتیں ضروری ہیں، ایک اس کام کو انجام دینے کی قوت وصلاحیت، دوسرے اس کے ساتھ ساتھ اپنی ذمہ داریوں میں امانت و دیانت کا پورا احساس، اگر کام کو انجام دینے کی صلاحیت ہی نہ ہو تو آدمی کتنا بھی مخلص ہو، وہ اپنے فرائض صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتا اور کام کی صلاحیت ہو؛ لیکن دیانت کا جذبہ مفقود ہو اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں مخلص نہ ہو تو پھر ظلم و زیادتی، ناانصافی اور حق تلفی کا دروازہ کھلتا ہے، صلاحیت اور امانت داری دونوں جمع ہوں تو انسان ذمہ داری کا اہل ہوتا ہے اور نااہل کو ذمہ داری سونپ دی جائے تو اسی سے خدا کی زمین میں فساد اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو قیامت کی علامت قرار دیا ہے کہ ذمہ داریاں نااہلوں کو سونپ دی جائیں:

"إذا وسد الأمر إلى غير أهله فانتظر الساعة"

(صحیح البخاری ، کتاب العلم ، باب من سئل علما ألخ ،حدیث نمبر:۵۹)

یہ نہ صرف اسلام کا مقرر کیا ہوا اصول ہے ؛ بلکہ یہی اس کائنات کی فطرت ہے اور انسان زندگی کے دوسرے شعبوں میں اسی اصول کو برتتا ہے، اگر کسی ناواقف شخص کو اکیاون فیصد لوگ ڈاکٹر یا انجینئر قرار دیدیں تو کیا کوئی یونیورسٹی اسے میڈیکل اور انجینئرنگ کی سرٹیفکٹ دے دے گی ؟ اگر کسی جاہل اور کندۂ ناتراش کو اکیاون فیصد لوگ معلم بنانے کی رائے دیں تو کیا اس کو معلم کی ذمہ داری سونپی جاسکتی ہے ؟ نہیں اور ہرگز نہیں ، تو جب ڈاکٹر وانجینئر اور معلم و مدرس بننے کے لئے صرف اکثریت کی رائے کافی نہیں ، اہلیت ولیاقت بھی مطلوب ہے تو کیا سب سے گئے گزرے لوگ سیاست میں حصہ لینے والے ہی ہیں کہ ان کے لئے صلاحیت اور کردار کا کوئی معیار نہ ہو؟ حالاں کہ ایک ڈاکٹر ، انجینئر یا معلم سے پچاس ، سو آدمی کے مسائل متعلق ہوتے ہیں ؛ لیکن عوام کے منتخب نمائندے ہزاروں اور لاکھوں افراد کی نمائندگی کرتے ہیں اور ملک وقوم کی تقدیر کے فیصلے ان کے ہاتھ میں ہوتے ہیں؟

ملک کے بہی خواہوں کو اس پہلو پر توجہ کرنی چاہئے ، جس جمہوریت کی بنیاد معیار پر نہ ہو ، صرف مقدار پر ہو ، جس نظام حکومت میں استعداد نہ دیکھی جاتی ہو ، صرف تعداد دیکھی جاتی ہو ، جہاں انسانوں کو گنا جاتا ہو ، تولا نہ جاتا ہو ، وہ نظام ہرگز عوام کی حقیقی فلاح کا ضامن نہیں ہوسکتا ؛ اس لئے کم سے کم سیاسی نمائندوں کے لئے یہ شرط تو ہونی ہی چاہئے کہ معاشرہ میں ان کا رول تخریبی نہ ہو ، وہ عوام کے محافظ ہونے کے بجائے جان و مال اور عزت وآبرو کے غارت گر نہ ہوں ، جب تک فرقہ وارانہ فسادات سے متعلق قانون سیاسی بازیگروں کو لگام نہیں دے اور ان کو تخریبی کاموں اور نفرت انگیز تقریروں سے روکنے میں کامیاب نہ ہو ، فسادات تھم نہیں سکتے ، ہندوستان میں اس کی واضح مثالیں موجود ہیں کہ جب حکمرانوں نے فسادات پر قابو پانے کی کوشش کی تو حساس ترین علاقے بھی فسادات سے محفوظ رہے اور جب حکمرانوں نے فساد کی آگ لگانی چاہی تو الفت ومحبت کا جو گھر مدتوں کی محنت سے تعمیر کیا گیا تھا ، وہ بھی لمحوں میں خاکستر ہوکر رہ گیا۔

تیسرا نہایت اہم اور ضروری کام ہے دوسرے گروہوں کو اپنے ساتھ لینا ، رسول اللہ ﷺ

نے مدینہ میں یہود اور بعض مشرک قبائل سے معاہدہ کیا، بنوخزاعہ اور کچھ دوسرے قبیلوں کو اپنا حلیف بنایا، اسی طرح ہندوستان میں ضرورت ہے کہ قبائلیوں، آدی باسیوں اور دلتوں کے ساتھ مسلمان اپنا اتحاد قائم کریں اور ان کو اپنے قریب کرنے کے لئے مناسب تدبیریں اختیار کریں ؛ کیوں کہ ہندوستان میں اکثریت اسی طبقہ کی ہے، برادران وطن میں ذات پات کی جو گہری کھائیاں ہیں، اس سے فائدہ اٹھائیں، ہندوستان جیسے ملک میں جہاں ذات پات کی تقسیم کے لحاظ سے اونچی ذاتیں خود اقلیت میں ہیں اور مسلمان ان کے مقابلہ اکثریت میں ہیں، مسلمان محض اپنی نادانی کی وجہ سے اقلیت بنے ہوئے ہیں، ہم لوگ خطبۂ جمعہ میں دعائیں تو خوب کرتے ہیں کہ اللہ دشمنوں کے شیرازہ کو منتشر کردے **''اللھم شتت شملھم ومزق جمعھم''**، لیکن عملی طور پر منفی جذبات اور تخریبی مقاصد کے تحت مسلمانوں کے خلاف ابھرنے والے فرقہ وارانہ اتحاد میں شگاف ڈالنے کی کوئی مؤثر اور منصوبہ بند کوشش نہیں کرتے ؛ حالاں کہ اس ملک میں خاص طور پر اس کے لئے بڑے مواقع موجود ہیں۔

یہ تو وہ تدبیریں ہیں جن کا مقصد فرقہ پرستوں کے اثرات کو روکنا اور ان کی سازشوں کو ناکام بنانا ہے ؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں خود اپنا محاسبہ بھی کرنا چاہئے ، امت محمدیہ دوسری قوموں کی طرح نہیں ہے، بقول علامہ اقبالؒ:

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

یہ امت ایک داعی امت ہے، جس کا کام محبت کی تلوار اور حسن سلوک کے ہتھیار کے ذریعہ دشمنوں کے دلوں کو فتح کرنا ہے، جس کا مقصد ہر طرح کی قربانی دے کر خدا کی زمین میں خدا کے دین کو نافذ کرنا اور ایک ایک گھر میں اسلام کے پیغام کو پہنچانا ہے، یہ صرف اپنے مسائل کے لئے نہیں بھیجی گئی ؛ بلکہ انسانیت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے بھیجی گئی ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (ال عمران:۱۱۰) یہ امت بحیثیت امت نبوت کے مقام پر فائز ہے، رسول اللہ ﷺ اس امت کی طرف مبعوث ہوئے اور یہ امت پوری انسانیت کی طرف مبعوث ہے، جیسے نبی کے دل میں انسانیت کی اتھاہ محبت ہوتی ہے، وہ اپنے آپ پر پتھر پھینکنے والوں کو بھی دعائیں دیتا ہے اور اسے بھی آخرت کے عذاب سے بچانے کی کوشش کرتا ہے، یہی کردار اس امت سے مطلوب

ہے۔

جب انسان کسی کو اپنے کام میں لگاتا ہے اور وہ ایک مخلص مزدور کی طرح اپنی ذمہ داری کو انجام دیتا ہے تو اس کی حفاظت کے سوجتن کئے جاتے ہیں، اس کو کسی دشمن کے حوالہ نہیں کیا جاتا، بلکہ لوگ اس کا انشورنس بھی کراتے ہیں، تو جو امت خدا کے دین کی خدمت کرے گی اور اللہ کی طرف سے سپرد کئے ہوئے کام کو اس کے حکم کے مطابق انجام دے گی، کیا اللہ کی مدد اس کے ساتھ نہیں ہوگی اور خدا اس کی حفاظت نہیں کرے گا؟ اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ سے صاف کہا ہے کہ آپ دعوت دین کا حق ادا کریں، لوگوں سے آپ کی حفاظت میری ذمہ داری ہے:

﴿يٰـأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْکَ مِنْ رَّبِّکَ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَه ، وَاللّٰهُ يَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدہ :٦٧)

یہ خطاب تو بظاہر رسول اللہ ﷺ سے ہے؛ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے تمام مسلمانوں سے ہے، اور قرآن مجید کا عام اسلوب یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی عظمت واحترام کے پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے خطاب تو آپ ﷺ سے ہوتا ہے؛ لیکن پوری امت اس کی مخاطب ہوتی ہے، قرآن مجید نے مسلمانوں کی فتح مندی کا بھی یہی نسخۂ کیمیاء بتایا ہے، کہ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور مسلمانوں سے دوستی رکھے گا، وہی مآل کار غالب رہے گا:

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَه وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا فَإِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ﴾ (المائدہ :٥٦)

اس آیت میں غلبہ کی بنیاد خدا، رسول اور ایمان والوں سے تعلق ہے، اس کا مطلب ہے کہ یہ تعلق جس درجہ قوی ہوگا، اسی درجہ اللہ کی مدد بھی شریک حال رہے گی اور جس درجہ کمزور ہوگا، اسی قدر اللہ کی مدد بھی اپنا منہ موڑ لے گی۔

آج کل بعض حضرات کہتے ہیں کہ مسلمان یہود ونصاری اور دوسری اقوام کے مقابلہ کیوں ذلیل وخوار ہیں اور ان کی پسماندگی اور بے آبروئی کا کیا سبب ہے؟ لیکن وہ خود اپنے دامن کو نہیں دیکھتے، ایسا نہیں ہے کہ امت کے دامن پر اللہ تعالی کی نافرمانی اور معصیت کے داغ دھبے ہیں؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ پورا دامن ہی سیاہ ہے، کہیں کہیں ایمان کا کوئی چمکتا ہوا ذرہ نظر آجاتا ہے،

آج عالم اسلام، ایشیا، افریقہ سے گزر کر یورپ کے بھی اچھے خاصے علاقہ کا احاطہ کرتا ہے، دنیا کی آبادی کے لحاظ سے ہر چار شخص میں سے ایک مسلمان ہے، یہ خطہ قدرتی وسائل سے ایسا مالا مال ہے کہ دنیا کی لالچی نگاہیں اس کی طرف اٹھی ہوئی ہیں؛ لیکن کیا خدا کی زمین میں کوئی چھوٹا سے چھوٹا شہر بھی ایسا ہے، جہاں خدا کا پورا دین نافذ ہو؟ اور امت کا کوئی گروہ بھی ایسا ہے جس نے زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی شعبوں میں اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت کو اپنے لئے کسوٹی بنایا ہو؟ ظاہر ہے کہ جب ہم اپنا داعیانہ کردار چھوڑ دیں گے، جب خدا کی بھیجی ہوئی شریعت سے زیادہ مغربی تمدن ہمیں بھائے گا، جب محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے بجائے اللہ کے باغیوں کی زندگی ہمارے لئے اسوہ اور آئیڈیل قرار پائے گی تو کیسے اللہ کی مدد ہماری طرف متوجہ ہوگی؟ اس لئے ضرورت خود احتسابی کی بھی ہے۔

آیئے! ہم عہد کریں کہ ہم اس ملک میں داعیانہ کردار ادا کریں گے، ہماری زندگی پیغمبرانہ اخلاق سے آراستہ ہوگی، ہم وقتی جوش وخروش کے بجائے مؤمنانہ فراست سے کام لے کر اپنے مسائل کے حل کے لئے منصوبہ بندی کریں گے، ہم اس ملک کے کچلے ہوئے مظلوم طبقہ کے درد کا درماں بن کر کام کریں گے اور اس قوم کے سامنے ایسا کردار پیش کریں گے کہ ہم برادران وطن کی نگاہوں میں امن وآشتی کے سفیر سمجھے جائیں، جبھی ہم نفرت کے سوداگروں کا مقابلہ کرسکیں گے اور فرقہ وارانہ منافرت کی آگ کو بجھا سکیں گے؛ تاکہ ''مودی توا'' کے لئے اس ملک کی زمین تنگ ہوجائے۔

۲۸/ دسمبر ۲۰۰۷ء، ۴/ جنوری ۲۰۰۸ء

ترکی کی واپسی

اسلام کی طاقت تیغ وشمشیر اور توپ وتفنگ نہیں ہے؛ بلکہ اس کی معقولیت، قانون قدرت سے ہم آہنگی اور انسانی زندگی کے مصالح کو پورا کرنے کی صلاحیت ہے، قلعے توپ کے گولے اور آتش ریز بموں کے ذریعہ مسمار کئے جاسکتے ہیں، سنگ وخشت سے بنے ہوئے قصور ومحلات کو زمین بوس کیا جاسکتا ہے، آبادیاں اجاڑی جاسکتی ہیں، انسان اپنی خون آشام طبیعت کے ذریعہ گلشن کو صحرا میں تبدیل کرسکتا ہے، عورتوں کو سہاگ کی چادر، بچوں کو ماں باپ کی شفقت ومحبت اور والدین کو اپنے لخت جگر اور محبت کے پھول سے محروم کیا جاسکتا ہے؛ لیکن دلوں میں ایمان ویقین کے جو پودے لگ گئے ہوں، ان کو اس سے محروم نہیں کیا جاسکتا، یہ وہ نشہ نہیں ہے، جو حالات کی ترشی سے کافور ہوجائے، اس راہ کا مسافر کانٹوں کے بستر پر چل سکتا ہے؛ لیکن اپنے ضمیر کا سودا کرکے پھولوں کی سیج خرید نہیں سکتا، انہیں جتنا ڈرایا جاتا ہے، اسی قدر ان کا حوصلہ بڑھتا جاتا ہے، اور انہیں جس قدر خوف زدہ کیا جاتا ہے، اسی نسبت سے ولولے انگڑائیاں لینے لگتے ہیں…

اس حقیقت کا اظہار اسلامی تاریخ میں بار بار ہوا ہے اور ہوتا رہے گا، اسی کی ایک مثال اس وقت ''ترکی'' ہے، سات کروڑ آبادی کے اس ملک میں ننانوے فیصد سے زیادہ لوگ مسلمان ہیں، ترکی کی اہمیت کا پہلو یہ ہے کہ اس کی حیثیت ایشیا اور عالم اسلام اور دوسری طرف یورپ کے درمیان ایک پل کی ہے، ترکی کا بڑا حصہ ایشیا میں اور کچھ حصہ یورپ میں واقع ہے، اور ترکی قوم کو ایک تاریخی اہمیت حاصل رہی ہے، یوں تو ''قسطنطنیہ'' اسلام کے قرن اول ہی میں فتح ہو چکا تھا، لیکن ترکی کا یہ پورا علاقہ سلجوقی حکمرانوں نے صلیبی دنیا کو شکست دے کر حاصل کیا، اور پھر ایک عرصہ تک ایران اور وسط ایشیا سے لے کر شرق اوسط کے علاقوں تک سلجوقیوں کی عظیم الشان سلطنت قائم ہوگئی، جو نہ صرف عالم اسلام کی سب سے بڑی حکومت تھی؛ بلکہ اسے دنیا کی سب سے بڑے

خطہ کی نمائندگی کرنے والی حکومت کا اعزاز بھی حاصل تھا، یہاں تک کہ تیرہویں صدی میں منگولوں کے حملے شروع ہوئے، سلجوقی حکومت کا خاتمہ ہوا اور یہ ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہوگیا، اسی دور میں ترکی کے ایک چھوٹے سے حصہ پر ایک سردار لشکر ''عثمان (اول)'' نے قبضہ کرلیا، اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر قبضہ کرتے ہوئے ایک بڑی سلطنت کی بنیاد رکھی جس کو ''خلافت عثمانیہ'' کہا جاتا ہے۔

خلافت عثمانیہ کا دائرہ، ایشیا، یورپ اور افریقہ تک وسیع تھا اور موجودہ بلگریڈ سے لے کر الجیریا اور نجد وحجاز تک ان کی حکمرانی تھی، تیرہویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے اوائل تک یہ عظیم الشان سلطنت دنیا کے نقشہ پر ایک عظیم طاقت کی حیثیت سے موجود تھی، اور ہندوستان جیسے ممالک جہاں مسلمانوں کی الگ سلطنتیں قائم تھیں، وہاں بھی جمعہ کے خطبوں میں خلافت عثمانیہ کے سلطان کا نام بحیثیت خلیفہ پڑھا جاتا تھا، اس طرح گویا پورے عالم اسلام کے لئے یہ سلطنت اتحاد کی علامت تھی، اس حکومت کا زوال بیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوا، اس کے کچھ حصہ پر زار روس اور کچھ پر عرب جنگجوؤں نے قبضہ کرلیا، پہلی جنگ عظیم میں خلافت عثمانیہ جرمنی کی طرف دار تھی، جب اتحادی فوجیں فتح یاب ہوئیں، تو ۱۹۱۴ء میں انہوں نے ترکی پر قبضہ کرلیا، اس کے بعد ایک ترک فوجی جنرل مصطفی کمال پاشا نے بظاہر انگریزوں کے خلاف تحریک شروع کی اور ۱۹۲۳ء میں ترکی کو آزادی حاصل ہوئی، مصطفی کمال پاشا جن کو ترک قوم ایک مسیحا کی حیثیت سے جانتی ہے اور جن کو ''اتاترک''، یعنی بابائے قوم کا لقب دیا گیا ہے، بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ وہ اندرونی طور پر صہیونی اور صلیبی طاقتوں سے ملا ہوا تھا اور اس نے مغربی قوتوں کے آلۂ کار کی حیثیت سے ترکوں میں کام کیا، اس نے دوسری جنگ عظیم میں اتحادیوں کا ساتھ دیا، ترکی کو ایک سیکولر ملک قرار دیا، اور خلافت عثمانیہ کو ہمیشہ ہمیش کے لئے ختم کردیا۔

سیکولرزم کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ ملک میں رہنے والے تمام لوگ اپنے اپنے عقیدہ اور مذہب کے مطابق عمل کریں، ان پر کسی مذہب کو مسلط نہیں کیا جائے؛ لیکن ترکی میں سیکولرزم کا مفہوم اسلام کی مخالفت اور عداوت قرار پایا، مسجد ''ایا صوفیہ'' کو میوزیم میں تبدیل کردیا گیا، عربی رسم الخط کی جگہ رومن رسم الخط کو رواج دیا گیا، اسلامی اجتماعات پر پابندی عائد کردی گئی، اسکولوں،

کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب سے اسلامیات کو خارج کر دیا گیا، داڑھی اور مسلمانوں کے طرز کی ٹوپی ایک ناپسندیدہ شے ٹھہری، یہودیوں کی طرز پر ہیٹ پہننے کا حکم دیا گیا، خواتین کو حجاب اور نقاب کے استعمال سے منع کیا گیا، اور یہ سب فوجی حکومت نے بے پناہ ظلم و جبر کے سایہ میں کیا، ترک مسلمان مسلسل جنگوں اور غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف جد و جہد اور قربانیوں کی وجہ سے اس مقام پر آ گئے تھے کہ وہ فوری طور پر اس کے خلاف کوئی طاقت ور تحریک چلانے کے موقف میں نہیں تھے، اس لئے انہوں نے بادلِ ناخواستہ اس صورت حال کو گوارا کر لیا؛ لیکن اندرونی طور پر وہ کبھی بھی اس سے راضی نہیں رہے۔

یہاں تک کہ ۱۹۴۵ء میں ایک جماعتی حکومت کے نظام کا خاتمہ ہوا، جس کی آڑ میں فوج حکومت کیا کرتی تھی اور ملک حقیقی معنوں میں جمہوریت کی طرف بڑھا، اس دوران بار بار فوجی بغاوتیں بھی ہوتی رہیں، یہاں تک کہ ۱۹۸۳ء میں عوامی دباؤ کے تحت فوج نے اقتدار عوام کے حوالہ کر دیا، اور وہاں اسلام پسند جماعت ''رفاہ پارٹی'' برسر اقتدار آئی، افسوس کہ کسی معقول وجہ کے بغیر فوج نے ایک کامیاب پارٹی کو اقتدار سے محروم کر دیا، اور زبردستی رفاہ پارٹی تحلیل کر دی گئی ؛ لیکن ترکوں کی حمیت ایمانی اور غیرت دینی کروٹ لیتی رہی، داڑھی رکھنے کا رواج بڑھتا گیا اور لڑکیوں نے عام طور پر حجاب استعمال کرنا شروع کر دیا، ترک حکومت نے اس سلسلہ میں تشدد کا راستہ بھی اختیار کیا؛ لیکن عوامی رجحان میں اس سے کوئی فرق نہیں آیا، یہاں تک کہ پارلیمنٹ میں Justice and developmnet party (جماعت برائے انصاف و ترقی) کو نمایاں اکثریت حاصل ہوگئی، اللہ کا شکر ہے کہ اس نئی حکومت نے نہایت حکمت اور مصلحت کے ساتھ تدریجی طور پر مصطفیٰ کمال پاشا کی پالیسی سے ترک عوام کو آزاد کرانا شروع کیا ہے، اور اس کا آغاز حجاب پر پابندی کے خاتمہ کے ذریعہ کیا گیا ہے؛ حالاں کہ اسلام میں خواتین کے لئے ایسا پردہ ہے، جو اس کے سراپا کو ڈھنکتا ہو اور موجودہ عہد میں فقہاء نے چہرہ کو بھی پردہ میں شامل رکھا ہے، جبکہ اسکارف کے ذریعہ صرف سر کے بال ہی چھپائے جا سکتے ہیں؛ لیکن اس قانون کو ایک علامتی عمل کی حیثیت سے دیکھنا چاہئے، یہ علامت ہے مغرب کی غلامی سے خدا کی غلامی کی طرف لوٹنے کی، یہ علامت ہے بے حیائی سے شرم و حیا کی طرف واپس ہونے کی اور یہ علامت ہے کفر سے اسلام کی

طرف ہجرت کی۔

یہی وہ حقیقت ہے جس نے بظاہر اس چھوٹے سے واقعہ کو امریکہ اور یورپ کے لئے پریشانی کا باعث بنا دیا ہے، اس وقت مغربی صحافت، ذرائع ابلاغ اور ایوان سیاست میں ایک شور سا برپا ہے، گویا کتنی بڑی قدرتی آفت پوری دنیا میں آ گئی ہو، عجیب بات یہ ہے کہ مغرب انسان کو بے لباس تو چلنے کی اجازت دیتا ہے، لیکن شریفانہ لباس پر پابندی ہے، بے حیائی پر کوئی روک ٹوک نہیں، لیکن شرم وحیا کو ایک جرم سمجھتا جاتا ہے، اگر کوئی خاتون اپنا سر چھپا کر اسکولوں اور کالجوں میں جائے، پارلیمنٹ اور بازاروں میں جائے، تو آخر اس سے انسانیت کو کیا خطرہ درپیش ہے؟ کیا اس سے انسانی جانیں خطرہ میں پڑ جائیں گی؟ انسان کے مال واسباب تباہ ہو جائیں گے؟ سمندر میں بھونچال آ جائے گا؟ زمین میں زلزلہ شروع ہو جائے گا؟ جو چیزیں حقیقت میں انسانیت کو تباہ کرنے والی ہیں، ان کے بارے میں مغرب کو کوئی فکر نہیں ہے، وہ اپنے نیوکلیر اسلحہ اور کیمیائی ہتھیار کو ختم تو کیا، کم بھی کرنے پر آمادہ نہیں، وہ کم خرچ کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ تجارت اور معاشی فوائد کے حصول کی غرض سے ایسی ٹکنالوجی کا استعمال کر رہے ہیں، جو پوری دنیا کے ماحولیاتی توازن پر اثر انداز ہو رہا ہے، اور دنیا اس کی وجہ سے ایک حقیقی خطرہ سے دوچار ہے؛ لیکن اس سلسلہ میں امریکہ اور مغرب کسی تعاون کے لئے تیار نہیں، مگر ایک ایسا مسئلہ جس کا تعلق ایک قوم کے اپنے مزاج و مذاق سے ہے، اس کے بارے میں فکرمندی نامعقول حد تک بڑھی ہوئی ہے، یہ بات بھی ایک لطیفہ سے کم نہیں ہے کہ بہت سے مغربی ملکوں میں اسکارف پہننے کی اجازت ہے، عدالتیں اس کے حق میں فیصلہ کرتی ہیں، مگر وہی عمل ترکی کے لئے قابل قبول نہیں سمجھا جاتا۔

غور کیا جائے تو یہ انسانی فطرت کے بھی خلاف ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذوق انتخاب میں فرق رکھا ہے، کسی کو سفید کپڑے پسند ہیں، کسی کو سیاہ، کسی کو سرخ، کسی کو کوئی اور رنگ زیادہ بھاتا ہے، یہی حال کپڑے کی ڈیزائن اور اس کی تراش وخراش کا ہے، کوئی چاہتا ہے کہ اس کا کپڑا پورے جسم کو چھپائے، کسی کو یہ بات پسند نہیں، کوئی ڈھیلا ڈھالا کپڑا پہننا چاہتا ہے، کسی کو چست کپڑے اچھے لگتے ہیں، اخلاقی اور مذہبی اعتبار سے انسان کی پسند کے صحیح ہونے اور نہ ہونے سے قطع نظر ہر شخص کی پسند الگ الگ ہے اور اسی اختلاف ذوق سے کائنات کی رنگا رنگی قائم ہے، اگر تمام

انسانوں کوسفید کپڑے ہی پسند آتے ،توایسا لگتا کہ سڑکوں پر بیلوں اور گایوں کا انبوہ چل رہا ہے،اگر ہر شخص سیاہ کپڑے ہی کا پرستار ہوتا تو یوں محسوس ہوتا کہ سڑکوں اور گلیوں میں ہر طرف بھینسوں کا قافلہ رواں دواں ہے،لیکن خدا نے انسان کوایسی یک رنگ مخلوق نہیں بنایا،اس کے خلقی وجود میں بھی تنوع رکھا گیا ہے،اوراس کی پسند میں بھی رنگارنگی ہے،اس رنگارنگی کوختم کر دینا ایک غیر فطری عمل ہے جو بے جا جبر واکراہ کے ذریعہ تو وجود میں آسکتا ہے،جمہوریت اور آزادی کے ماحول میں ایسا نہیں ہوسکتا ، افغانستان میں طالبان نے غیر مسلم بھائیوں سے خواہش کی تھی کہ وہ لباس کے ذریعہ اپنے آپ کوممتاز رکھیں ،تا کہ داڑھی اور نماز کے سلسلہ میں پولیس کی ہراسانی کا شکار نہ ہوں ، اس پر پوری دنیا میں شور مچایا گیا،لیکن کیا مسلمان خواتین کوحجاب سے بالجبر روکنا ،مردوں کو داڑھی رکھنے سے منع کرنا،سکھوں کو پگڑی باندھنے کی اجازت نہیں دینا اور سکھ خواتین کوان کی قومی روایت کے مطابق دوپٹہ اوڑھنے سے روکنا ، کیا لباس کے معاملہ میں امتیاز نہیں ہے، کیا یہ آزادی ہے کہ آپ دوسروں پر اپنی پسند کا لباس تھوپ دیں؛اس لئے اسلامی نقطۂ نظر سے ہٹ کر اگر انصاف کے اصولوں کوسامنے رکھ کرغور کیا جائے تب بھی مغرب کا اسکارف کی اجازت پر برہم ہونا نہایت ہی نامعقول اور نامنصفانہ بات ہے۔

اس واقعہ میں مسلمانوں کے لئے عبرت وموعظت کے مختلف پہلو ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے دینی اور تہذیبی اقدار پر ثابت قدم رہنا چاہئے ، آزمائشیں طوفانوں کی طرح آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں،ان سے خوف کھا کر اسلامی تعلیمات کو چھوڑ دینا، یا خلافِ شرع بات کوقبول کر لینا نہایت بدبختانہ بات ہے اور اپنے ضمیر کو بیچ لینے کے مترادف ہے۔

دوسرے : مسلمانوں کو چاہئے کہ جب نامنصفانہ طور پر دشمنان اسلام اپنی سازش میں کامیاب ہو جائیں اور امت کے کسی طبقہ کو وہ اپنے لئے آلۂ کار بنالیں تو پرامن وسائل کے ذریعہ تدریجاً اسے بدلنے کی کوشش کریں ، ایسے جوش کا ثبوت نہ دیں ، جو ہو تو خلوص پر مبنی ؛لیکن اس کے نتائج کے منفی ہونے اور مزید نقصان دہ بن جانے کا خطرہ ہو۔

تیسرے : وہ انقلاب دیر پا نہیں ہوتا جو طاقت کے ذریعہ مسلط ہوتا ہے،حقیقی انقلاب یہ

ہے کہ انسان کے اندر سے تبدیلیاں آئیں اور اس کے دل و دماغ میں اسلام کی جڑیں پیوست ہوں، کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ترکی میں یہ خاموش انقلاب نہیں آیا ہوتا۔

چوتھے: مسلمانوں کو یہ بات اپنے ذہن میں رکھنی چاہئے، کہ یہودی اور عیسائی طاقتیں اتفاقی طور پر مسلمانوں کے مدمقابل آ گئی ہوں، ایسا نہیں ہے، یہ ایک منصوبہ اور دوررس سازش کے ساتھ اسلامی اقدار کو ختم کرنے کی عالمی کوشش ہے، یہ سمجھنا کہ مغربی ممالک تجارتی فوائد پہنچانے، فوجی ٹھکانے فراہم کرنے اور خفیہ معاہدوں کی بناء پر مفت یا سستا پٹرول دینے کی وجہ سے خوش ہو جائیں گے، محض خوش فہمی ہے، درحقیقت وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنے ایمانی اثاثہ سے محروم ہو جائیں، اور پوری طرح اپنے وجود کو مغربی تہذیب میں گم کر دیں، اس لئے جو روشن خیال مسلمان اس خیال میں ہیں کہ مسلمان مغرب کے مطالبات کو قبول کر کے موجودہ تصادم کو دور کر سکتے ہیں، وہ دھوکہ میں ہیں۔

۲۲/فروری ۲۰۰۸ء

دہشت گردی مخالف کانفرنسیں

یہودیوں کی فطرت میں انبیاء کرام کوایذا پہنچانا اور تکلیف دینا شامل رہا ہے اور اس پر ان کی پوری تاریخ شاہد ہے، اسی سلسلہ کا ایک واقعہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں حاضر ہوا کرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے ''راعنا'' کا لفظ استعمال کیا کرتے، عربی میں اس لفظ کے معنی ہیں ''ہماری طرف توجہ دیجئے'' اور عبرانی زبان میں یہ لفظ ناشائستہ مفہوم کے لئے ہے، ان کا مقصد مسلمانوں کو دھوکہ دینا اور در پردہ آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کرنا ہوتا، چنانچہ اسی پس منظر میں قرآن مجید کی آیت نازل ہوئی :

''اے ایمان والو!'' رَاعِنَا ''نہ کہو،''اُنْظُرْنَا'' کہو، نیز آپ کی باتوں کوسنواور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے''(البقرہ :۱۰۴)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اپنے قول وفعل اور تعبیرات وعنوانات میں اعداء اسلام کی مماثلث سے بچنا چاہئے، اگر ان کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو مجروح کرنا ہو، چنانچہ مشہور مفسر علامہ ابن کثیرؒ نے اس سے یہی بات اخذ کی ہے :

'' نهى الله تعالىٰ عباده المومنين أن يتشبهوا بالكافرين فى مقالهم وفعالهم '' (تفسیر ابن کثیر :۱/۱۴۸)

——امام رازیؒ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے،(تفسیر کبیر للرازی :۲/۳۰۵)

آج کل مغربی دنیا نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہی رویہ اختیار کیا ہے، یہ اپنے مظالم اور نامنصفانہ رویہ پر پردہ ڈالنے اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے نئے نئے عنوانات ایجاد کرتے رہتے ہیں، کبھی مسلمانوں کو بنیاد پرست کہا جاتا ہے، کبھی رجعت پسند، کبھی قدامت پرست اور کبھی شدت پسند، آج کل انھیں ''دہشت گرد'' کا نیا خطاب دیا گیا ہے، ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہم

ان عنوانات کو بہ سروچشم قبول کر لیتے ہیں اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر معذرت خواہی کرنے لگتے ہیں، ہمارے اسی طرز عمل کی ایک مثال دہشت گردی مخالف پروگراموں کی کثرت ہے، ماضی قریب میں ہندوستان کی ایک بڑی دینی درسگاہ نے بڑے پیمانہ پر ’’دہشت گردی مخالف کانفرنس‘‘ منعقد کی، اس نے اپنی روایت کے خلاف مختلف مکاتبِ فکر کے نمائندوں کو مدعو کیا، پورے ملک میں اس کی دھوم مچی؛ بلکہ بین الاقوامی سطح پر ذرائع ابلاغ نے اس کو سراہا؛ کیوں کہ ان کے خیال میں یہ ایک ایسے ادارہ سے دہشت گردی کی مخالفت کا اعلان تھا، جو دہشت گردی کا فکری سرچشمہ رہا ہے، یہاں تک کہ بی جے پی اور اس کے سخت گیر رہنما ایل کے اڈوانی نے بھی اس کو ایک بہتر پیش رفت قرار دیا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مذکورہ ادارہ نے یہ کانفرنس پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ منعقد کی ہے؛ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب کسی کے بارے میں بار بار کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کے اندر یہ برائی ہے اور اس کے بعد وہی متہم شخص اس برائی کے خلاف مہم شروع کرتا ہے، تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی غلطی کا اعتراف اور اس کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش ہے اور اس سے معاندین کو مزید تقویت پہنچتی ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ صرف اس کانفرنس ہی پر اکتفاء نہیں کیا گیا؛ بلکہ طے کیا گیا کہ پورے ملک میں انھیں خطوط پر دہشت گردی مخالف کانفرنسیں کی جائیں؛ چنانچہ ملک کے اکثر صوبوں میں یا تو اس عنوان پر کانفرنسیں ہو چکی ہیں یا ہونے جارہی ہیں، کچھ عرصہ پہلے ایک ہفتہ راقم الحروف کو ’’دہلی‘‘ میں قیام کی نوبت آئی، وہاں ملک کی ایک تاریخی مسلم تنظیم کے ایک فریق نے بڑے پیمانہ پر ’’دہشت گردی مخالف کانفرنس‘‘ منعقد کی، جس میں مختلف علاقوں سے بڑی تعداد میں سامعین اکٹھا کئے گئے اور پورے پروگرام کو ٹی وی پر نشر کیا گیا، اس سے ایک دن پہلے اسی تنظیم کے ایک حصہ —— جو دس سال پہلے تنظیم سے الگ ہو گیا تھا—— نے اسی موضوع پر پریس کانفرنس منعقد کی، جس میں پنجاب کے ایک نمائندہ نے تلوار دکھا کر دہشت گردی کے خلاف اپنے عزم مصمم کا اظہار کیا، اس بڑے پروگرام کے دوسرے دن ایک اور تنظیم نے دہشت گردی کے خلاف ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے کانفرنس ہال میں ’انٹرنیشنل کانفرنس‘ اسی عنوان پر منعقد کی، جس میں پڑوسی مسلم ملک کے نمائندہ نے دینی مدارس کو دہشت گردی کا اصل سرچشمہ قرار دیا، معلوم ہوا کہ ابھی چند ہی

دنوں پہلے مذکورہ تنظیم کے ایک اور فریق نے اس کانفرنس سے کسی قدر کم ؛لیکن بڑے پیمانہ پر ہی دہشت گردی مخالف کانفرنس منعقد کی تھی ،ایک اور ملی تنظیم نے اس سے کچھ عرصہ پہلے اسی موضوع پر کانفرنس منعقد کی تھی اور ابھی مختلف شہروں میں دینی تنظیموں ، جماعتوں اور درسگاہوں کے زیر انتظام ایسی کانفرنسوں کا سلسلہ جاری ہے ،ان کانفرنسوں میں بار بار یہ بات دہرائی جارہی ہے کہ ''اسلام دہشت گردی کا مذہب نہیں ہے ، عام مسلمان دہشت گردی نہیں کرتا ،ہم دہشت گردی کے اتنے ہی مخالف ہیں ، جتنا کہ دوسرے لوگ ، جولوگ دہشت گردی میں مبتلا ہیں وہ حقیقی مسلمان نہیں ہیں'' بہت سے جلسوں میں سامعین — جوعموماً مسلمان ہی ہوتے ہیں — سے حلف بھی لیا جارہا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دہشت گردی سے دور رکھیں گے۔

عام طور پر ہمارے ایسے پروگراموں کو معذرت خواہی تصور کیا جارہا ہے اور سادہ لوح غیر مسلم برادران وطن سوچ رہے ہیں کہ کچھ تو غلطی ان سے ضرور ہوئی ہے ،جبھی تو یہ چیخ چیخ کر ہر جگہ اپنے دہشت گرد نہ ہونے کا اعلان کررہے ہیں ، ورنہ تمام قوموں کو چھوڑ کر مسلمان ہی ایسے جلسے کیوں کرتے ہیں ؟ اگر دینی تنظیمیں اور درسگاہیں امن ، انصاف اور بھائی چارہ کو عنوان بنا کر پروگرام کرتیں اور ان پروگراموں پر خالص مسلم اداروں کا بینر لگانے کے بجائے برادرانِ وطن کو ساتھ لے کر ان کے اشتراک کے ساتھ کوئی پلیٹ فارم بنایا جاتا ،جیسا کہ ہندوستان کے صاحبِ نظر عالم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ''پیامِ انسانیت'' تحریک شروع کی تھی تو یہ زیادہ بہتر بات ہوتی ، دہشت گردی مخالف تحریک دراصل اس دور کا ''راعنا'' یعنی دشمنان اسلام کی تعبیر اور ان کے نعرہ کو قبول کرنا ہے اور اس سے نادانستہ اسلام کی اور مسلمانوں کی تصویر خراب ہورہی ہے۔

آج تک دہشت گردی کی تعریف متعین نہیں ہوسکی ، یہ بات طے نہیں پائی کہ دہشت گردی اور مظلوموں کے حق کی مدافعت کے درمیان خط فاصل کیا ہے؟ دہشت گردی افراد کی طرف سے بھی ہوتی ہے ،تنظیموں کی طرف سے بھی اور حکومتوں کی طرف سے بھی ،اس پہلو کو نظر انداز کیا جارہا ہے ، دہشت گردی کو ختم کرنے کے لئے کیا طریقۂ کار اختیار کیا جائے اور اس میں طاقت کے استعمال کی حدود کیا ہیں؟ اس پر کوئی بحث نہیں کی جاتی ہے ، دہشت گردی کے حقیقی اسباب ''ظلم و نا انصافی'' کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے ؛ تاکہ اس کی جڑ کھوکھلی ہوجائے ، اس پر بھی توجہ نہیں دی

جاتی ہے ؛ بلکہ دہشت گردی کے مبہم اور نا منصفانہ تصور کے ساتھ اس کو کچلنے اور اس سلسلہ میں انسانیت کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دینے کی کوشش کی جارہی ہے ، ان حالات میں دہشت گردی کا عنوان نہایت مبہم بھی ہے اور ظالموں کے لئے ڈھال بھی ہے۔

بدقسمتی سے دہشت گردی کی تعبیر عربی زبان میں جس لفظ سے کی جارہی ہے، وہ ''ارہاب'' ہے،جس کو قرآن مجید نے موقع ومحل کے لحاظ سے قابل تعریف بھی قرار دیا ہے اور قابل مذمت بھی ، فرعون کے دربار میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کا مقابلہ ہوا ،تو جادوگروں نے اپنے فن کے حیران کن مظاہر پیش کئے اور قرآن مجید کے الفاظ میں لوگوں کو خوف و دہشت میں مبتلا کردیا:

﴿فَلَمَّا أَلْقَوْاْ سَحَرُواْ أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ وَجَاء وا بِسِحْرٍ عَظِيمٍ﴾ (الاعراف :۱۱۶)

دوسری طرف قرآن مجید میں مسلمانوں کو اس بات کی تلقین بھی کی گئی ہے کہ وہ اپنی فوجی طاقت کو بڑھائیں؛ تاکہ دشمنوں پر رعب اور دہشت باقی رہے:

﴿وَأَعِدُّواْ لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّنْ قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لاَ تَعْلَمُوْنَهُمُ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ﴾ (الانفال :۶۰)

غرض کہ قرآن مجید کی نظر میں دہشت پیدا کرنے کا درست یا نادرست ہونا مقاصد و نتائج پر مبنی ہے، اگر اس کا مقصد بےقصور لوگ کو خوف و دہشت میں مبتلا کرنا ہو تب تو یہ سخت گناہ اور مذموم ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلہ میں اس قدر احتیاط برتنے کا حکم دیا ہے کہ فرمایا:

''جب تم میں سے کسی کا مجلس میں یا بازار میں گذر ہو اور اس کے ہاتھ میں تیر ہو تو وہ تیر کے نوک دار حصہ کو اپنے ہاتھ میں رکھے''

(مسلم عن ابی موسیٰ ؓ، حدیث نمبر :۳۶۱۵)

کیوں کہ کھلے ہوئے تیر کو دیکھ کر لوگ دہشت زدہ ہو سکتے ہیں، ایک صاحب تیر لے کر مجلس سے گذر رہے تھے تو آپ ﷺ نے خاص طور پر ان کو اسی بات کی تلقین فرمائی (بخاری عن جابر ؓ،

حدیث نمبر:۴۵۱)رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ ایک دوسرے کو اس حال میں تلوار دی جائے کہ وہ نیام میں نہ ہو؛ بلکہ کھلی ہوئی ہو:

" نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يتعاطى السيف مسلولاً " (ترمذی عن جابر ؓ، حدیث نمبر:۳۱۶۳)

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہیں کرے''(مسلم،عن ابی ہریرہ ؓ، حدیث نمبر: ۲۶۱۷)ایک اور روایت میں ہے کہ جو اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرتا ہے، فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں:'' من أشار إلى أخيه بحديدة فإن الملائكة تلعنه ''(مسلم عن ابی ہریرہ ؓ، حدیث نمبر: ۲۶۱۶)آپ ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کو خوف وہراس میں مبتلا کرے:''لا يحل لمسلم أن يروع مسلماً ''(ابوداؤد، حدیث نمبر:۵۰۰۴)——غرض کہ بے قصور لوگوں کو خوف وہراس میں مبتلا کرنا نہایت ہی مذموم، ناپسندیدہ اور غیر شرعی عمل ہے۔

لیکن اگر ظالم کو اس لئے خوف زدہ کیا جائے کہ وہ ظلم وزیادتی سے باز رہے تو یہ کوئی مذموم بات نہیں ہے، دنیا میں سارے تعزیری قوانین کا مقصد یہی تو ہے کہ مجرم کو خوف زدہ کیا جائے؛ تاکہ وہ آئندہ جرائم سے باز رہے، اگر ظالم خوف زدہ نہ ہو تو اس سے اس کے مجرمانہ مزاج کو مزید تقویت حاصل ہوگی اور مظلوموں کی مظلومیت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا؛ اس لئے جب تک بین الاقوامی سطح پر دہشت گردی کا مفہوم، دہشت گردی کے حقیقی عوامل کو دور کرنے کی تدابیر اور دہشت گردانہ کارروائیوں کو روکنے اور مجرموں کو سزا دینے کے سلسلے میں قانونی حدود طے نہ ہو جائیں، ایسے پروگرام دراصل ظالم قوموں کو طاقت پہنچانا اور ان کی نادانستہ تائید کرنا ہے اور جو لوگ مسلمانوں کو دہشت گرد اور اسلامی تعلیمات کو دہشت گردی کا محرک مانتے ہیں، ان کے الزام کو قبول کر لینا ہے، ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اگر ہم دہشت گردی مخالف کانفرنسیں کر لیں تو ہمیں دہشت گرد نہ ہونے کا پروانہ مل جائے گا؛ بلکہ یہ تو ابتدائی مرحلہ ہے، اس کے بعد کہا جائے گا کہ دینی مدارس کے نصاب تعلیم کو سیکولر بنایا جائے، قرآن سے جہاد کی آیات اور حدیث وسیرت کی کتابوں سے جہاد کے

واقعات نکال دیئے جائیں، یا کم سے کم نصاب سے نکال دیئے جائیں، پھر مطالبہ ہوگا کہ قرآن مجید میں کفر وشرک سے متعلق بہت ہی بے لچک رویہ اختیار کیا گیا ہے، اس سے غیر مسلموں کے خلاف نفرت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں؛ اس لئے ایسی آیات واحادیث کو نصاب کا حصہ نہیں بنایا جائے، اسی طرح کے مختلف مطالبات ہیں جو مغربی دنیا مسلمانوں سے کررہی ہیں، اسرائیل میں مسلمانوں اورعربوں کے خلاف نفرت آمیز مواد پڑھایا جاتا ہے اور مدینہ منورہ تک کے علاقہ کو ''عظیم تر اسرائیل'' کا حصہ قرار دیا جاتا ہے؛ لیکن اسے نفرت کی تعلیم نہیں سمجھا جاتا اور قرآن مجید میں آیات جہاد کی غلط تشریح کرتے ہوئے اسے نفرت کی تعلیم قرار دیا جاتا ہے۔

ان حالات میں دہشت گردی مخالف جلسے مسلمانوں کو فائدہ تو کچھ نہیں پہنچائیں گے؛ لیکن غیر مسلم بھائیوں کے ذہن میں یہ بات اور راسخ ہوجائے گی کہ واقعی مسلمان دہشت گرد ہیں، جبھی تو انھیں اس سلسلہ میں معترضین کا جواب دینے اور اپنی طرف سے سے دہشت گردی کی مخالفت کا عہد کرنے کی ضرورت پیش آرہی ہے؛ اس لئے مسلمانوں کو اس عنوان سے گریز کرنے کی ضرورت ہے، اس کے بجائے انصاف اور امن کے موضوعات پر غیر مسلم بھائیوں کو ساتھ لے کر پروگرام منعقد کئے جائیں اور دفاع کے بجائے اقدام کا رویہ اختیار کرتے ہوئے 'امریکہ، اسرائیل، یورپ اور ہندوستان کے فرقہ پرست عناصر' کی دہشت انگیزی اور انسانی حقوق کے اتلاف کو موضوع بنایا جائے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا، یہ عنوان کا فرق ہوگا اور قرآن مجید کی زبان میں ''راعنا'' کے بجائے ''انظرنا'' کی تعبیر ہوگی؛ لیکن اس طرح ہم مغرب کے ایجنڈے کو تقویت پہنچانے سے بچ سکیں گے۔

۲۰/ جون ۲۰۰۸ء

حمیت نام تھا جس کا، گئی تیمور کے گھر سے

ایمان کے بنیادی عناصر ’خدا پر، رسالت پر اور آخرت پر یقین‘ ہے، خدا پر یقین کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا سے اوپر بھی ایک ذات موجود ہے، اس کی خوشنودی کو پانا انسانیت کا اصل مقصد ہے، رسالت پر ایمان میں یہ بات شامل ہے کہ کچھ برگزیدہ، شخصیتیں وہ تھیں، جو اللہ کی طرف سے بھیجی گئی تھیں، جنہیں ’’نبی‘‘ کہتے ہیں، انہوں نے انسانیت تک خدا کا پیغام پہونچایا ہے، اسی پر عمل کرنے میں کامیابی ہے اور اس سے ہٹ جانے میں ناکامی ومحرومی ہے، آخرت پر یقین سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں ہونے والے نتائج کامیابی وناکامی، نفع ونقصان اور درست ونادرست ہونے کی کسوٹی نہیں ہیں ؛ بلکہ اس دنیا کے بعد ایک اور دنیا تک انسان کو پہونچنا ہے، وہاں کی کامیابی اصل کامیابی اور وہاں کی ناکامی اصل ناکامی ونامرادی ہے ، ایمان کے یہ بنیادی عناصر ہیں ، جو مسلمانوں کو دوسری قوموں سے فکری اور عملی اعتبار سے ممتاز کرتے ہیں ، جو گروہ اس یقین کا حامل ہوگا ، وہ چڑھتے سورج اور ابھرتی ہوئی طاقت کا پرستار نہیں ہوگا ؛ بلکہ اس کی نظر اس کائنات کے خالق ومالک پر ہوگی ، وہ کسی عمل کے درست ونادرست ہونے کے لئے انسانی خواہشات وجذبات اور مادی فوائد ونقصانات کو میزان نہیں بنائے گا ؛ بلکہ درست ونادرست ہونے کی اصل ترازو اس کے نزدیک خدا کی بھیجی ہوئی کتاب اور اس کی طرف سے آیا ہوا پیغام ہوگا ، وہ اعمال کے نتائج کے بارے میں اس حقیر مادی دنیا کو اپنی منزل تصور نہیں کرے گا ؛ بلکہ وہ خدا کی آخری عدالت کے نتائج کو اپنے سامنے رکھے گا۔

یہ وہ حقیقت ہے جو امت محمدیہ کو دوسرے گروہوں سے ممتاز کرتی ہے ، دنیا کے لوگ مادی طاقت کے فلسفہ پر یقین رکھتے ہیں ، وہ اپنی کامیابی اور ناکامی کو سونے چاندی کے سکوں سے تولتے ہیں اور وہ محض ایک انسان یا انسانوں کے ایک گروہ کی خوشنودی کو اپنا منتہائے مقصود بناتے ہیں ؛

لیکن جس امت کو خدا نے اپنے دین کی مدد کے لئے پیدا کیا ہے، اس کی نظر حقیر مادی طاقتوں اور منفعتوں تک محدود نہیں رہ سکتی، یہی وہ فرق تھا، جو صحابہ ﷺ کو اس دور کی متمدن قوموں سے ممتاز کرتا تھا اور اونٹوں کے چرانے والوں کو قیصر وکسری کے قصور ومحلات اور زبردست فوجی طاقتوں کے سامنے احساس کمتری کا شکار ہونے سے بچاتا تھا، حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ جب رستم ایران کے دربار میں پہونچے تو رستم نے دریافت کیا: تمہارے آنے کا مقصد کیا ہے؟ رستم کا خیال تھا کہ وہ اپنی معاشی زبوں حالی اور مادی پس ماندگی کا ذکر کریں گے اور انہیں متاع دنیا کا دسترخوان بچھا کر رام کرلیا جائے گا؛ لیکن اسے جو جواب ملا، وہ اس کی توقع سے بالکل مختلف تھا، حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالی نے وہ کلمات کہلوائے، جو اس امت کے مقصد وجود کو واضح کرتے ہیں:

"إن الله ابتعثنا لنخرج عباد الله من عبادة الناس إلى عبادة الله"

"اللہ نے ہمیں بھیجا ہے کہ ہم اللہ کے بندوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کریں"

یہ بات ظاہر ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کو غلام نہیں بنا سکتا، اس کے لئے قوت و حشمت کی ضرورت ہوتی ہے، جو لوگ تخت اقتدار پر متمکن ہوتے ہیں یا جو قوم مادی غلبہ حاصل کر لیتی ہے، وہی دوسروں کو غلام بناتی ہے، ایرانیوں کا یہی حال تھا کہ ایک خاندان وسیع وعریض ملک کو اپنا غلام بنائے ہوئے تھا، حکمرانوں کی عیاشی بھی اپنی انتہاء کو پہونچی ہوئی تھی اور عوام کی مظلومیت اور بے کسی کی بھی کوئی انتہاء نہیں تھی، ایسے لوگ ہر دور میں رہے ہیں، کبھی افراد اور خاندان انسانوں کو غلام بناتے تھے، آج کل ایک قوم اور ایک ملک دنیا کو غلام بنانے پر کمربستہ ہے، پہلے افراد کے وسائل پر قبضہ کیا جاتا تھا، اب قوموں کے وسائل پر قبضہ کیا جاتا ہے، پہلے چند اشخاص کی عزت و ناموس کو خطرہ ہوتا تھا، اب پوری قوم کو بے آبرو اور بے وقار کیا جاتا ہے، غلامی آج بھی ہے؛ لیکن اس کی شکل بدلی ہوئی ہے، محکومیت اب بھی ہے؛ لیکن اس کا انداز تبدیل ہوگیا ہے، ان حالات میں ایک مسلمان بلکہ ایک انسان کا فریضہ کیا ہے؟——اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

امریکہ اور مغربی طاقتیں آج پوری دنیا میں ظلم و جور کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں، وہ اپنے

افعال کے بارے میں قطعاً جواب دِہ نہیں ہیں، نہ ان پر دوسری قوموں اور ملکوں کی خود اختیاری کا احترام ضروری ہے، نہ وہ انسانی حقوق کی پابند ہیں، نہ جنگی قوانین کا ان پر اطلاق ہوتا ہے، نہ عالمی عدالت ان کو فریق بناسکتی ہے، غرض کہ ہر پہلو سے انہوں نے اپنے آپ کو قانون اور اخلاق سے بالاتر رکھا ہے اور ساری دنیا اس وقت ان طاقتوں کے سامنے سرخمیدہ ہے، یہ بھی قوموں کو غلام بنانے ہی کی ایک صورت ہے، جو لوگ مذہب پر خدا پر اور جزاء وسزا پر یقین نہیں رکھتے، اگر وہ ایسی طاقتوں کے سامنے سر جھکا دیں اور رات کو دن اور دن کو رات کہنے لگیں تو چنداں باعث تعجب نہیں؛ کیوں کہ وہ مادی طاقت اور مادی نفع ونقصان ہی پر یقین رکھتے ہیں؛ لیکن جو لوگ مذہبی اقدار پر یقین رکھتے ہیں، ان کا بھی اس رویہ کو قبول کر لینا نہایت افسوسناک ہے۔

ہمارا ملک ہندوستان مذہب کی سرزمین رہا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام جب جنت سے اتارے گئے تو یہی سرزمین ان کا اولین مسکن بنی، حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان بھی تھے اور پہلے پیغمبر بھی، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مذہب اور خدا پرستی کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا؛ اسی لئے انصاف، مظلوموں کی مدد اور ظالموں سے مقاومت اس دیش کی تاریخ رہی ہے، کوروؤں اور پانڈوؤں کی جنگ میں ''کرشن جی'' نے جو تقریریں کیں، ان کی بنیاد یہی ہے؛ چنانچہ موجودہ ہندوستان کے اولین معماروں نے بھی اس حقیقت کو پیش نظر رکھا اور انہوں نے ظالموں کی زورآوری کے سامنے سر نہیں جھکایا، اسی مقصد کے تحت غیر جانبدار تحریک وجود میں آئی، جس کے بانیوں میں ہندوستان بھی ہے اور جواہر لال نہرو اس کے سرگرم مؤسسین میں تھے؛ لیکن اس وقت ہمارے ملک کے تعلقات امریکہ واسرائیل —— جو دنیا میں اس وقت ظلم وجور اور ناانصافی کی علامتیں ہیں —— کے ساتھ بہت گرمجوش ہیں، ہمارا شمار ان کے سرگرم حلیفوں میں ہوتا ہے، گویا ہم بالواسطہ عراق وافغانستان اور فلسطین کے مظلوموں کو مشقِ ستم بنانے میں مدد کر رہے ہیں، مگر افسوس کہ مسلمان خصوصاً اور برادران وطن عموماً حکومت کے اس رویہ کو بدلنے کی کوئی مؤثر کوشش نہیں کرتے، ہم سے بہتر تو بائیں بازو کی جماعتیں ہیں کہ وہ اقتدار کا جوکھم مری لے کر اس کے خلاف ڈٹی ہوئی ہیں، عالمِ اسلام کا حال اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے، وہ اپنے بھائیوں کے قتل وخون پر اس طرح خاموش ہیں اور اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں کہ

گویا کوئی واقعہ ہی پیش نہ آیا ہو، رسول اللہ ﷺ نے امت کو ایک ایسا جسم قرار دیا تھا، جس کے ایک عضو کی تکلیف پر پورا جسم بے قرار ہو جاتا ہے؛ لیکن اب یہ جسم اپنی شامتِ اعمال سے اس قدر مفلوج ہو چکا ہے کہ اس کے ایک حصہ کو کاٹا بھی جاتا ہے تو دوسرے حصہ کو کوئی احساس نہیں ہوتا اور یہ صورت حال مجبوری سے بڑھ کر بے حسی کی حدوں میں داخل ہوگئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اس سلسلہ میں نہایت واضح ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم دیکھو کہ میری امت ظالم کو ظالم کہنے سے خوف کھاتی ہے، تو تم ان سے کنارہ کشی اختیار کرلو:

" إذا رأيتم أمتی تهاب الظالم أن تقول له إنک أنت ظالم ،
فقد تودع منهم " (مسند أحمد ،حدیث نمبر:۱۹۰)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''میرے بعد ایسے امراء ہوں گے ، جو میرے طریقوں کو اختیار نہیں کریں گے اور میری سنت سے گریزاں ہوں گے، جو ان کی غلط بات پر ہاں میں ہاں ملائے اور ان کے ظلم میں مددگار ہو، نہ ان کا مجھ سے کچھ تعلق ہے اور نہ میرا ان سے، اور وہ میرے پاس حوض کوثر پر حاضری سے محروم رہیں گے'' (سنن ترمذی، حدیث نمبر:۶۱۴)

مسلمانوں کے لئے ظلم سے اپنا دامن بچائے رکھنا ہی کافی نہیں ہے؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اگر وہ اپنے بھائی پر ظلم ہوتا ہوا دیکھیں تو اس پر خاموش نہ رہیں اور اسے ظلم کا شکار ہوتا ہوا چھوڑ نہ دیں: '' **المسلم أخو المسلم لا يظلمه ولا يسلمه** ''(بخاری، عن ابن عمر رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر: ۴۰۴۲) —— ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو ظالمانہ دعوے میں مدد کرے، وہ جب تک اس سے باز نہ آجائے، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں رہتا ہے:

" من أعان على خصومة بظلم لم يزل في سخط الله حتى
ينزع " (مستدرك حاكم :۹۹/۴)

عام طور پر ظالموں کو قدرت کی طرف سے جو مہلت ملتی ہے، اس کو دیکھ کر بعض لوگ غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر یہ شخص یا گروہ اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ اور نامقبول ہوتا تو کیوں اس کو یہ

قوت ودبدبہ حاصل ہوتا؟ اور خود ظالم و جابر لوگوں کو بھی اللہ کی طرف سے دی جانے والی اس ڈھیل پر اپنے بارے میں دھوکہ ہونے لگتا ہے؛ حالاں کہ یہی ڈھیل انجام کار اس کے لئے وسیع تر تباہی و بربادی کا سبب بنتی ہے، جن قوموں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا اور بالآخر وہ دنیا سے مٹ گئے، ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے جس دن ظلم وزیادتی شروع کی، اسی دن خدا کے عذاب نے انہیں آ پکڑا ہو، بعض قومیں — جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم — وہ ہے جسے تقریباً ایک ہزار سال مہلت دی گئی، افسوس کہ اس مہلت اور امتحان کو افراد اور قومیں اپنی بداعمالیوں کی مقبولیت کی رسید سمجھنے لگتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ ایسی قوم بالآخر صفحۂ ہستی سے مٹادی جاتی ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب پکڑتے ہیں تو پھر اسے نجات نہیں ملتی'' (بخاری، حدیث نمبر: ۴۶۸۶)

دنیا کے نقشہ کو دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت امریکہ و اسرائیل جیسی طاقتیں ''امہال''، یعنی ظالموں کو دی جانے والی مہلت کے دور سے گزر رہی ہیں، اگر انہیں ایمان کی توفیق نہیں ہوئی اور وہ اپنے ظالمانہ رویہ سے باز نہیں آئے تو زبردست تباہی اور مکمل بربادی ان کا مقدّر ہے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے جو گروہ ان کے مظالم پر نہ صرف مہر بہ لب ہیں؛ بلکہ ان میں معاون بھی ہیں، ان کا انجام بھی ان قوموں سے مختلف نہیں ہوگا؛ اس لئے بحیثیت خیر امت مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ دنیا میں انصاف قائم کرنے، اس کو ظلم کی آماجگاہ بننے سے بچانے اور ظالموں کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کریں۔

اس سلسلہ میں مسلمانانِ ہند قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے جو کرسکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ مسلم ممالک کی حکومتوں تک اپنے جذبات پہونچائیں، انہیں مغربی طاقتوں کے ہر حکم کو آنکھ بند کرکے مانتے چلے جانے کے نقصانات اور اس کی دور رس مضرتوں کو سمجھائیں، اگر ہندوستانی مسلمان ٹیکنالوجی اور عام خدمات میں عالمِ اسلام کی مدد کرسکتے ہیں تو کیا وہ حکمت کے ساتھ تصادم کے بغیر ان حکومتوں کو ان کی عاقبت نااندیشی سے باخبر نہیں کرسکتے؟ — دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو مغربی پروپیگنڈوں کا جواب دینے کے لائق بنائیں، اس کے لئے ریسرچ

ادارے قائم کریں، اعداد وشمار کی زبان میں سچائی لوگوں کے سامنے پیش کریں؛ تاکہ دنیا کی آنکھوں پر دھوکہ اور فریب کی جو دبیز چادر ڈال دی گئی ہے، وہ ہٹ جائے اور حقیقت کا ادراک ممکن ہو، —— تیسرا اہم کام یہ ہے کہ منصف مزاج برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر فضا ہموار کریں کہ ہمارا ملک امن اور انصاف کا علمبردار بن کر کھڑا ہو، یہ عظیم ملک محض طاقت کے سامنے جھک جانے، ناانصافیوں کی تائید کرنے یا ظلم سے آنکھیں موند لینے کا طریقہ اختیار نہ کرے، مسلمانوں نے آزادی سے پہلے تحریک خلافت میں یہی کیا تھا، یہ تحریک بنیادی طور پر ترکی خلافت کی حمایت میں تھی؛ لیکن اس میں علماء اور مسلم قائدین کے ساتھ ساتھ گاندھی جی اور دوسرے نمایاں قائدین بھی شامل کئے گئے تھے؛ تاکہ انگریزوں پر دباؤ ڈالا جاسکے، —— چوتھے: ہمارا ملک ایک جمہوری ملک ہے، جس میں اظہار خیال اور پرامن طریقہ پر احتجاج کی اجازت ہے، ہم حکومت اور سیاسی پارٹیوں سے مطالبہ کریں کہ وہ انصاف کے تقاضوں اور کڑوروں مسلمانوں کے جذبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیصلہ کریں اور مظلوموں کے مقابلہ ظالم کی حلیف نہ بنیں، خاص کر اس پس منظر میں کہ عربوں کے ہندوستان سے روایتی تعلقات رہے ہیں، اس کے ہنرمندوں اور مزدوروں کو بڑی تعداد میں خلیجی ممالک سے روزگار حاصل ہوتا ہے اور اس ملک کے دوسرے معاشی فوائد بھی زیادہ تر عرب ملکوں سے متعلق ہیں۔

رسول اللہ ﷺ اس امت کو ایک جسم بنا کر گئے؛ لیکن خدا کے بجائے انسانوں کے خوف، دینی حمیت وملی غیرت کے فقدان اور عاقبت نااندیشی کی وجہ سے یہ امت نہ صرف چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ گئی ہے؛ بلکہ وہ اپنے بھائیوں کے بارے میں بے حس بھی ہوگئی ہے اور اس سے زیادہ محرومی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ ''متاع کارواں'' بھی لٹ جائے اور ''احساس زیاں'' بھی، باقی نہیں رہے؟؟

۲۷/ جون ۲۰۰۸ء

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

آ گئے ساقی کے بہکانے میں ہم

فارسی کا ایک مشہور مصرعہ ہے:

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست

یعنی ایک وہ شخص ہے، جو دوستی کی اداکاری کرتا ہے، جو اپنے آپ کو دوست ظاہر کرتا ہے؛ لیکن حقیقت میں وہ آپ کا دشمن ہوتا ہے، جس کی زبان پر محبت کے بول ہوتے ہیں، لیکن اس کے سینے میں عداوت کی آگ سلگتی رہتی ہے اور دوسرا وہ شخص ہے جو سچ مچ آپ سے محبت کرتا ہے، جو آپ کا حقیقی دوست ہے، جس کے دل میں آپ کے لئے خیر خواہی کے جذبات ہیں، ان دونوں کے درمیان فرق اس وقت ظاہر ہوتا ہے، جب آپ کسی مصیبت سے دوچار ہوں اور آپ پر آزمائش کا وقت آئے، اس وقت سچے دوست اور دوست نما دشمن کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے، دوستی کی اداکاری کرنے والا ایسے موقع پر اپنی آنکھیں موند لیتا ہے، وہ اس بُرے وقت میں نہ صرف یہ کہ آپ سے بے رخی برتتا ہے، بلکہ آپ کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے آپ کے دشمنوں کی پیٹھ بھی تھپتھپاتا ہے اور جو آپ کا حقیقی دوست ہوتا ہے، وہ اس پریشانی کی گھڑی میں آپ کا ہاتھ تھام لیتا ہے، آپ کو سہارا دیتا ہے اور آپ کی مصیبت کو بانٹنے کی کوشش کرتا ہے۔

افسوس کہ آج مسلمانوں کو اور خاص کر مسلم حکمرانوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، صہیونی اور صلیبی طاقتوں اور مغرب کی عیار حکومتوں کی شاباشی انہیں اپنے قابو میں رہنے نہیں دیتی، اگر کوئی کلمۂ تحسین مغربی حکمرانوں نے کہہ دیا، تو مشرقی فرماں روا —— جو جسمانی اعتبار سے آزاد اور ذہنی اعتبار سے غلام ہیں —— پھولے نہیں سماتے؛ چنانچہ مغربی طاقتیں پہلے انہیں خوب استعمال کرتی ہیں، پھر اقتدار کے بامِ کمال پر پہونچا کر ایسا گراتی ہیں کہ کوئی ان کا پرسانِ حال تک نہیں ہوتا؛ کیوں کہ یہ دوست نما دشمن ان کے درمیان اور حقیقی بہی خواہوں کے درمیان ایسی اونچی دیوار اٹھا

دیتے ہیں کہ وہ کبھی ایک دوسرے کی طرف جھانک بھی نہیں سکتے، پھر جب انہیں ذلیل و بے آبرو کیا جاتا ہے تو ہاتھ تھامنے والے لوگ تو کیا ان پر آنسو بہانے والی کوئی آنکھ بھی موجود نہیں رہتی، یہی حال امریکہ نے ایران میں رضا شاہ پہلوی کا کیا، اس سے زیادہ عبرتناک انجام صدام حسین کا ہوا کہ آخر وہ تختۂ دار پر چڑھادئے گئے اور قریب قریب یہی حال چند روز پہلے مستعفی ہونے والے پاکستان کے صدر پرویز مشرف کا ہوا۔

یا تو وہ زمانہ تھا کہ پرویز مشرف کی تعریف کے گیت گائے جاتے تھے، ان کو بہترین حلیف قرار دیا جاتا تھا اور پوری پاکستانی قوم کے علی الرغم ان کی پشت پناہی کی جاتی تھی، یا پھر یہ وقت ہے کہ پورے ملک میں ان کو بے آبرو کیا جارہا ہے، چاروں ریاستی اسمبلیوں نے ان کے خلاف تحریک ملامت منظور کی، سپریم کورٹ نے تحریک مؤاخذہ کے خلاف آنے والی درخواست خارج کردی، فوج نے بھی اپنا ہاتھ اٹھالیا، امریکہ نے مسئلہ سے بے تعلقی کا اظہار کردیا اور پرویز مشرف کا پر پرواز کچھ اس طرح کاٹا گیا کہ ان کی بے آبروئی اور بے توقیری بھی ایک مثال بن گئی اور یہ سب محض عوامی دباؤ کی وجہ سے نہیں ہوا، پرویز مشرف کبھی بھی عوامی رائے سے منتخب نہیں ہوئے، انہوں نے زور زبردستی سے حکومت پر قبضہ کیا اور چور دروازے سے اپنے اقتدار کو طول دیتے رہے، اگر جمہوریت اور عوامی رائے عامہ ملحوظ ہوتی تو کبھی بھی ان کی تائید نہیں کی جاتی، اصل میں یہ سب کچھ امریکہ کی شہ پر ہوا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پرویز مشرف نے بہت ساری غلطیاں کی ہیں، انہوں نے بحیثیت چیف کمانڈر حکومت پاکستان کے علم میں لائے بغیر ہندوستان پر عین اس وقت کارگل جنگ مسلط کی، جب ہندو پاک کی حکومتیں امن اور صلح کی طرف بڑھ رہی تھیں، انہوں نے ایک منتخب عوامی حکومت کے خلاف بغاوت کی، انہوں نے دستور پاکستان کو اپنے لئے کھلونا بنادیا کہ اپنے مخالفین کو ایوان اقتدار سے دور رکھنے اور خود اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے جب جیسی تبدیلی چاہی کرتے چلے گئے، جس میں بعض تبدیلیاں نہایت نامعقول اور غیر منطقی ہیں، جیسے: ایک شخص کا دو دفعہ کے بعد وزیر اعظم نہیں بننا اور عوام کے منتخب نمائندہ وزیر اعظم کے مقابلہ خود ساختہ صدر مملکت کا زیادہ بااختیار ہونا وغیرہ، انہوں نے افغانستان کی جنگ کو وزیرستان تک پہونچا دیا اور پاکستانی فوج کو

برادر کشی پر مجبور کیا، انھوں نے لال مسجد میں صلح کے بجائے قتل وخوں ریزی کا راستہ اختیار کیا، امریکہ کے اشارہ پر ہونے والی ان مہمات میں ہزاروں افراد کی جانیں گئی، ان کا خون یقیناً پرویز مشرف کی گردن پر ہے اور شاید یہ دنیا سے آخرت تک ان کا تعاقب کرتا رہے گا۔

لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے اپنے ملک کے حق میں بہت سے اچھے کام بھی کئے ہیں، انھوں نے ملک کی گرتی ہوئی معیشت کو سہارا دیا، اسے دفاعی اعتبار سے آگے بڑھایا، بعض نازک حالات میں ملک کو بچایا اور اس کی سالمیت کو یقینی بنایا، یہی چیز امریکہ کی نظر میں کھٹک گئی تھی، پرویز مشرف چوں کہ بہر حال ایک محبّ وطن سپاہی ہیں؛ اس لئے ایک خاص حد سے آگے بڑھنے کو وہ تیار نہیں ہوئے، انھوں نے امریکہ کو پاکستان کے اندرونی علاقہ میں حملہ کرنے کی اجازت نہیں دی، انھوں نے نیوکلیر صنعت تک امریکہ کی رسائی کو قبول نہیں کیا، انھوں نے گو حدود آرڈیننس کو مغرب کے دباؤ پر منسوخ کیا اور ایک ایسا نیا قانون لائے، جو قانون شریعت کے قطعاً مغائر ہے، مگر توہین رسالت سے متعلق قانون کو امریکہ اور مغرب کے مطالبہ کے باوجود عوامی دباؤ کے تحت وہ تبدیل نہیں کر سکے، اسی طرح دینی مدارس پر امریکہ جو کنٹرول چاہتا تھا؛ بلکہ مدارس کے پورے نظام میں تبدیلی کا خواہش مند تھا، مشرف کے لئے اسے روبہ عمل لانا ممکن نہیں تھا؛ کیوں کہ پاکستانی عوام کسی بھی قیمت پر اسے قبول نہیں کرتی، یہ وہ باتیں تھیں، جن کی وجہ سے امریکہ نے مشرف کو چلتا کرنا ہی بہتر سمجھا، شاید ان مقاصد کے لئے اس نے بے نظیر بھٹو کو تیار کر لیا تھا؛ لیکن ان کے اچانک قتل کی وجہ سے مشرف کو کچھ مہلت مل گئی، مگر بہر حال یہ نوشتۂ دیوار تھا، مشکل یہ ہے کہ انسان عیش وعشرت کے لمحات میں نوشتۂ دیوار کو پڑھ نہیں پاتا ہے اور اس کی سرمستی اِس کی اجازت نہیں دیتی۔

بہر حال جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا، اور پاکستان میں ایسی باتوں کا پیش آنا عجوبہ نہیں ہے، یہ ایسا ملک ہے، جس میں فوج کو حکومت کی چاٹ لگ گئی ہے، ہر آمرانہ اقتدار کی ابتداء جمہوریت کے نام سے ہوتی ہے، منتخب جمہوری نمائندوں کا بھی مزاج یہ ہے کہ انھیں حزب اختلاف کا وجود قطعاً برداشت نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کبھی بھی پُر امن انقلاب نہیں آیا، یا تو اصحاب اقتدار کو دار ورسن تک پہونچایا جاتا ہے یا انھیں نہایت بے آبروئی کے ساتھ کوچۂ جاناں سے نکالا جاتا ہے

اور دستور تو بازیچۂ اطفال ہے، جسے موم کی ناک کی طرح دائیں بائیں موڑنا پاکستانی حکمرانوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، کاش، وہاں کی حکومتیں اور عوام اپنے پڑوسی ملک ہندوستان سے سبق حاصل کرتے اور یہاں کی جمہوریت کو اپنے لئے مشعل راہ بناتے تو دنیا بھر میں ان کی شبیہ بھی اتنی خراب نہ ہوتی، جتنی اب ہے اور وہ بیرونی اثر سے آزادرہ کر حکومت بھی چلا سکتے؛ کیوں کہ جس حکومت کے پیچھے عوام کی طاقت ہوتی ہے، اس کو باہر کے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی اور جس حکومت میں خود اس کی عوام شامل نہیں ہوتی ہے اور اس کی بنیاد جبر و دباؤ پر ہوتی ہے، اس کو باہر کی بیساکھی کی ضرورت پڑنی ناگزیر ہے۔

یہ تو اس مسئلہ کا سیاسی پہلو ہے، بہت سے تجزیہ نگاروں نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے اور ابھی اس کا سلسلہ جاری ہے؛ لیکن مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ ایسے مسائل پر دینی نقطۂ نظر سے غور کریں اور قرآن وحدیث کی روشنی میں اپنے لئے راہِ عمل متعین کریں، اس سلسلہ میں چار باتیں بنیادی طور پر پیش نگاہ رکھنے کی ہیں: اول یہ کہ مسلمان چاہے جس مقام پر پہونچ جائے، اس کا دل اللہ کے خوف سے معمور رہنا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ وہ خدا سے تو بے خوف ہو جائے، مگر اس کا دل خدا کے باغیوں کے خوف سے معمور ہو جائے، چنانچہ بعض سلف صالحین کا قول ہے کہ جو اللہ سے ڈرتا ہے، ہر چیز اس سے ڈرتی ہے اور جو اللہ سے بے خوف ہو جاتا ہے، اس کو ہر چیز سے ڈرنا پڑتا ہے:

" من یخاف اللہ یخافہ کل شئ ، ومن لا یخاف اللہ ، یخاف کل شئ "

اس وقت عالم اسلام کا خصوصاً اور مسلمانوں کا عموماً مسئلہ یہی ہے کہ خدا کے خوف کی جگہ دشمنانِ خدا کے خوف نے لے لی ہے اور مغرب سے مشرق تک ہر طاقت ہمیں ہراساں کر رہی ہے۔

دوسرا بنیادی اصول وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانہ کے حالات کے تناظر میں یہود ونصاریٰ کے بارے میں کہی کہ ان سے گہری دوستی نہیں رکھی جائے اور ان پر بھروسہ نہیں کیا جائے، خود قرآن مجید کا ارشاد ہے:

﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لاَ تَتَّخِذُوْا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰی أَوْلِیَاءَ بَعْضُھُمْ أَوْلِیَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِنْکُمْ فَإِنَّہٗ مِنْھُمْ " (المائدۃ :۵۱)

اسی طرح اس بات سے بھی منع کیا گیا ہے کہ یہود ونصاریٰ کو اپنا راز دار بنایا جائے اور رموز مملکت میں ان کو شامل کیا جائے:

﴿ يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِنْ دُوْنِكُمْ لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالا ﴾ (آل عمران :۱۱۸)

قرآن مجید کا یہ حکم کسی قوم سے نفرت اور بغض وعداوت کی بنیاد پر نہیں ہے ؛ بلکہ یہ یہود ونصاریٰ کی اس نفسیات اور اسلام کے تئیں ان کے رویہ کے پس منظر میں ہے ، جو آغاز اسلام سے رہا ہے ، ہر چند کہ اہل مغرب کو قرآن مجید کی اس ہدایت پر شکایت ہے ؛ لیکن افسوس کہ صہیونی اور صلیبی طاقتیں آج بھی یہی مزاج رکھتی ہیں ، ان کی سوچ میں اب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے ؛ اس لئے مسلمانوں کو اپنے تحفظ ، سالمیت اور اپنی آزادی کی بقا کے لئے آج بھی اس ہدایت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ، آج عالم اسلام جس بے چارگی سے دوچار ہے ، اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے اپنے داخلی اور خارجی امور کو مغرب کے مشوروں کے تابع رکھا ہے ، یہاں تک کہ انہوں نے اپنے گھر میں مغربی فوجیوں کو مہمان بنانے سے بھی گریز نہیں کیا ۔

تیسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ ہمیں صہیونی اور صلیبی طاقتوں کے مقاصد اور اہداف سے واقف ہونا چاہئے ، ان کا مقصد صرف اتنا نہیں ہے کہ ان کے موافق حکمراں اقتدار میں آجائیں ، انہیں کچھ پٹرول حاصل ہو جائے ، کچھ معاشی فوائد وہ حاصل کرلیں اور بس ؛ بلکہ وہ اس کو بھی کافی نہیں سمجھتے کہ زمین کے کسی ٹکڑے پر قابض ہو جائیں ، اس سے ان کی طبعِ خوں آشام کی سیری نہیں ہو سکتی ، ان کی اصل آرزو یہ ہے کہ مسلمان اپنے دینی تشخص سے محروم ہو جائیں ، زندگی سے اسلام کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہے ، ایمانی حمیت اور دینی غیرت کی کوئی رمق ان میں رہ نہ جائے ، رسول اللہ ﷺ کی توہین انہیں مشتعل نہ کرتی ہو ، اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے :

﴿ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لاَ النَّصَارٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ﴾

(البقرة :۱۲۰)

'' یہود ونصاریٰ تم سے اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتے ، جب تک تم ان کے طریقۂ فکر اور تہذیب وکلچر کی پوری طرح پیروی نہ کرنے لگو''

چوتھی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا اپنی امت سے کٹ کر دوسروں سے جڑنے کا مزاج بہت ہی خطرناک ہے اور ایسا شخص کہیں کا باقی نہیں رہتا، قرآن مجید نے منافقین کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا ہے کہ ان کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ بظاہر مسلمانوں کے ساتھ بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں؛ لیکن حقیقت میں ان کی ہمدردی، محبت اور جھکاؤ اعداء اسلام کی طرف ہوتا ہے، عام طور پر حکومتوں کی قربت اور بے گانوں کی طرف سے ظاہری پذیرائی لوگوں کو جادۂ اعتدال سے ہٹا دیتی ہے، خود ہندوستان میں دن و رات یہ تماشہ دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی سیاسی جماعت نے مسلمان نمائندہ کو امیدوار بنایا، اس امیدواری میں اس کی ذاتی قابلیت کو بہت کم دخل ہوتا ہے، اصل میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے اسے ٹکٹ دیا جاتا ہے؛ لیکن جب وہ ایوانِ اقتدار میں پہنچتا ہے، تو اپنی ہی ملت سے بے تعلق ہوجاتا ہے اور —— تلخ نوائی کی معافی کے ساتھ —— اس کی مثال اس کتے کی ہوتی ہے، جو دوسروں سے ایک لقمہ حاصل کر کے خاموش ہوجاتا ہے؛ لیکن خود اپنی ہی جنس پر بھونکتا رہتا ہے، سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب فتح بیت المقدس کے موقع سے مدینہ سے تشریف لائے، تو یروشلم کے رومن گورنر نے ان کے قیام و استراحت کے لئے ایک خوبصورت محل آراستہ کیا؛ لیکن آپ رضی اللہ عنہ نے اس محل میں قیام کرنے سے انکار کردیا اور فرمایا کہ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ رہوں، اسی میں میری شان ہے، پھر آپ رضی اللہ عنہ فوجیوں کے ساتھ زیر آسمان خیمہ میں مقیم ہوئے، کاش، مسلمان اس اسوہ کو یاد رکھیں کہ ان کی شان اپنی ملت سے وابستگی میں ہے، نہ کہ بیگانوں کے دئے ہوئے مکارانہ اعزاز میں۔

بہر حال پرویز مشرف اور ان جیسے مسلمان قائدین کی مغرب نوازی، بڑی طاقتوں سے قربت اور مسلمان عوام کے درد سے بے تعلقی اور پھر انہیں نام نہاد دوستوں کی شہ پر بے آبروئی کو دیکھتے ہوئے بے ساختہ ایک اردو شاعر کا حقیقت پسندانہ شعر یاد آتا ہے کہ:

آبرو کھوتے نہ میخانے میں ہم
آگئے ساقی کے بہکانے میں ہم

۲۹/ اگست ۲۰۰۸ء

......لوگ کردے ہیں اشارہ میری تربت کی طرف

عرب کا ایک قبیلہ ''قبیلۂ مصطلق'' تھا، اس کے سردار حارث ابن ابی ضرار رضی اللہ عنہ تھے، جن کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں تھیں، اُس قبیلہ کے سردار حارث ابن ابی ضرار رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ نبوی ﷺ میں اسلام قبول کیا، آپ ﷺ نے زکاۃ کے بارے میں ترغیب فرمائی، انہوں نے وعدہ کیا کہ میں اپنے قبیلہ میں واپس جا کر انہیں بھی اسلام کی دعوت دوں گا اور جو لوگ ایمان قبول کرلیں گے، ان کی زکوۃ بھی جمع کرلوں گا، پھر آپ ﷺ فلاں زمانہ میں اپنے نمائندے کو بھیجیں گے کہ تا کہ وہ جمع شدہ زکوۃ لے کر مدینہ آجائے، رسول اللہ ﷺ نے ان کی اس پیشکش کو قبول فرمالیا، مگر وقت مقررہ پر آپ کے نمائندہ نہیں آسکے، حارث ابن ابی ضرار رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے مشورہ کیا انہیں خیال ہوا کہ کہیں رسول اللہ ﷺ ناراض تو نہیں ہوگئے کہ وقت مقررہ پر آپ ﷺ کا نمائندہ نہیں آسکا، چنانچہ لوگوں کا ایک وفد لے کر مدینہ کے لئے نکلے، اُدھر رسول اللہ ﷺ نے ولید ابن عقبہ بن ابی معیط کو بنو مصطلق کی زکوۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا، بنو مصطلق کے لوگوں نے جب ولید کو دور سے دیکھا تو خوش ہوئے اور اُن کے استقبال کے لئے آگے بڑھے، اور خود ولید نے اُن کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر سمجھا کہ یہ ہمارے ختم کے درپہ ہیں، چنانچہ وہ واپس کھڑے ہوئے اور مدینہ آکر حضور ﷺ سے عرض کیا کہ ان لوگوں نے زکوۃ ادا کرنے سے انکار کردیا ہے اور میرے ختم کے درپہ ہوگئے ہیں؛ اس لئے میں واپس آگیا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کو یہ سن کر بڑا رنج ہوا، بعض روایتوں کے مطابق آپ ﷺ نے اُن پر فوج کشی کا ارادہ بھی فرمایا، پھر اتنے میں بنو مصطلق کا وفد بھی آپہنچا، وفد نے حضور اسے بتایا کہ ہم لوگ آپ کے نمائندہ کے استقبال اور اُن کی تکریم وتوقیر کے لئے آگے بڑھ رہے تھے؛ مگر وہ دور ہی سے واپس آگئے، اور سُنا ہے کہ آپ سے بتایا ہے کہ ہم لوگ انہیں قتل کرنا چاہتے تھے، یہ اطلاع بالکل درست

نہیں ہے،اس موقع سے قرآن مجید میں آیت نازل ہوئی:

﴿ يٰأَيُّهَا الَّـذِيْنَ آمَنُوْا اِنْ جَاءَ كُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِيْنَ ﴾ (الحجرات :٦)

''اے وہ لوگو! جو ایمان لائے اگر تمہارے پاس کوئی فاسق شخص خبر لائے تو تحقیق کرلیا کرو، کہ کہیں ناواقفیت میں تم کسی قوم پر حملہ آور نہ ہوجاؤ، پھر اپنے کئے پر شرمندہ ہو''

اس واقعہ کو اکثر مفسرین نے نقل کیا ہے اوراس سے یہ بات مستنبط کی ہے کہ ہر خبر قبول نہیں کی جاسکتی ،خبر دہندہ کے لحاظ سے خبریں معتبر یا نامعتبر ہوتی ہے ۔ (دیکھئے :تفسیر ابن کثیر :۴/ ۲۰۹ - ۲۰۸،تفسیر قرطبی :۱۶/ ۳۱۱ -۳۱۲)

قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے جو تمام انسانیت کا رب ہے ؛ اس لئے اس کی بھیجی ہوئی یہ کتاب صرف مسلمانوں کے لئے رہنمائی کا ذریعہ نہیں ؛ بلکہ اس سے پوری انسانیت کی ہدایت متعلق ہے، بدگمانی اور بے اعتمادی باہمی تعلقات کو نقصان پہونچاتی ہے،اس سے معاشرہ نفرت اور انتشار کی طرف بڑھتا ہے، اگر افراد کے درمیان بدگمانی پیدا ہوا تو افراد کے باہمی تعلقات متأثر ہوتے ہیں اور مختلف قوموں کے درمیان غلط فہمی پیدا ہوجائے تو اس سے قومی سطح پر امن وامان درہم برہم ہوجاتا ہے؛ اس لئے ضروری ہے کہ جب بھی کوئی واقعہ پیش آئے تو اُس کی گہری تحقیق کی جائے ، تمام امکانات کو پیش نظر رکھ کر اُس پر غور کیا جائے ، مجرم کو پکڑنے کی پوری کوشش کی جائے اور جب ظلم ثابت ہوجائے تو قرار واقعی سزا بھی دی جائے ؛لیکن محض شبہ، بدگمانی ،اور بے دلیل الزام کی بناء پر بے قصور لوگوں کو خوفزدہ نہیں کیا جائے ،پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے جرم وسزا کی نسبت سے بنیادی ہدایت دی ہے کہ کسی مجرم کو سزا سے بچ جانا کسی بے قصور شخص کے سزایاب ہوجانے سے کم تر بات ہے؛ چنانچہ آج اس اصول کو پوری دنیا میں انصاف کے بنیادی اصول کی حیثیت سے مانا جاتا ہے،اور عدالتیں ملزم کو شبہ کا فائدہ دیتی ہیں۔

بدقسمتی سے کچھ مردم خور درندے جو انسانی قالب اور انسانی شکل وصورت میں ہیں، جگہ جگہ بم دھماکے کررہے ہیں،ان دھماکوں میں بے قصور اور معصوم انسانوں کا خون بے تحاشہ بہہ رہا ہے،

کتنے بوڑھے اور جوان عورتیں اور بچے بیمار اور مسافر اب تک ان قابل نفرت بھیڑیوں کے نذر ہو چکے ہیں، جان کسی مسلمان کی جائے یا ہندو کی یا عیسائی کی وہ بہر حال انسان کی جان ہے، اسلام کی نظر میں تمام انسانوں کی جانیں یکساں قابل احترام ہیں؛ اسی لئے قرآن مجید میں کہا کہ جس نے ایک شخص کی جان بچائی اُس نے پوری انسانیت کی جان بچائی، اور جس نے ایک شخص کی جان لی، اُس نے پوری انسانیت کی جان لی:

﴿ مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِيْ الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعاً ﴾

(المائدہ:۳۲)

یہ فعل نہایت ہی نفرت انگیز اور قابل مذمت ہے، نیز تمام ہی مذاہب کے لوگ اور خاص کر مسلمان اِسے انتہائی مذموم سمجھتے ہیں، اسلام تو میدان جنگ میں بھی عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانے کو منع کرتا ہے، چہ جائیکہ امن کے ماحول میں ایسی حرکتیں کی جائیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے مجرموں کو کس طرح پکڑا جائے؟ اس وقت ہندوستان میں صورت حال یہ ہے کہ جب تک دہشت گردی کا کوئی واقعہ پیش آنہیں جاتا، انٹلیجنس بے خبر رہتی ہے؛ لیکن جیسے ہی حادثہ ہو، ایک گھنٹے دو گھنٹے کے اندر بلکہ اکثر محض پندرہ بیس منٹ میں پولیس کی طرف سے بیان آجاتا ہے کہ فلاں تنظیم اس دھماکے کی ذمہ دار ہے، اس کے بعد کچھ مسلمانوں کے فرضی نام لئے جاتے ہیں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اس خبر کی اس طرح نشر واشاعت شروع ہو جاتی ہے کہ گویا یہ بالکل مصدقہ خبر اور ثابت شدہ واقعہ ہو، اور پھر مسلمانوں کے خلاف نفرت کا جذبہ فطری طور پر برادرانِ وطن میں اُبلنے لگتا ہے، اگر واقعی ہماری پولیس اتنی باخبر چوکنا اور بیدار مغز ہے تو واقعہ سے فوراً بعد جس بات سے مطلع ہوتی ہے تو واقعہ کے پیش آنے سے پہلے ہی کیوں نہیں اُس کی روک تھام کرتی اور اگر پہلے سے اسے خبر نہیں تھی تو قابلِ غور ہے کہ اتنی جلد کیسے وہ صورتحال سے باخبر ہو جاتی ہے؟

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ ہمارے ملک میں آزادی کے پہلے ہی سے نفرت انگیز جذبات کے تحت کام کرنے والی مختلف تنظیمیں موجود ہیں، جن میں سے بعض کی تاریخ ہندوستان کی آزادی

کے پہلے جڑی ہوئی ہے، ہندومہا سبھا 1947ء سے پہلے ہی قائم ہوئی، جس کی شاخیں آج آر ایس ایس، بی جے پی، وی ایچ پی اور بجرنگ دل کی شکل میں ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہیں، جونوجوانوں کے ذہن میں فرقہ واریت کا زہر بھرتی ہیں، کھلے عام انہیں اسلحہ کے استعمال کی مشق کراتی ہیں اور مختلف فسادات میں نہایت گھناؤنا رول ادا کر چکی ہیں، آزادی کے کچھ عرصہ بعد ہندوستان میں نکسلائٹ تحریک شروع ہوئی جو تشدد کے ذریعہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کا یقین رکھتی ہے اور اس وقت ہندوستان کے مختلف ریاستوں میں اُس کے گہرے اثرات ہیں؛ بلکہ بعض جگہ تو انہوں نے متوازی حکومت بھی قائم کر رکھی ہے، ملک کے مشرقی حصہ میں اُلفا تحریک ہے تو ملک کے جنوب میں ایل ٹی ٹی آئی ہے، اور ہندوستان کی مغربی ریاستیں پنجاب اور کشمیر میں علیحدگی پسند تحریکیں ہیں، مہاتما گاندھی جی ہندو دہشت گردوں کا شکار ہوئے، اندرا گاندھی کو پنجاب کے علیحدگی پسندوں نے اپنا نشانہ بنایا اور راجیو گاندھی ایل ٹی ٹی آئی کے جذبۂ انتقام کا شکار ہوئے، دہشت گردی کے اہم واقعات میں کہیں کوئی مسلمان شامل نہیں تھا، اسی طرح سوائے کشمیر کے علیحدگی پسندوں کے کوئی تحریک ایسی نہیں، جس کا مسلمانوں سے کوئی تعلق قائم ہو سکے؛ بلکہ ہندو تنظیمیں اور آسام کی بوڈو تحریک کے تو بے قصور مسلمان نشانہ بنتے رہتے ہیں، پھر ہمیں اس بات پر بھی نظر رکھنی چاہئے کہ بڑی طاقتیں ہندوستان جیسے ابھرتے ہوئے بڑے ملک کو مستحکم دیکھنا نہیں چاہتیں، وہ انہیں انتشار اور اندرونی اور بیرونی مسائل میں اُلجھا ہوا دیکھنا چاہتی ہیں؛ تاکہ یہ ملک اُن کے مقابل آنے اور اُن سے آنکھیں ملانے کی کوشش نہ کرے۔

حالیہ دنوں میں کئی واقعات ایسے آئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوفرقہ پرست تنظیمیں مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے دہشت گردانہ واقعات کو وجود میں لا رہی ہیں، آر ایس ایس دفتر میں بم دھماکہ کے سلسلہ میں یہ بات منظر عام پر آچکی ہے کہ اس میں ایس کمار، وی نارائن شرما اور ایس روی ہانڈین ملوث تھے، اپریل ۲۰۰۶ء سے فروری ۲۰۰۷ء کے درمیان ناندیر میں جو بم دھماکے ہوئے آر ایس ایس کے چار سرگرم کارکنان ہلاک ہو چکے ہیں، انگریزی میگزین ''تہلکہ'' شواہد سے واضح کر چکا ہے کہ وی ایچ پی اور بجرنگ دل بم اور راکٹ لانچر تک بنا چکے ہیں، گودھرا کے بی جے پی ایم ایل اے ہریش بھٹ نے اعتراف کیا ہے کہ بابو بجرنگی نے کئی بے قصور مسلمانوں کو قتل

کیا تھا، ۷ا/ اپریل ۲۰۰۸ء کو مالیگاؤں پولیس کے چھاپہ میں جیتندر کھیڑا کی پیتھالوجی لیبارٹی سے ریوالور، آرڈی ایکس اور ہزار روپے کے جعلی نوٹ پکڑے گئے، پولیس جیتندر کھیڑ انتیش آشرے اور صاحب راؤسکھ دیو کو اس سلسلہ میں گرفتار بھی کیا کہ یہ تینوں آر ایس ایس کے ممبر ہیں، ۱۶/ جنوری ۲۰۰۸ء کو ہندو جن جاگرتی سمیتی کے سرگرم کارکنوں رمیش ہمی منت کڈکا اور منگیش ، وشنو واج بھاوے آڈیٹوریم میں خام بم نصب کرنے کی پاداش میں گرفتار کئے گئے، ۵/ جولائی ۲۰۰۸ء کو ناڈیر پولیس نے موہن لال، بھورالال کے قصبہ سے دہشت گردانہ واقعات میں کام آنے والی بہت سی چیزیں ضبط کی، یہ دونوں بھی آر ایس ایس کے کارکن ہیں، ۲۴/ اگست ۲۰۰۸ء کو آر ایس ایس کے کارکنان کانپور میں بم دھماکے میں ہلاک ہوگئے، ان کے قبضہ سے اتنی مقدار میں دھماکہ خیز مادہ بر آمد ہوا جو پورے شہر کانپور کو تباہ کرنے کے لئے کافی تھا، مالیگاؤں اور حیدرآباد میں بعض غیر مسلموں کے پاس سے نقلی ڈاڑھیاں ملی اور بعض ہندو نوجوان مشکوک حالت میں نمازیوں کی صفوں میں پکڑے گئے؛ مگر پولیس نے ان پر کوئی نوٹس نہیں لیا۔

صورت حال یہ ہے کہ دھماکہ مندر میں ہو یا مسجد میں، جانیں مسلمانوں کی جائیں یا ہندوؤں کی، تہوار ہندوؤں کا ہو یا مسلمانوں کا شک کی سوئی ہمیشہ مسلمانوں کی طرف گھمائی جاتی ہے اور اُن کی ایسی تصویر پیش کی جاتی ہے کہ گویا ہر مسلمان دہشت گرد ہے، جانیں بھی مسلمانوں کی جاتی ہیں اور قاتل بھی وہی ٹھہرائے جاتے ہیں اور واقعہ کی نوعیت کچھ بھی ہو بغیر تحقیق مسلمانوں کی طرف اُس کو منسوب کردیا جاتا ہے، بقول شاعر:

جب بھی اٹھے ہے زمانہ میں کوئی فتنہ نیا
لوگ کردے ہیں اشارہ میری تُربت کی طرف

ملک سے محبت اور ہمدردی وبہی خواہی کا تقاضا یہ ہے:

۱) حکومت مذہب وفرقہ کی تفریق کے بغیر تمام ہی دہشت گردانہ کوشش پر یکساں نظر رکھے۔

۲) پولیس واقعات کی تحقیق میں تمام امکانات کو سامنے رکھ کر غور کرے، ہندو فرقہ پرستوں کی طرف سے چشم پوشی سے کام نہ لے۔

۳)　بلاثبوت کسی شخص یا تنظیم کی طرف شک کی انگلی نہیں اٹھائی جائے ۔

۴)　ذرائع ابلاغ کو پابند کیا جائے کہ جو واقعات ابھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچے ہوں اور جن لوگوں کی حیثیت ابھی محض ملزم کی ہو اُن کو مجرم کے طور پر پیش نہ کیا جائے ، اور اگر وہ ایسی باتوں کو نشر بھی کریں تو پولیس کے غیر مصدقہ دعویٰ کے طور پر پیش کریں ، نہ کہ ایک ثابت شدہ خبر کے طور پر ، بے قصور افراد کو متہم کرنے پولیس کی جانب سے ایذاء پہونچانے اور انہیں بدنام کرنے سے نوجوانوں میں ردِ عمل پیدا ہوتا ہے اور دہشت گردی ختم ہونے کے بجائے اس سے دہشت گردی کو مزید تقویت پہونچتی ہے ؛ اس لئے غیر جانبدارانہ تحقیق کرنا اور تحقیق کے بغیر الزام لگانے سے گریز کریں ، یہ نہ صرف اسلام کی تعلیم ہے ؛ بلکہ یہ عمومی اصولِ انصاف اور مسلّم اخلاقی قدروں کا تقاضا بھی ہے ۔

۲۴/اکتوبر ۲۰۰۸ء

وی ایچ پی کے نام!

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں مری بات

کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں، جنہیں قوم اپنا نمائندہ بناتی ہے اور کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو از خود کسی گروہ کی قیادت کے دعوے دار بن جاتے ہیں اور اس جھوٹ کا اتنی طاقت کے ساتھ اشتہار کرتے ہیں کہ لوگ اس کو سچ تصور کرنے لگیں؛ کیوں کہ یہ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ جو بات اس کے سامنے بار بار دہرائی جاتی ہے، وہ آہستہ آہستہ اس پر یقین کرنے لگتا ہے، ایسی ہی قیادت کی ایک مثال ہندوستان میں ''وشو ہندو پریشد'' ہے، دعویٰ تو اسے ہندوؤں کی عالمی سطح پر قیادت کا ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود ہندوستان میں بھی برادران وطن نے اس کو کبھی اپنا نمائندہ نہیں مانا؛ بلکہ ہندوستان کی ہندو مذہبی شخصیتیں ہمیشہ اس کے خود غرضانہ طرز عمل، سیاست کے لئے مذہب کے استحصال اور غیر انسانی رویہ کی مذمت کرتی رہی ہیں۔

یہ تنظیم ایک نکاتی منصوبہ کے تحت کام کرتی ہے اور وہ منصوبہ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے نفرت کی کھیتی لگاؤ، ملک میں اختلاف وانتشار کو ہوا دو اور جب یہ کھیتی پھل لانے لگے تو اس کے سیاسی فائدے اٹھاؤ اور بے قصور لوگوں کی لاشوں پر کھڑے ہو کر اپنے قد اونچے کرو، یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ اس ملک میں عام ہندو امن پسند، انسانیت دوست اور باہمی رواداری کا قائل ہے، ورنہ اس فرقہ پرست تنظیم نے پورے ملک کو آتش فشاں بنا دیا ہوتا اور ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں، غرض کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان قتل وخون کا بازار گرم کر دیا ہوتا۔

چوں کہ اس کے منصوبے سراسر غیر منصفانہ اور غیر قانونی ہوتے ہیں؛ اس لئے اس کے بیانات بھی بے دلیل، معقولیت سے خالی اور حقیقت پسندی سے بعید ہوتے ہیں، وی ایچ پی کی طرف سے اس طرح کے بیانات آتے رہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انہیں اہمیت نہیں دی جانی

چاہئے ، اسی زمرہ میں اس کا حالیہ بیان بھی ہے ، جس میں اس نے مطالبہ کیا ہے کہ مسلمان تنظیمیں فتوی دیں کہ ''ہندوستان دارالحرب نہیں ہے ، یہ دارالامن ہے اور ہندوؤں سے جہاد جائز نہیں'' وی ، ایچ ، پی کا ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ ہندوؤں کو کافر نہیں کہا جائے ، اس قسم کی باتوں کا مقصد دراصل برادران وطن کو گمراہ کرنا ، ان کو غلط فہمی میں ڈالنا اور اپنی قوم دشمن حرکتوں کی طرف سے ان کی توجہ کو ہٹانا ہے ؛ اس لئے حقیقت میں تو یہ بیان اس لائق نہیں ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے ؛ لیکن چوں کہ ایسی باتوں سے بہت سے سادہ لوح اور سادہ ذہن لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہوسکتے ہیں ؛ اس لئے ان کی وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے ۔

اصل میں ''دارالحرب'' ایک قدیم اصطلاح ہے ، محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اسلام کی ابتدا مکہ مکرمہ کی سرزمین سے ہوئی ، آپ ﷺ نے جب لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو یہ تنہا آواز تھی ، جو لوگوں کو حق کی طرف لانے اور باطل سے بچانے کے لئے بلند ہوئی ، اس وقت کوئی تلوار نہ تھی ، جو اس آواز کی حمایت میں اٹھ سکے اور نہ اس کی ضرورت تھی ؛ کیوں کہ مذہب کا تعلق انسان کے ضمیر سے ہوتا ہے ، تلوار کی قوت سے جسم اور زمین کو تو فتح کیا جاسکتا ہے ، دل و دماغ کو نہیں جیتا جاسکتا ، جب آپ ﷺ نے صدائے توحید بلند کی تو سوائے چند لوگوں کے عام طور پر اہل مکہ نے اس کی مخالفت ہی کی اور یہ مخالفت ہر طرح کے تشدد کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی ، آپ ﷺ پر جو چند لوگ ایمان لائے ، ان میں سے زیادہ تر غلام اور باندی تھے ، جن کو عرب شاید جانور سے بھی زیادہ حقیر سمجھتے تھے ، ان بے نواؤں پر تشدد کے پہاڑ توڑے جاتے اور انہیں آہ کرنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی ۔

یہ وہ صورت حال تھی ، جس میں اسلام کا چراغ روشن ہوا اور اس کا نور عالم تاب آہستہ آہستہ پھیلنے لگا ، دشمنان اسلام نے ظلم کا راستہ اختیار کیا اور مسلمانوں نے صبر کا ، دراصل ایسے ہی ماحول کے لئے ''دارالحرب'' کی اصطلاح فقہاء نے ایجاد کی ، یعنی ایسا علاقہ جہاں مسلمان عداوت اور جنگ سے دوچار ہوں ، انہیں مذہبی آزادی حاصل نہ ہو ، انہیں اپنے مذہب پر برسرِ عام عمل کرنے اور پُرامن طریقہ پر دعوت وتبلیغ کی بھی اجازت حاصل نہ ہو ، اس کے مقابلہ میں جہاں مسلمان اور غیر مسلم بقائے باہم کے اصول پر رہتے ہوں اور اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہوں ، اس

کوقدیم فقہاء نے ’’دارالعہد‘‘یا’’دارالموادعہ‘‘ سے تعبیر کیا ہے،خواہ وہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو یا غیر مسلموں کی ،اس کی دو مثالیں خود عہد نبوی میں ملتی ہیں: ایک حبشہ میں مسلمانوں کے قیام کی، جس میں عیسائیوں کا غلبہ تھا اور مسلمانوں کی حیثیت پناہ گزینوں کی تھی ، دوسرے مدنی زندگی کا ابتدائی دور،جس میں آپ ﷺ نے مہاجرین،انصار، یہود اور بچے کھچے مشرکین کے درمیان معاہدہ کرایا تھا کہ وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہیں گے، اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہوں گے،اسی معاہدہ کو’’میثاق مدینہ‘‘ کہا جاتا ہے، مدینہ کی صورت حال حبشہ سے مختلف تھی ، یہاں مسلمان غالب تھے اور یہود ومشرکین مغلوب ،جس علاقہ میں اس طرح مسلمان اوردوسری مذہبی اکائیاں رہتی ہوں،اس کوقدیم فقہاء نے’’دارالعہد‘‘یا’’دارالموادعہ‘‘ سے تعبیر کیا ہےاوراسی کوموجودہ دور میں زیادہ عام فہم تعبیر میں’’دارالامن‘‘ کہا جاتا ہے۔

اس تفصیل سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں: اول یہ کہ’’حرب‘‘ کے معنی تو لڑائی کے ہیں؛لیکن ’’دارالحرب‘‘ کو اس معنی میں دارالحرب نہیں کہا جاتا کہ وہاں مسلمان اپنے ہم وطنوں سے جنگ پر کمر بستہ ہوتے ہیں؛ بلکہ اس معنی میں’’دارالحرب‘‘ کہا جاتا ہے کہ وہاں خود مسلمان اپنے مخالفین کی طرف سے ظلم وزیادتی کا شکار ہوتے ہیں؛اسی لئے دارالحرب کی تعریف میں فقہاء نے لکھا ہے کہ یہ ایسی جگہ ہے، جہاں غیر مسلموں کو امن حاصل ہو،مسلمانوں کو امن حاصل نہ ہو،کفر کے احکام جاری ہوں،اسلام کے احکام جاری نہ ہوں؛اس لئے دنیا میں جتنے جمہوری ممالک ہیں، وہ حقیقت میں حبشہ یا مدنی دور کے ابتدائی زمانہ کی نظیر ہیں،اور وہ’’دارالحرب‘‘نہیں ہیں،ان کی حیثیت یقینی طور پر’’دارالامن‘‘ کی ہے، ہندوستان کو علماء نے اُس وقت’’دارالحرب‘‘ قرار دیا، جب انگریزوں نے جبراً اس ملک پر قبضہ کرلیا تھااور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی شعائر کی بے احترامی اور مذہبی جذبات کی پامالی روزمرہ کا معمول بن گئی تھی، یہاں تک کہ دہلی کی جامع مسجد کو اصطبل بنادیا گیا تھا۔

جس ملک میں مسلمان اور غیر مسلم ایک معاہدہ کے تحت ساتھ رہتے ہوں، وہاں وہ دونوں ایک دوسرے سے صلح کی حالت میں ہیں نہ کہ جنگ کی حالت میں، ایسا ملک دارالحرب نہیں ہے، قرآن میں صلح کو بہتر قرار دیا گیا ہے:﴿**الصلح خیر**﴾ (النساء :۱۲۸)اسی طرح ہدایت دی گئی ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم گروہ تم سے صلح کی طرف مائل ہو تو تم کو اس کا مثبت جواب دینا چاہئے :

﴿ وإن جنحوا للسلم فاجنح لها ﴾ (الأنفال:٦١) نیز عہد دوافراد واشخاص کے درمیان ہو یا دوقوموں کے درمیان، ان کو پورا کرنا اور عہد شکنی سے بچنا بہر حال لازم ہے: ﴿وأوفوا بالعهد ﴾ (الإسـراء :٣٤) اسی طرح قرآن مجید نے صاف کہا کہ جہاد ان لوگوں سے ہے، جو تم سے جنگ پر تلے ہوئے ہوں: ﴿ قاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم ﴾ (البقرة :١٩١) اللہ تعالیٰ کا ارشاد بالکل واضح ہے کہ جو غیر مسلم تم سے برسر پیکار نہ ہوں اور صلح کی پیشکش کریں، تمہارے لئے ان پر دست درازی کی اجازت نہیں:

﴿ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْاْ إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلاً ﴾ (النساء :٩٠)

لہٰذا جو مسلمان دارالامن میں اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ ایک معاہدہ کے تحت رہتے ہوں، ان سے جہاد کا حکم نہیں اور ہندوستان کے کبھی کسی عالم یا مفتی نے اپنے برادران وطن سے نہ جہاد کی ترغیب دی ہے نہ اس کی اجازت، اور نہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی باضابطہ تنظیم فرقہ وارانہ نفرت کی بنیاد پر قائم ہے، اس کے برخلاف سنگھ پریوار اور اس سے جڑی ہوئی تنظیمیں یقیناً نفرت کی تعلیم دینے میں مشغول ہیں؛ اس لئے وی، ایچ، پی کو چاہئے کہ مسلمانوں سے اس قسم کے مطالبات کر کے برادران وطن کو غلط فہمی میں ڈالنے کے بجائے، خود اپنے رویہ کو درست کرے اور اعلان کرے کہ ہندوستان ایک جمہوری، کثیر مذہبی اور کثیر تہذیبی ملک ہے، جس میں ہر ایک کو اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے اور پُر امن طریقہ پر اس کی طرف دعوت دینے کا اختیار ہے، نیز اس عہد کا بھی اعلان کرے کہ وہ آئندہ نفرت انگیز بیانات اور فرقہ پرستانہ پالیسی سے مجتنب رہے گی، اگر وی ایچ پی حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسا کرے تو یقیناً یہ ملک وقوم کے لئے بھلائی کی بات ہوگی۔

وی، ایچ، پی کا ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ ہندوؤں کو ''کافر'' نہ کہا جائے، —— اس مطالبہ کے پیچھے یہ ذہن کارفرما ہے کہ کافر کہنا توہین کرنا ہے؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے، کفر کے معنی انکار کرنے کے ہیں، اور اسلام کے معنی ماننے کے ہیں، جو شخص اللہ کو ایک اور محمد ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات کو درست مان لے وہ مسلم ہے، اور جو اللہ کے ایک ہونے کا اور آپ ﷺ کی لائی ہوئی

تعلیمات کا انکار کرے وہ کافر ہے، پس کافر کے معنی اسلام کو نہ ماننے والے کے ہیں، گویا یہ غیر مسلم (Non Muslim) کا ہم معنی لفظ ہے، اس میں اہانت اور تحقیر کا معنی نہیں، اگر یہ لفظ اہانت آمیز ہوتا تو سب سے پہلے ''کافر'' کہے جانے یا ''کافر'' کے لفظ سے خطاب کئے جانے کا اہل مکہ برا مانتے اور وہ قرآن کی اس تعبیر پر اعتراض کرتے؛ لیکن انہوں نے کبھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا؛ کیوں کہ وہ صاحبِ زبان ہونے کی وجہ سے اس لفظ کی حقیقت سے واقف تھے؛ بلکہ اہل مکہ تو خود بھی اپنے آپ کو اسلامی تعلیمات کے مقابلہ میں کافر کہتے تھے: ﴿ إنا بما أرسلتم به كافرون ﴾ (الزخرف:۲۴) —— ذمہ دار لوگوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ ایسی نادانی کی باتیں کریں اور ناواقفیت اور لاعلمی کے ساتھ بڑے بڑے دعوے کر بیٹھیں۔

ویسے اگر وی، ایچ، پی کے لوگ یہ چاہتے ہوں کہ، انہیں کافر نہ کہا جائے، مسلمان کہا جائے ، تو ان کے لئے اس کا راستہ کھلا ہوا ہے، اگر وہ ٹھنڈے دل ودماغ سے قرآن مجید کا مطالعہ کریں اور اس کی دعوت حق پر لبیک کہہ دیں تو صرف ہندوستان کے مسلمان ہی نہیں، پوری دنیا کے مسلمان ان کو ''مسلمان'' کہیں گے؛ کیوں کہ اسلام پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، یہ ایک آفاقی سچائی ہے اور ہر انسان اس روشنی سے اپنے دل ودماغ کی دنیا کو روشن کرسکتا ہے، یہ یہودی مذہب نہیں کہ کوئی غیر اسرائیلی اس میں داخل نہیں ہوسکے، یہ ہندو مذہب بھی نہیں، جس میں غیر برہمنوں اور دلتوں کے لئے مذہبی عہدے ہی نہیں، بہت سی عبادت گاہیں بھی بند ہیں، یہ گورے اور کالے میں امتیاز برتنے والی عیسائیت بھی نہیں ہے، یہ ایک عالمگیر مذہب ہے، جس میں گورا اور کالا، عربی اور عجمی اور نئے اور پرانے میں کوئی تفریق نہیں، کاش! وی، ایچ، پی کے لوگ اس برادرانہ دعوت پر جذبات سے خالی ہوکر غور کریں، اور سمجھ لیں کہ جیسے سورج کی کرنوں اور چاند کی خوبصورت روشنی پر کسی ایک گروہ کا استحقاق نہیں؛ بلکہ یہ ساری انسانیت کے لئے اس کے پروردگار کا تحفہ ہے، اسی طرح اس کا بھیجا ہوا دین بھی ایک خورشید عالم تاب ہے، اس کی روشنی میں ہندو بھائیوں اور وی، ایچ، پی والوں کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا مسلمانوں کا۔

۶/ مارچ ۲۰۰۹ء

نادان دوست

فارسی زبان کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ ''دانا دشمن نادان دوست سے بہتر ہوتا ہے'' یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات ناداں دوست سے ایسا نقصان پہنچ جاتا ہے کہ عقلمند دشمن بھی وہاں تک نہیں پہنچ پاتا، موجودہ حالات میں اس کی ایک مثال پڑوسی ملک پاکستان میں یہ طالبان کا رویہ ہے، ''طالبان تحریک'' کی جب ابتدائی ہوئی تو اس وقت غالباً پاکستان کے مدارس کا حلقہ بھی اس کے پس پشت تھا، اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ افغانستان میں کمیونسٹوں کے انحطاط کے بعد قبائلی عصبیتوں کی آگ بھڑک اٹھی، پورا ملک امن وسکون سے محروم ہوگیا، مختلف کمانڈروں اور قبائلی سرداروں نے مختلف حصوں میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کرلیں اور ایک خانہ جنگی کی صورت پیدا ہوگئی، ان حالات میں ایک ایسی طاقت کی ضرورت تھی، جو اس ملک کی وحدت کو بچائے، امن وامان قائم کرے اور قانون کی حکمرانی بحال ہو؛ چنانچہ افغانستان کے کچھ علماء جو سرحدی علاقوں کے تربیت یافتہ تھے، اس مقصد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، اور انہوں نے کسی بڑی مزاحمت کے بغیر نہ صرف دارالحکومت کابل پر قبضہ کرلیا؛ بلکہ افغانستان کے ۹۰/ فیصد علاقوں پر ان کی حکومت قائم ہوگئی۔

اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ایک ایسے ملک — جو کئی سالوں سے لاقانونیت اور انحطاط کا شکار تھا — کو بہت کم وقت میں انہوں نے امن کا گہوارہ بنادیا، ملک ترقی کے راستے پر آگیا اور انہیں بے پناہ عوامی ہمدردی بھی حاصل ہوئی، عوامی حمایت ہی کا نتیجہ ہے کہ مغربی ملکوں کے ہر طرح کے جتن کرنے کے باوجود وہ انہیں زیر نہیں کرسکے؛ کیوں کہ طالبان کی قیادت اس وقت بھی بہت پڑھے لکھے اور زمانہ شناس علماء کے ہاتھوں میں نہیں تھی؛ اس لئے بعض ایسے اقدامات سامنے آئے، جو یقیناً مصلحت کے خلاف تھے، پھر ۱۱/ستمبر کا واقعہ پیش آیا اور اس کو بنیاد بناکر کسی ثبوت کے بغیر امریکہ نے پوری قوت کے ساتھ افغانستان پر حملہ بول دیا، اور طالبان کی

ایک پرامن اور جائز حکومت ختم کردی، اس کے بعد سے اب تک ملک میں دوبارہ امن قائم نہیں ہوسکا، اس وقت جس حکومت کو افغانستان کا نمائندہ حکومت قرار دیا جارہا ہے، اس کی حالت یہ ہے کہ وہ کابل تک محدود ہے اور خود کابل بھی مخالفین کے حملوں سے محفوظ نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں امریکہ اور مغربی ملکوں نے جو زیادتی کی ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے؛ لیکن اس کا دوسرا منفی اثر یہ ہوا کہ طالبان کی بکھری ہوئی طاقت افغانستان اور پاکستان کے سرحدی علاقوں میں پھیل گئی، اس تحریک سے علماء کا کنٹرول ختم ہوگیا، عام جنگجو اور قبائلی لڑنے بھڑنے والے لوگ بڑی تعداد میں شامل ہوگئے ہے اور اب یہ تحریک ایک شدت پسند، بے لچک، ناروادار، باغی اور من مانی کرنے والے گروہ کی حیثیت سے موجود ہے، پاکستان کا علاقہ وادیٔ سوات جو بڑا خوبصورت اور سیاحتی مقام ہے، جو ایک مدت تک امن وامان کے لئے مشہور تھا، اب وہاں طالبان نے ایک متوازی حکومت قائم کردی ہے، وہ اپنا علاحدہ عدالتی نظام قائم کررہے ہیں، جزیہ کے نام سے غیر مسلموں پر بڑی بڑی رقمیں عائد کی گئی ہیں، اور وہ اپنے طرز عمل سے ان لوگوں کے لئے غذا فراہم کررہے ہیں، جو اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنا چاہتے ہیں، اس میں کتنی سچائی ہے، وہ اللہ ہی کو معلوم ہے؛ لیکن دل میں بار بار یہ خیال گزرتا ہے کہ طالبان کا ایک حلقہ یہودیوں اور نصرانیوں کا دانستہ یا نادانستہ آلۂ کار بن چکا ہے؛ تاکہ مسلمانوں کو رسواء کرنے میں اور مسلم ملکوں کو نشانہ بنانے کے لئے مغرب کو جواز حاصل ہوجائے۔

طالبان کے موجودہ رویہ کے سلسلہ میں تین باتیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں: پہلی بات یہ ہے کہ قانونِ شریعت کے نفاذ کے لئے قانون کی طاقت کافی ہے، اور ڈنڈے اور لاٹھی سے اس کو نافذ کیا جاسکتا ہے، یا ماحول سازی اور نظری انقلاب بھی ضروری ہے؛ یہ بات غور کرنے کی ہے، رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے دل بدلنے، سوچ میں تبدیلی لانے اور قانون شریعت کے لئے ماحول کو سازگار کرنے کی کوششیں کی گئیں، سود کی شناعت حدیث میں سب سے زیادہ شدت کے ساتھ ذکر کی گئی ہے؛ لیکن اس کی مکمل حرمت کا اعلان بالکل اخیر دور میں ہوا ہے، زنا کی سزا سب سے سخت رکھی گئی ہے؛ لیکن زنا کی حد شرعی خاص تاخیر سے مقرر کی گئی، اور متعہ — جو نکاح اور زنا کے درمیان کی ایک صورت تھی — کی کچھ عرصہ اجازت دی گئی، شراب ام المؤمنین

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق چار مرحلوں میں حرام کی گئی، نماز ابتداءً دو وقت کی فرض کی گئی، پھر پانچ وقت کی؛ لیکن بہت سی سہولتوں کے ساتھ، یہاں تک کہ نماز کے درمیان گفتگو کی بھی اجازت تھی، کافی عرصہ کے بعد گفتگو حرام ہوئی۔

احکام شرعیہ میں تدریج کا مقصد یہ تھا کہ آنے والے حکم کے لئے لوگوں کی ذہن ہموار ہو جائے، لوگ اندر کی آمادگی کے ساتھ اس حکم کو قبول کر لینے کو تیار ہو جائیں، اور کسی تشدد کے بغیر احکام شرعیہ کا نفاذ ہو سکے، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ شراب عرب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی؛ لیکن جب شراب حرام کی گئی تو کسی تھانہ پولیس کے بغیر لوگوں نے مدینہ کے گلیوں اور کوچوں میں شراب بہادی، زنا کی سزا مقرر ہونے کے بعد یہ صورت پیش آئی کہ جن لوگوں سے رات کی تنہائی میں گناہ کا ارتکاب ہوا اور جن کے خلاف کوئی شہادت موجود نہیں تھی، انہوں نے خود بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر اپنے غلطی کا اعتراف کیا، اور اپنے آپ کو سنگسار کرانے کو گوارہ کیا؛ لیکن انہیں یہ بات گوارہ نہیں ہوئی کہ اپنے دامن عمل پر گناہ کا دھبہ لے کر خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوں۔

احکام شرعیہ کے نفاذ کا یہی صحیح اور فطری راستہ ہے اور آج کے دور میں اس کے لئے زیادہ مواقع ہیں؛ کیوں کہ کسی بھی جمہوری ملک میں رائے عامہ کو ہموار کر کے آپ اقتدار کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں، اور حکومت کے ساتھ قانون شریعت کو نافذ کر سکتے ہیں، اس سے پہلے صوبۂ سرحد میں مفتی محمود صاحبؒ الیکشن جیت کر وزیر اعلی بن چکے ہیں، انہوں نے اپنے عہد حکومت میں شرعی قوانین نافذ کئے اور ان کے دور کو وہاں کا زریں دور شمار کیا جاتا ہے، اگر چہ یہ سطور پڑوسی ملک کے حالات کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں؛ لیکن یہ بات دنیا کے ہر علاقہ کے لئے یکساں طور پر قابل عمل ہے کہ قانون شریعت کو زبردستی نافذ کرنے کی بجائے پہلے دل و دماغ کو بدلنے اور ماحول کو سازگار بنانے کی کوشش کی جائے؛ تاکہ لوگوں میں بغاوت اور انکار کا ذہن پیدا نہ ہو، اور اندر کی آمادگی کے ساتھ لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پر عمل کریں۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ کیا ہر شخص کو اپنے طور پر شریعت کے احکام جاری کرنے اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کا اختیار ہے؟ —— اگر ہر شخص کو اس کا اختیار ہو جائے تو لاقانونیت عام ہو جائے گی، امن کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور انصاف کے نام پر ظلم و جور کے ارتکاب کی

راہیں کھل جائیں گی ؛ اسی لئے شریعت میں بہت سے احکام فرماں روا سے متعلق کئے گئے ہیں ، قاضی مقرر کرنا ، عدالتی نظام قائم کرنا ، شرعی سزاؤں کو جاری کرنا ، لوگوں کو بزور طاقت کسی قانون کا پابند بنانا اور قانون کی پابندی نہ کرنے والوں کی سرزنش کرنا ، سب امیر المؤمنین سے متعلق ہے ؛ اسی لئے حدود قائم کرنے کو دارالاسلام سے متعلق رکھا گیا ہے ، یہاں تک کہ اگر کوئی دارالکفر میں حد شرعی والے جرم کا ارتکاب کرے تب بھی دارالاسلام میں اس پر سزا جاری نہیں کی جائے گی ؛ کیوں کہ جہاں اس نے جرم کا ارتکاب کیا تھا ، وہ خطہ مسلمان کی عملداری سے باہر تھا۔

اس لئے ایک حکومت اور فوج کی موجودگی میں متوازی حکومت اور فوج قائم کرنا اور اپنے طور پر عدالتی نظام جاری کر دینا اور بزور طاقت جس چیز کو بُرا سمجھتے ہیں ، اس کو روکنا شریعت اسلامی کا بے محل استعمال اور دین کو بدنام کرنے کا باعث ہے ، ان حالات میں علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ طاقت کے بجائے زبان و قلم کا استعمال کریں ، لوگوں کو اندر سے اتباع شریعت پر آمادہ کریں ، اور حکومت سے پُر امن طور پر غیر شرعی قوانین کو ختم کرنے کا مطالبہ کریں ؛ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے بُرائی کو روکنے کے تین درجات بیان کئے ہیں : پہلا درجہ '' طاقت '' کا ہے اور یہ ان لوگوں کے لئے ہے جن کو غلطی کرنے والوں پر اختیار ہو ، جس میں سرفہرست حکومت ہے ، پھر ماں باپ اور شوہر ہیں ، دوسرا درجہ '' زبان '' کا ہے کہ زبان سے بُرائی کو روکنے کی کوشش کی جائے ، علماء و مشائخ اور عام لوگ اسی کے مکلّف ہیں ، تیسرا درجہ '' دل سے بُرا سمجھنے '' کا ہے ، یعنی اگر زبان سے منع کرنے میں فتنہ کا اندیشہ ہو تو آخری درجہ ہے کہ دل سے بُرا سمجھے ، (صحیح مسلم ، کتاب الإیمان ، باب بیان کون النھی عن المنکر من الإیمان وأن الإیمان یزید وینقص ، حدیث نمبر : ۹۴) یہ حدیث جہاں بُرائی کو روکنے کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے ، وہیں اس سلسلہ میں مختلف لوگوں کے دائرہ اختیارات کو بھی واضح کرتی ہے ، بعض دفعہ لوگ جوش میں اپنے دائرہ اختیار سے نکل کر کام کرنے لگتے ہیں ، اور اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ان کی کوششیں پورے اخلاص کے باوجود نتیجہ خیز اور ثمر آور ہونے کی بجائے اور نقصاندہ ہو جاتی ہیں۔

تیسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ دین کے کسی حکم پر عمل کرتے ہوئے حکمت کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے ، اور کسی عمل پر مرتب ہونے والے اثرات اور فوائد و نقصان کا تجزیہ کرنے کے بعد ہی

قدم اٹھانا چاہئے ، رسول اللہ ﷺ جب نبوت سے سرفراز کئے گئے تو کعبۃ اللہ کی عمارت بنائے ابراہیمی پر قائم نہیں تھی ، آپ ﷺ چاہتے تھے کہ اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کے مطابق کر دیا جائے ، لیکن اندیشہ تھا کہ اگر ایسا کیا جائے تو عربوں کے ذہن میں یہ بات آئے گی کہ مسلمانوں نے مکہ کو فتح کرنے کے بعد اب کعبۃ اللہ کے احترام کو بھی پامال کرنا شروع کر دیا ہے ، اور دشمنانِ اسلام کو پروپیگنڈہ کا موقع ہاتھ آئے گا ؛ اس لئے باوجود خواہش کے آپ ﷺ اس سے باز رہے ، اور زمانۂ جاہلیت کی تعمیر کو باقی رہنے دیا ، غیر شادی شدہ زانی کو پہلے کوڑے مارنے کے علاوہ ایک سال کے لئے شہر بدر بھی کیا جاتا تھا ، جس کا ذکر حدیث میں موجود ہے ، (صحیح البخاری ، کتاب الشہادات ، باب شہادۃ القاذف والسارق والزانی ، حدیث نمبر : ۲۵۰۶) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو اسی طرح شہر بدر کیا ، وہ مرتد ہو گیا ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ میں آئندہ جلاوطنی کی سزا نہیں دوں گا ، (سنن النسائی ، کتاب الأشربۃ ، باب تغریب شارب الخمر ، حدیث نمبر : ۵۶۷۶) ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے دور میں جب شدید قحط پڑا تو آپ رضی اللہ عنہ نے چوری کی شرعی سزا — ہاتھ کاٹنے — کو موقوف فرمایا ؛ کیوں کہ غذائی اشیاء کی قلت کی وجہ سے لوگ اس وقت اضطراری حالت میں تھے ، اور یہ سزائیں اس وقت قابل نفاذ ہیں ، جب کسی شخص نے حالت اختیار میں جرم کا ارتکاب کیا ہو ؛ اس لئے شریعت میں کسی بات کا صرف ثبوت کافی نہیں ہے ؛ بلکہ یہ تحقیق بھی ضروری ہے کہ کیا اس پر عمل کرنے کا محل یہی ہے اور اس وقت اس پر عمل کرنا شریعت کے مزاج کے مطابق ہے یا نہیں ؟

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ طالبان شریعت کے نام سے جو کچھ کر رہے ہیں ، اولاً تو ان کا شریعت کے مطابق ہونا ہی محل نظر ہے ، دوسرے ان کے اس عمل کی وجہ سے پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی رسوائی ہو رہی ہے ، اور ایک شدت پسند اور جبر و اکراہ پر مبنی مذہب کی حیثیت سے اسلام کی تصویر لوگوں کے سامنے آ رہی ہے ، اس طرح اسلام کے دعوت و اشاعت تو کیا ہوگی ، اس کے بجائے اس صورت حال کی وجہ سے اس میں رخنہ پڑ رہا ہے ، اور مغربی میڈیا جو پہلے سے ایسے مواقع کی تلاش میں ہے اور اسلام مخالف پروپیگنڈہ اس کی کوششوں کا محور ہے ، وہ پوری قوت کے ساتھ اس موقع سے فائدہ اٹھا رہا ہے ؛ اس لئے موجودہ حالات میں کوئی بھی قدم اٹھاتے ہوئے

ہمیں اس کے مضرات کو ضرور سامنے رکھنا چاہئے ، اور اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ ہمارا کوئی عمل اسلام کے دشمنوں کے مقاصد کو پورا کرنے میں مدومعاون نہ ہونے پائے۔

۸/ مئی ۲۰۰۹ء

ملک وقوم کے لئے یوم سیاہ

۲/ جولائی ۲۰۰۹ء کی تاریخ ہندوستان کے لئے مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے سیاہ دن کہے جانے کی مستحق ہے، جب دہلی ہائی کورٹ نے ہم جنسی کے نکاح کو جائز قرار دیا اور حکومت سے اس قانون کو تبدیل کرنے کی خواہش کی، جو ایسے نکاح کو جرم قرار دیتا ہے، توقع کے مطابق کمیونسٹوں کے سوا تمام گروہوں نے اس فیصلہ کو شرمناک اور ناقابل قبول قرار دیا ہے، مسلمان، ہندو، عیسائی اور تقریباً تمام ہی مذہبی گروہوں نے نہایت شدت کے ساتھ اس فیصلہ کی مخالفت کی ہے اور اس کا جواز فراہم کرنے کے لئے قانون میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کو منع کیا ہے۔

حکومت نے ابھی اس پر اپنا موقف واضح نہیں کیا ہے؛ لیکن اس وقت ہندوستان پر ترقی کا جونشہ سوار ہے اور جس کے لئے وہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو مغربی اقوام اور حکومتوں کا دست نگر سمجھتا ہے، اس کے تحت اگر ہندوستان کبھی مغربی ملکوں کے دباؤ میں آکر اس طرح کی قانون سازی کو قبول کرلے اور اسے جائز قرار دے دے تو اس پر حیرت نہیں ہونی چاہئے ؛ کیوں کہ انسانی نفسیات یہ ہے کہ جب اس میں معاشی فارغ البالی کی طمع پیدا ہوجاتی ہے تو اس کے لئے خوشامد اور خود سپردگی کی کوئی سرحد باقی نہیں رہتی اور اپنے عزت ووقار کا سودا کرنا بھی اس کے لئے آسان ہوجاتا ہے۔

خدا نے انسان کی صنفی ضرورت کو پورا کرنے ہی کے لئے مردوں اور عورتوں کو پیدا فرمایا ہے اور یہ نظام ابتداء انسانیت سے ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور بہشت کو ان کا مسکن بنایا، جہاں راحت وسکون کے تمام اسباب موجود تھے؛ لیکن پھر بھی اسے کافی نہیں سمجھا گیا اور حضرت حواء علیہا السلام کی شکل میں ایک عورت کو حضرت آدم علیہ السلام کا جوڑا بنایا گیا: ﴿ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا ﴾ (النساء :۱)؛ کیوں کہ زندگی گزارنے کے لئے مرد اور عورت کی رفاقت سے صرف انسان کی صنفی خواہشات ہی پوری نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ اس سے نسل انسانی کی افزائش بھی ہوتی ہے،

خاندان وجود میں آتے ہیں اور انسان کے اندر صنف مخالف کی طرف رغبت کی جو فطری کیفیت رکھی گئی ہے، اس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے لئے سکون کا ذریعہ بنتے ہیں، نیز انسان کو خوشگوار زندگی گزارنے کے لئے تقسیم کار کی ضرورت ہوتی ہے کہ ایک فریق گھر کے باہر کے کام کرے اور ایک فریق گھر کے اندر کی دنیا کو دیکھے، ایک فریق سے بچوں میں کسی قدر خوف ہو اور دوسرا فریق اس کے لئے پیار و محبت کا پیکر ہو، مردوں اور عورتوں کی چوں کہ صلاحیتیں الگ الگ ہیں؛ اس لئے ان دونوں کا اشتراک تقسیم کار میں معاون ہوتا ہے، اگر دونوں فریق ایک ہی طرح کی صلاحیتوں کے حامل ہوں تو معاشرتی زندگی کے امور کی ان کے درمیان مناسب طور پر تقسیم نہیں ہو پائے گی۔

غرض کہ ازدواجی زندگی کا مرد اور عورت کے ذریعہ وجود میں آنا خدا کی بنائی ہوئی فطرت ہے، اس کی خلاف ورزی درحقیقت قانون فطرت سے بغاوت ہے اور خدا کی بنائی ہوئی فطرت سے بغاوت ایسا جرم ہے کہ آخرت سے پہلے دنیا ہی میں انسان کو اس کی سزا دی جاتی ہے، خواہ افراد کو ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے انفرادی طور پر دی جائے یا پوری قوم یا اس کا غالب حصہ اجتماعی حیثیت میں بداعمالی کا مرتکب ہو اور اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے؛ چنانچہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ سب سے پہلے اس برائی میں جو قوم مبتلا ہوئی، وہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم تھی، جو اردن میں بحر مردار کے جنوب میں واقع ''سدوم'' نامی شہر میں قیام پذیر تھی؛ اسی لئے اس برائی کا نام عربی زبان میں لواطت اور لاطینی زبان میں سدومی (sodomy) پڑ گیا، قرآن مجید میں اس قوم کی بدخصلتی، حضرت لوط علیہ السلام کی طرف سے اصلاح کی کوشش اور پھر اس قوم پر اللہ کے غیر معمولی عذاب کا تفصیل سے نقشہ کھینچا گیا ہے:

> ''اور اسی طرح ہم نے لوط کو پیغمبر بنا کر بھیجا، جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ کیا تم لوگ ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو کہ تم سے پہلے ساری دنیا جہان میں کسی نے ایسا نہیں کیا؟ (وہ یہ کہ) تم عورتوں کو چھوڑ کر خواہش نفسانی پوری کرنے کے لئے مردوں پر مائل ہوتے ہو، حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ حد سے گذر جانے والے ہو، اور لوط کی قوم سے اس کے سوا کچھ جواب نہ بن پڑا کہ وہ (آپس میں) کہنے لگے کہ ان لوگوں کو اپنی

بستی سے نکال باہر کرو، کہ یہ بڑے پاک بنتے ہیں، تو ہم نے لوط علیہ السلام کو
اور ان کے گھر والوں کو تو بچالیا، سوائے اس کی بیوی کے، کہ وہ انہی
لوگوں میں رہی جو عذاب میں رہ گئے تھے، اور ہم نے ان پر پتھروں کا
مینہ برسایا تو دیکھو ان مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟'' (الأعراف :۸۰-۸۴)

قرآن مجید کا یہ بیان اور اس فعل کی وجہ سے عذاب الٰہی کا نزول ہی اس برائی کی شناعت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے؛ لیکن اس کے علاوہ حدیثوں میں بھی کثرت سے اس کی مذمت وارد ہوئی ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تم جس قوم کو لوط کا عمل کرتے ہوئے دیکھو تو اس فعل کا ارتکاب کرنے والے کو بھی قتل کردو اور اس شخص کو بھی جس کے ساتھ یہ فعل کیا جا رہا ہو، (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۴۵۶، ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۴۶۲) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ قوم لوط کا عمل کرنے والوں پر لعنت ہے، (دیکھئے: جمع الفوائد ،حدیث نمبر: ۲۵۹۵) ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی مرد کے ساتھ برائی کرے یا کسی عورت کے ساتھ غیر فطری راستہ میں برائی کرے، اللہ اس کی طرف نظر رحمت نہیں اٹھائیں گے:

'' لا ينظر الله إلى رجل أتى رجلا أو امرأة في الدبر''

(ترمذی، حدیث نمبر: ۱۱۶۶)

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کے مرد کے ساتھ اور عورت کے عورت کے ساتھ جنسی تعلق کو قرب قیامت کی علامتوں میں سے قرار دیا ہے:

'' إن من أعلام الساعة وأشراطها أن يكتفي الرجال بالرجال والنساء بالنساء ''

(طبراني كبير ، عن عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ ،حدیث نمبر: ۱۰۵۵۶)

آج امریکہ اور مختلف مغربی ملکوں میں ہم جنسی کے نکاح کی یا تو قانونی طور پر اجازت دے دی گئی ہے یا وہ اس کی اجازت دینے کے قریب ہیں، یہ یقیناً اسی حدیث کا مصداق ہے، جس کے ممنوع ہونے پر دنیا کے تمام مذاہب متفق ہیں، افسوس کہ یہود ونصاریٰ نے خود اپنے دین اور اپنی

مذہبی کتابوں کواس طرح پس پشت ڈال دیا ہے کہ گویا وہ کوڑا کرکٹ ہیں، بائبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نکاح میں حضرت سارہ علیہا السلام اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے ہونے کا، حضرت یعقوب علیہ السلام کی بیوی کا، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام اور مختلف پیغمبروں کی ازواج مطہرات کا ذکر موجود ہے، ہندو مذہب میں شری رام جی کی بیوی کی حیثیت سے سیتا جی کا نام مشہور ہے، رام جی کے والد اور والدہ کا ذکر بھی ملتا ہے، رادھا نامی خاتون کرشن جی کی طرف منسوب ہیں، غرض کہ تمام مذہبی کتابوں میں مرد و عورت کے جوڑے کا تصور موجود ہے اور کبھی بھی مرد کی مرد یا عورت کی عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی کا تصور نہیں ملتا ہے، جو لوگ خدا اور مذہب کے منکر ہیں، وہ اس غیر فطری ازدواج کے قائل ہوتے تو شاید کم حیرت ہوتی؛ لیکن افسوس کہ جو لوگ اپنے آپ کو انبیاء کی طرف منسوب کرتے ہیں اور آسمانی کتابوں کے حامل ہونے کے مدعی ہیں، وہی اس وقت فطرت کے خلاف بغاوت میں پیش پیش ہیں۔

مذہب اور اخلاق کی ترازو میں تو یہ ہے ہی جرم عظیم؛ لیکن عقل اور طبی تجربات بھی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ انتہائی ناروا فعل ہے، قوم لوط کے بعد یہ برائی جن قوموں میں اجتماعی طور پر پھیلی ان میں قدیم یونان بھی ہے، حد یہ ہوگئی کہ یونانیوں نے اس بے ہودہ فعل کو (Greek love) کا نام دے دیا، یہاں تک کہ یہ اخلاقی انارکی اس ترقی یافتہ قوم کی مکمل تباہی کا باعث بن گئی، اسی طرح کی صورت حال قدیم ایرانی تہذیب میں بھی پیش آئی، افسوس کہ موجودہ دور میں یہ اخلاقی بیماری نہ صرف واپس آرہی ہے؛ بلکہ اخلاقی دیوالیہ پن کی انتہاء ہے کہ اسے قانونی جواز بھی دیا جارہا ہے؛ لیکن خدا کی نافرمانی اور فطرت سے بغاوت ایسی چیز ہے کہ وہ انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی؛ چنانچہ ایڈز کی بیماری کے جو ابتدائی واقعات امریکہ کی ریاست سانفرانسسکو میں سامنے آئے، وہ ایسے ہی نوجوان لڑکوں میں، جو ہم جنسوں سے تعلقات رکھتے تھے، پھر بدکردار خواتین تک بھی یہ بیماری پہونچی اور ان کے واسطہ سے پیٹ میں پرورش پانے والے معصوم بچے بھی اس کا شکار ہوئے اور لاکھوں لوگوں کو اس بیماری نے اپنا لقمۂ تر بنالیا۔

یہ بات میڈیکل دنیا میں پوری طرح تسلیم شدہ ہے کہ ایڈز کی بیماری کا بنیادی سبب ہم جنسی، جنسی انحراف کے دوسرے طریقے اور پاکیزہ زندگی سے محروم ہونا ہے، اور اس سے بڑی آفت یہ

ہے کہ جب ایک شخص اپنی بدکاری کی وجہ سے اس بیماری کا شکار ہوجاتا ہے تو پھر اس کے ذریعہ بہت سے بے قصور اور معصوم لوگ اس کا شکار بنتے چلے جاتے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے ایک طرح کا عذاب ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب بھی کسی قوم میں بدکاری کی کثرت ہوگی؛ یہاں تک کہ وہ کھلے عام اس کا ارتکاب کرنے لگیں گے، تو ان میں پلیگ اور ایسی تکلیف دہ بیماریوں کا ظہور ہوگا، جو ان کے گذشتہ لوگوں میں کبھی بھی پیدا نہ ہوئی ہوگی:

”.... لم تظهر الفاحشة في قوم قط ؛ حتى يعلنوا بها إلا فشا فيهم الطاعون والأوجاع التي لم تكن مضت في أسلافهم الذين مضوا “

(سنن ابن ماجة ، عن عبد الله بن عمر ؓ ،حدیث نمبر:۴۰۱۹)

ہندوستان ہمیشہ سے ایک مذہبی ملک رہا ہے، یہ مختلف مذاہب کا گہوارہ ہے، یہاں بڑے بڑے اخلاقی رہنما اور صوفیا گزرے ہیں، شرم وحیاء اور عزت و پاکدامنی کو ہمیشہ یہاں ایک جوہر گراں مایہ سمجھا گیا ہے، اس ملک میں ہم جنس پرستی کو جائز قرار دینے کی کوشش نہایت افسوس ناک اور اس سے بڑھ کر شرم ناک ہے، یہ فطرت سے بغاوت اور اللہ کے عذاب کو دعوت دینا ہے؛ اس لئے ہندوؤں، مسلمانوں اور تمام مذہبی فرقوں کا فریضہ ہے کہ وہ باہمی اشتراک واتحاد کے ساتھ اس غیر شریفانہ اور بیہودہ تحریک کو ابتدائی مرحلہ میں ہی ناکام ونامراد بنادیں، عوامی شعور بیدار کریں، نوجوانوں کو اس کی مضرتوں سے آگاہ کریں، حکومت کو ایسی ناشائستہ باتوں کو قبول کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کریں اور مغرب سے تہذیب کے نام پر بدتہذیبی، عقل کے نام پر بے عقلی اور آزادی کے نام پر نفس اور شیطان کی غلامی کا جو سیلاب آرہا ہے، سب مل کر اس پر بند باندھنے کی کوشش کریں!!

۱۰/ جولائی ۲۰۰۹ء

گردہ فروشی

انسان اپنی جسمانی طاقت وصلاحیت کے لحاظ سے تو ایک عاجز اور کمزور مخلوق ہے، وہ نہ سورج اور چاند کی طرح روشن ہے نہ پتھر اور فولاد کی طرح مضبوط، نہ اس میں سمندر اور ہوا کا بہاؤ ہے اور نہ وہ موسم کی شدت سے بے نیاز صدا بہار درخت کی طرح ہے، جومئی کی گرمی ہو یا ستمبر کی برسات یا دسمبر کی سرد ہوائیں، ہر موسم میں کھڑا رہتا اور انسان کی عجز و ناتوانی پر مسکراتا رہتا ہے؛ لیکن ان سب کے باوجود وہی اس کائنات کا مقصود ہے، خدا نے اس دنیا کو دراصل اس کی راحت کے لئے پیدا کیا ہے: ﴿ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ (البقرۃ :۲۹) اور انسان کو خود اپنی عبادت کے لئے: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلاَّ لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ (الذاریات:۵۶) اس لئے اس کا درجہ تمام مخلوقات سے بالا ہے، قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب فرشتوں سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرایا۔ (البقرہ :۳۴) اس میں صرف حضرت آدم علیہ السلام ہی کی فضیلت کا اظہار نہیں؛ بلکہ نسل آدم کی بھی فضیلت واہمیت کا بیان ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے قابل توقیر وتکریم ہونے کا خود اپنی کتاب میں اعلان فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ ﴾ (الإسراء :۷۰) انسان تو چاند کی روشنی اور گلاب کی رنگت پر ریجھتا ہے، نرگس کے پھول کی اپنی آنکھوں سے بڑھ کر تعریف کرتا ہے اور نہ جانے کن کن مخلوقات کی تعریف میں رطب اللسان رہتا ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حقیقت سے ناواقف انسانوں کو بتایا کہ اللہ کی تمام مخلوقات میں سب سے بہتر ڈھانچہ اور سب سے خوبصورت قالب حضرت انسان کا ہے: ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِیْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴾ (التین :۴) اگر سورج کو زبان ہوتی تو وہ انسان کے حسن کا مدح خواں ہوتا، اگر چاند کو قوت گویائی نصیب ہوتی تو وہ انسان کی خوش روئی کی داد دیتا، اگر گلاب کو تعبیر اور اظہار خیال کی طاقت ہوتی تو وہ اپنے حسن کو انسان کے حسن پر نچھاور

کردیتا؛ کیوں کہ انسان کے خلقی وجود کی تعریف خود اس کے خالق و مالک نے کی ہے اور اسی لئے اس کو یہ اعزاز دیا گیا ہے کہ اس کی بندگی اور غلامی اللہ کے لئے مخصوص ہے، یہ غلامی، آقائی سے اور یہ بندگی بادشاہی سے ہزار درجہ بہتر ہے؛ کیوں کہ جو انسان خدا کی بندگی سے نکل جاتا ہے، اسے کتنی ہی مخلوقات خدا کی غلامی قبول کرنی ہوتی ہے:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اس لئے شریعت اسلامی میں قدم قدم پر احترام انسانیت کے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اسلام سے پہلے جنگوں میں جب کوئی گروہ غالب ہوتا تو وہ مفتوحین کے ساتھ ہر طرح کی بدسلوکی روا رکھتا، عورتوں کو برسرعام بے آبرو کرتا، مہلوکین کے جسم کا مثلہ کرتا اور اعضائے جسمانی کو کاٹ کر ان کا ہار پہنتا، کھوپڑیوں میں شراب پی جاتی، ان کی لاشوں کو دفن کرنے کے بجائے یوں ہی چھوڑ دیا جاتا؛ تا کہ چیل کوّے اسے کھا جائیں، رسول اللہ ﷺ نے ان تمام باتوں کو منع فرمایا، آپ ﷺ نے مثلہ کرنے کی ممانعت کی، غزوۂ احد میں رسول اللہ ﷺ کے عم محترم سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا مثلہ کیا گیا، اور خود اس جنگ میں بھی بہت سے مشرکین مارے گئے؛ لیکن مسلمانوں نے جوابی طور پر اس عمل کو دہرانے کی کوشش نہیں کی، آپ ﷺ نے ہمیشہ دشمنوں کے مقتولین کو دفن فرمایا، ایک موقع سے ایک مشرک کی لاش مسلمانوں کے قبضہ میں تھی، مشرکین نے قیمت ادا کر کے لاش حاصل کرنے کی خواہش کی، رسول اللہ ﷺ نے قیمت لینے سے انکار کر دیا اور بلا قیمت لئے لاش واپس کر دی، اس میں گویا انسانی تکریم کا پہلو ہے کہ انسان کو متاعِ خرید و فرخت نہیں بنایا جائے گا۔

بحیثیت انسان احترام و توقیر اور محبت و شفقت کو اسلام نے مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں کیا ہے؛ بلکہ پوری انسانیت کے لئے اس کی تعلیم دی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو بڑے کا احترام نہ کرے اور چھوٹے کے ساتھ شفقت نہیں کرے، وہ ہم میں سے نہیں'' (سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الرحمۃ، حدیث نمبر: ۴۹۴۳، سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۱۹، ۱۹۲۰، ۱۹۲۱، مسند أحمد، حدیث نمبر: ۶۷۳۳، ۷۰۷۳)

یہ توقیر مسلمانوں کے لئے بھی ہے اور غیر مسلموں کے لئے بھی، آپ ﷺ کے سامنے سے ایک جنازہ کا گزر ہوا، آپ ﷺ کھڑے ہو گئے، لوگوں نے عرض کیا: یہ یہودی کا جنازہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’’جان تو اس کے اندر بھی تھی‘‘ (صحیح البخاری ، کتاب الجنائز ، باب من قام لجنازة یھودی ،حدیث نمبر:۱۲۵۰) یعنی اس سے مقصود اس کی انسانی حیثیت کا احترام ہے، چاہے وہ مسلمان ہو یا یہودی یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھنے والا ، غیر مسلم بھائیوں کے یہاں بھی کسی کی موت ہو جائے تو اس سے تعزیت کرنے کا حکم ہے، (رد المحتار ، باب صلاۃ الجنازۃ :۱۵۰/۳) کوئی بیمار پڑ جائے تو اس کی عیادت کی جائے گی ، خود رسول اللہ ﷺ نے ایک بیمار یہودی نوجوان کی عیادت فرمائی ہے، (مسند احمد ،حدیث نمبر:۱۲۸۱۵،۱۴۰۰۹،صحیح ابن حبان ،حدیث نمبر:۲۹۶۰،۴۸۸۴) مکہ کے قحط زدہ مشرکین کے لئے ریلیف بھیجی ہے، (رد المحتار :۳۰۲/۳) ان سب کی بنیاد یہی ہے کہ انسان، انسان ہونے کے لحاظ سے کائنات کا نہایت ہی قابل توقیر وجود ہے۔

اسی احترام کا ایک پہلو یہ ہے کہ انسانی اجزاء کو استعمال کرنے سے بچا جائے ، بال حالاں کہ بے جان شئ ہے، اگر بال کاٹ لئے جائیں اور کوئی دوسرا شخص اسے استعمال کرے تو اس سے بال والے کو کوئی جسمانی تکلیف نہیں ہوگی؛ لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی ہے، جو اپنے بال کے ساتھ دوسروں کے بال جوڑتی ہوں، یا جڑواتی ہوں: ’’ **لعن الله الواصلة والموصلة** ‘‘ (سنن الکبری للنسائی ،حدیث نمبر:۹۳۷۶،مسند ابی یعلی ،حدیث نمبر:۵۳۵۰،مسند احمد ،حدیث نمبر:۴۲۸۴) جسم سے بعض بے جان چیزیں نکلتی رہتی ہیں، جیسے: ناخن اور بال ، اگر ان کو یوں ہی کہیں پھینک دیا جاتا، تب بھی وہ انسان کے لئے جسمانی تکلیف اور مشقت کا باعث نہیں ہوتی؛ لیکن ہدایت کی گئی کہ ان اجزاء کو بھی احترام کے ساتھ زمین میں دفن کر دیا جائے ، موت کے بعد انسان کے جسم کو تعفن سے بچانے اور ماحول کو آلودگی سے محفوظ رکھنے کی مختلف تدبیریں ہو سکتی ہیں ، اسے آگ میں جلایا جا سکتا ہے ، اسے کیمیکل اور نمک میں تحلیل کیا جا سکتا ہے؛ لیکن اسلام نے اس کے لئے نہایت مؤقر طریقہ کی رہنمائی کی کہ مردہ کو پورے احترام کے ساتھ غسل دیا جائے ، پھر صاف وشفاف اور بہتر ہے کہ سفید کفن پہنایا جائے ، اس پر نماز پڑھی جائے اور پھر نہایت ہی عزت وتکریم کے ساتھ اس کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر اس کی آخری منزل

تک پہنچایا جائے، یقیناً تدفین کا یہ طریقہ نہایت ہی احترام پر مبنی طریقہ ہے، شریعت کے اسی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو پیش کش کرے کہ وہ اس کے جسم کے فلاں حصہ کو کاٹ کر کھا جائے تو بھی اس کے لئے ایسا کرنا روا نہیں ہوگا، (بدائع الصنائع :۷/۱۷۷) —— یہ اور اس طرح کے احکام کا منشأ شرافت انسانی کی رعایت اور اس کو اہانت سے بچانا ہے۔

احترام ہی کا ایک پہلو یہ ہے کہ جو چیز بہت زیادہ قابل احترام ہوتی ہے، اس کی تجارت نہیں کی جاتی، جن قوموں کو اپنے مذہب سے تعلق ہوتا ہے اور جو اپنے عقیدہ کے بارے میں سنجیدہ ہوتی ہیں، وہ اپنی عبادت گاہ کی خرید وفروخت کو گوارا نہیں کرتیں، اسی لئے شریعت میں حکم ہے کہ جو جگہ ایک بار مسجد بن جائے، وہ قیامت تک کے لئے مسجد ہے، اس کی خرید وفروخت نہیں ہوسکتی، قرآن مجید کے بارے میں مسلمانوں میں آج بھی یہ روایت موجود ہے کہ مصحف قرآنی کے کاغذ کی قیمت اور طباعت کے اخراجات کے طور پر جو رقم ادا کی جاتی ہے، اسے لوگ ''ہدیہ'' کہتے ہیں، قیمت نہیں کہتے، کیوں کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے، پوری کائنات مل کر بھی اس کی قیمت نہیں بن سکتی، جو پیسے دئے جاتے ہیں وہ —— جیسا کہ مذکور ہوا —— کاغذ اور طباعت کے اخراجات ہیں؛ اسی لئے اسلام میں انسان کی خرید وفروخت بھی نہیں ہوسکتی، کوئی (آزاد) انسان بیچا نہیں جاسکتا، باپ کو اپنے بیٹے پر ایسی ولایت حاصل ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہارا وجود اور تمہارا مال تمہارے باپ کا ہے: ''**أنت ومالک لأبیک**'' (سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، باب ما للرجل من مال ولده، حدیث نمبر: ۲۲۹۱، ۲۲۹۲)؛ لیکن اس کے باوجود کوئی باپ اپنے بیٹے کو فروخت نہیں کرسکتا؛ کیوں کہ انسان اس سے ماوراء ہے کہ اس کو خریدا اور بیچا جائے۔

خدا نے انسان کے جسم کو ایک قیمتی الماری بنایا ہے، جس میں نہایت عظیم الشان نعمتیں محفوظ کردی گئی ہیں، کہیں دماغ ہے، جو پورے جسم کا فرماں روا ہے، پرانی باتیں محفوظ بھی کرتا ہے، نئی باتوں کو سوچتا بھی ہے، پورے جسمانی نظام پر ہر لمحہ نظر رکھتا ہے، اور اسے کنٹرول کرتا ہے، اس سے نیچے اتریئے تو پہلو میں دل ہے، جس کی دھڑکن سے پورا وجود قائم ہے، اس کی اہمیت ڈاکٹروں اور شاعروں دونوں طبقوں کے یہاں یکساں ہیں، اسی سے قریب پھیپھڑا ہے، جو مسلسل سانس لینے اور پھینکنے پر اللہ کی طرف سے مامور ہے، اسی جسم میں جگر ہے، اسی میں گردہ ہے، جو گویا خون کو صاف

کرنے کا کارخانہ ہے، یہیں معدہ ہے، جو کیسی کیسی سخت جان چیزوں کو گلا کر ہضم کرتا ہے، غرض کتنی ہی نعمتیں ہیں جو اس چھوٹے سے وجود میں محفوظ ہیں، دماغ اور قلب کا تو کیا کہنا ؟ لیکن اگر پھیپھڑا ہی کام کرنے میں کوتاہی کرنے لگے اور مصنوعی آلۂ تنفس (Ventilator) لگانا پڑے تو روزانہ ہی پندرہ بیس ہزار روپے خرچ ہو جائیں ، اگر گردہ متأثر ہو جائے اور نوبت ڈائلیسس کی آجائے تو ایک ہی دفعہ میں دس ہزار کا صرفہ ہو جائے ، اس پہلو سے اگر انسان اپنے جسم کے اندر کام کرنے والی مشنریز کی اجرت کا اندازہ لگانا چاہے تو شاید ہر دن لاکھوں روپے کا تخمینہ ہوگا، یہ نعمت کیا انسان نے اپنے پیسوں سے خرید کی ہے، یا ان کو انسان نے اپنی ذہانت اور کاریگری کے ذریعہ وجود بخشا ہے؟ ہرگز نہیں! معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ انسان کے پاس امانت ہے، وہ اس کی ملکیت نہیں ہے، وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے؛ لیکن اس میں تصرف نہیں کر سکتا، یہ بات کس قدر نامعقول ہے کہ آپ کسی کے گھر مہمان ہوں، آپ اس کے گھر سے فائدہ بھی اٹھائیں اور اس کے گھر کا سامان بیچنے بھی لگیں!

اسی لئے اسلام کی نظر میں انسان ''بکاؤ مال'' نہیں ہے، اس کی خرید و فروخت نہیں ہو سکتی، وہ اس سے بالاتر ہے کہ اس کے جسم یا اعضاء کی قیمت لگائی جائے ، مگر افسوس کہ جب انسان اللہ کے دین سے بیگانہ ہوتا ہے، تو اخلاق سے بھی دور چلا جاتا ہے اور یہ اخلاقی پستی انسان کو خود اپنی بے توقیری کے راستہ پر لے جاتی ہے، اب تک یہ بات سننے میں آتی تھی کہ کچھ لوگ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اپنا خون فروخت کر دیتے ہیں، بلڈ بینکوں میں جو خون ملتا ہے اور مریضوں کو بروقت جو خون فراہم ہوتا ہے، ان میں زیادہ تر غریب رکشہ والوں اور ٹھیلہ بنڈی چلانے والوں کا خون ہوتا ہے، سرمایہ دار معنوی اعتبار سے بھی غریبوں کا خون چوستا ہے اور حقیقی اعتبار سے بھی ، اب گردے کی فروخت بھی شروع ہوگئی، اکادکا گردے فروخت کرنے کے واقعات تو پہلے بھی پیش آیا کرتے تھے، جو قانون کی نظر سے بچ کر خریدے اور بیچے جاتے تھے؛ لیکن اب تو ایک ایسا بین الاقوامی گروہ منظر عام پر آیا ہے، جس نے عالمی سطح پر گردہ کی خرید و فروخت کو بطور پیشہ کے اختیار کر رکھا تھا اور ''نزلہ برعضوِ ضعیف'' کے تحت ظاہر ہے کہ غریب اور ترقی پذیر ممالک سے گردے خرید کئے جاتے تھے اور ترقی یافتہ ممالک کو بیچے جاتے تھے، افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس غیر انسانی حرکت میں غیر تعلیم

یافتہ اور مجرم کی حیثیت سے جانے پہچانے لوگوں کے بجائے تعلیم یافتہ سفید پوش مجرمین شامل تھے، خدمت خلق کے پہلو سے ڈاکٹر سے زیادہ معزز بھی کوئی پیشہ ہوسکتا ہے؟ اور انسانی صحت اور زندگی کے بچاؤ سے بھی زیادہ اہم کوئی خدمت ہوسکتی ہے؟ لیکن اس پیشہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ہاتھ بھی غریبوں اور معصوموں کے لہو سے رنگین ہیں۔

اس کے لئے ضرورت ہے ایک طرف عوام میں شعور کو بیدار کرنے کی، انسان کو سمجھایا جائے کہ اس کا وجود کتنا قیمتی اور محترم ہے، وہ متاع خرید وفروخت بننے سے ماوراء ہے، دوسری طرف عصری تعلیم کو مذہب اور اخلاق سے جوڑا جائے، ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ سرکاری درسگاہوں میں اسلام کی یا ہندوازم کی تعلیم دی جائے؛ لیکن کچھ قدریں ایسی ہیں جو تمام مذاہب میں تسلیم شدہ ہیں اور وہی دراصل اخلاق کی بنیادیں ہیں، ان کو تعلیم کا حصہ بنانا چاہئے؛ تاکہ ان کا علم انسانیت کے لئے نافع بنے نہ کہ مضرت رساں، ان کا عمل انسانوں کے لئے رہنما ثابت ہو نہ کہ رہزن، ان کا فن انسانی سماج کے لئے اکسیر حیات ہو، نہ کہ سم قاتل — کاش! ہماری حکومتیں، ہمارے تعلیمی ادارے اور ہمارے تعلیمی اداروں کے معمار اور نقشہ ساز اس پہلو پر غور کریں!!

۱۵/فروری ۲۰۰۸ء

اہل ثروت مسلمانوں کی خدمت میں!

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن نعمتوں سے نوازا ہے، ان میں ایک اہم نعمت مال و دولت بھی ہے، دنیا کے اکثر مذاہب میں دولت اور کسب دولت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے اور اسے خدا کی قربت میں رکاوٹ سمجھا گیا ہے، ہندو، عیسائی، بدھ، ان سبھوں کے یہاں مذہبی پیشواؤں کو معاشی مصروفیات اختیار کرنے کی ممانعت ہے، ان کا گزارہ عوام کی نذر و نیاز پر ہوتا ہے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ جو شریعت لے کر آئے، وہ پوری طرح فطرت انسانی سے مطابقت رکھتی ہے، انسان کی ایک اہم ضرورت مال و دولت بھی ہے؛ کیوں کہ انسان کے زندہ رہنے کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں، ان میں سوائے ''ہوا'' کے تمام چیزیں یا تو خود مال ہیں یا مال کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہیں، کھانا پینا، دوا، لباس اور مکان لازمی ضرورتیں ہیں اور پیسوں ہی کی رہین منت ہیں؛ اسی لئے اسلام نے مال کو مطلقاً ناپسند نہیں کیا ہے، قرآن مجید میں مال کو ''خیر'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ ﴾ (البقرۃ: ۲۷۲) —— خیر کے اصل معنی بھلی بات یا بھلی چیز کے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ مال بھی ایک اچھی چیز ہے، قرآن میں مال کو اللہ کے فضل سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ﴾ (الجمعۃ: ۱۰) —— ایک تو فضل کا لفظ خود ہی بہت اونچا ہے، جس میں فضیلت و بزرگی کے معنی موجود ہیں اور مزید اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کردی جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، مال و دولت کے لئے کسی مذہب میں اس طرح کے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے۔

پھر قرآن مجید میں بعض ان پیغمبروں کا ذکر خیر بھی آیا، جو اپنے وقت کے فرماں روا اور متمول ترین لوگ تھے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، خود رسول اللہ ﷺ کا شمار بھی نبوت سے پہلے مکہ کے اصحاب ثروت میں ہوتا تھا، نبی بنائے جانے کے بعد یقیناً

آپ ﷺ پر فقر وفاقہ بھی گزرا؛لیکن یہ اختیاری فقر تھا،آپ ﷺ کے پاس جب پیسے آتے تو آپ ﷺ اسے راہِ حق میں خرچ کرنے کے لئے بے چین ہوجاتے اور جلد سے جلد تقسیم فرمادیتے ،صحابہ ؓ میں بھی بڑے متمول حضرات گزرے ہیں،حضرت ابوبکر ؓ،حضرت عمر ؓ،حضرت عثمان غنی ؓ ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ؓ وغیرہ کا شمار اس زمانہ کے دولت مند لوگوں میں ہوتا تھا اور وہ اپنی دولت اسلام کے راستہ میں بے تحاشہ خرچ بھی کرتے تھے،آپ ﷺ نے فرمایا کہ فرض نمازوں کے بعد اہم ترین فریضہ کسب حلال ہے:

" **طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة** "(شعب الإيمان للبيهقي ،حدیث نمبر:۸۷۴۱،سنن البيهقي كتاب الإجارة ، باب كسب الرجل وعمله بيديه ،حدیث نمبر:۱۱۴۷۵)

کوئی بھی نعمت ہو، وہ انسان کے لئے اس وقت مفید ہوتی ہے، جب اس کے حاصل کرنے ، اس کے استعمال کرنے اور اس کے خرچ کرنے میں شریعت کے احکام کو ملحوظ رکھا جائے اور قانون فطرت سے بغاوت نہ کی جائے ،کھانا اللہ کی نعمت ہے ؛لیکن کوئی دوسرے کا کھانا چھین کر کھائے یا اتنا کھالے کہ اس کے معدہ کے لئے ناقابل برداشت ہو یا کھانا خرید کر اسے نالیوں میں ڈال دے تو یقیناً یہ نعمت اس کے حق میں زحمت ہے اور یہ حرکت اسے پولیس اسٹیشن یا پاگل خانہ تک بھی پہنچا سکتی ہے ، اسی طرح بہ حیثیت مسلمان ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے مال میں کچھ حقوق بھی رکھے ہیں، ایک حق تو زکوۃ کا ہے، جو صرف ڈھائی فی صد ہے، اس کے علاوہ بھی اگر کوئی سوالی یا نادار شخص سامنے آجائے اور اپنی ضرورت رکھے تو اس کا بھی حق ہے کہ وقت پر اس کی مدد کی جائے:﴿ **وَفِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ** ﴾ (الذاريات :۱۹)—— یہ بات قابل لحاظ ہے کہ قرآن نے ''حق'' کا لفظ استعمال کیا ہے، یعنی یہ تعاون کوئی احسان نہیں ہے ؛ بلکہ یہ ان پر واجب ہے، اگر وہ غرباء کی مدد کررہے ہیں تو ان کا حق ادا کررہے ہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمان اہل دولت میں غریبوں کے حق کا احساس ختم ہوگیا ہے، یہاں تک کہ وہ زکوۃ دینے کو بھی اپنا احسان سمجھنے لگے ہیں، اس کا اندازہ ان کے اس رویہ سے ہوتا ہے، جو انہوں نے زکوۃ کے مستحقین اور دینی مدارس کے نمائندوں کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے، سیٹھ

صاحب کے گھر پر یا دکان پر مانگنے والے مردوں اور عورتوں کی قطار لگی ہوئی ہے، لوگ آہ وزاری کررہے ہیں، ان کا الحاح جتنا بڑھتا جاتا ہے، سیٹھ صاحب کے غصہ کی آگ بھی اسی قدر تیز ہوتی جاتی ہے، ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ گالی گلوج کی بھی نوبت آجاتی ہے، مدارس کے نمائندے تو شاید اس طرح لائن میں نہ لگتے ہوں اور اس نوبت سے نہیں گزرے ہوں؛ لیکن ان کو دوسرے طریقہ پر ایذاء پہونچائی جاتی ہے، موجود ہونے کے باوجود کہلا دیا جاتا ہے کہ موجود نہیں ہیں، بار بار بلایا جاتا ہے، کبھی صبح، کبھی دوپہر، کبھی شام اور کبھی رات، اس کے علاوہ جھڑکیاں دی جاتی ہیں۔

یہ ساری باتیں خدا کو ناراض کرنے والی اور انفاق کے اجر کو ضائع کرنے والی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے زکوۃ وصول کرنے والوں سے بہتر سلوک کا حکم دیا ہے، حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب تمہارے پاس زکوۃ وصول کرنے والے آئیں تو وہ تمہارے پاس سے اس حال میں جائیں کہ وہ تم سے راضی ہوں: ''**إذا أتاكم المصدق فليصدر عنكم وهو عنكم راض**'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر:۹۸۹) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہاری زکوۃ اس وقت مکمل ہوگی، جب یہ لوگ تم سے راضی رہیں اور تمہارے حق میں دعا کریں: ''**فإن تمام زكاتكم رضاهم وليدعو الكم**'' (ابوداؤد، حدیث نمبر:۱۵۸۸)۔

عام طور پر لوگ محصلین زکوۃ کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس غلط فکر کے تدارک کے لئے فرمایا کہ حق کے ساتھ زکوۃ وصول کرنے والا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہوتا ہے، جب تک وہ اپنے گھر واپس نہ آجائے، (ابوداؤد، حدیث نمبر:۲۹۳۶) رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں خود محصلین زکوۃ کے لئے بھی سبق ہے کہ ان کا زکوۃ وصول کرنا شریعت کے دائرہ میں ہو، کام اللہ کی رضا کے لئے کیا جائے، دین کی ایک اہم خدمت سمجھ کر کیا جائے، اجرت لی جاسکتی ہے، مگر صرف اجرت ہی پیش نظر نہ ہو، اجرت اتنی غیر متوازن نہ ہو کہ زکوۃ کا اچھا خاصا حصہ محصل کو چلا جائے اور جس چیز کے لئے زکوۃ دینا مقصود ہے، وہ نظر انداز ہوجائے، کمیشن پر زکوۃ وصول کرنے کا سلسلہ نہ ہو، پوری دیانت کے ساتھ رقم مدرسہ تک پہونچائی جائے اور زکوۃ وصول کرنے میں الحاح اور اپنی تحقیر کا رویہ بھی اختیار نہ کیا جائے؛ کیوں کہ آپ کا زکوۃ وصول کرنا اپنی ذات کے لئے نہیں، سوال میں الحاح کو ناپسند کیا گیا ہے، خواہ سوال اپنے لئے ہو یا دوسروں کے

لئے ، اگر کوئی شخص دینے سے انکار کردے تو اصرار نہ کیا جائے ، اسی طرح اگر کوئی شخص ناشائستہ بات کہے تو اس کا تعاون قبول نہیں کرنا چاہئے ، ادارے اللہ کی مدد سے چلتے ہیں ، نہ کہ اصحاب ثروت کی اعانت سے ، پھر ان کی خوشامد کیوں کی جائے ؟ محصلین کا خوشامدانہ اور اپنی تحقیر کو گوارا کر لینے کا رویہ ایسے خدا ناترس لوگوں کا حوصلہ بڑھا دیتا ہے ، غرض کہ اس حدیث میں ایک طرف زکوۃ دینے والوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ محصلین کو نیچی نظر سے نہ دیکھیں اور خود محصلین کے لئے یہ سبق ہے کہ وہ باوقار طریقہ پر اپنا کام کریں ۔

رسول اللہ ﷺ نے زکوۃ لینے اور دینے کے آداب کے سلسلہ میں ایک اہم بات یہ بھی فرمائی ہے کہ جب زکوۃ دو تو اس کے اجر کو بھولو نہیں ؛ بلکہ ذہن میں اس کا استحضار رکھو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اس کو ہمارے لئے نعمت میں اضافہ کا سبب بنا دے ، اس کو ہمارے حق میں جرمانہ وتاوان نہ بنا دے : ''اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا مَغْنَمًا وَلاَ تَجْعَلْهَا مَغْرَمًا ''(ابن ماجۃ ، حدیث نمبر : ۱۷۹۷) —— انسان کی نفسیات یہ ہے کہ اگر کسی شئی کا نفع اس کے ذہن میں متحضر ہو ، وہ سمجھے کہ یہ اس کے لئے خدا کی نعمت میں اضافہ کا باعث ہوگا تو اسے خوشی ہوتی ہے ، وہ سمجھتا ہے کہ میں اسے کھو نہیں رہا ہوں ؛ بلکہ اسے خرچ کر کے پا رہا ہوں ؛ اس لئے وہ خوش دلی کے ساتھ خرچ کرتا ہے ، کسان کھیت میں بیج ڈال کر اور تاجر مارکٹ سے سامان خرید کر مسرور ہوتا ہے کہ یہ چیز کہیں زیادہ نفع کے ساتھ اس کی طرف واپس آنے والی ہے ، اور اگر اس کے ذہن میں ہو کہ جو مال وہ خرچ کر رہا ہے ، وہ ضائع ہو جائے گا ، اس کے عوض اسے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا تو وہ اسے بے جا تاوان اور جرمانہ سمجھ کر گوارا کرتا ہے ، دیتے وقت اس کا رویہ بھی بہتر نہیں ہوتا ؛ کیوں کہ دل کا یقین انسان کے عمل ، اس کے سلوک ، اس کے طریقۂ کار اور اس کے رویہ پر اثر انداز ہوتا ہے ؛ اس لئے اصل چیز یہ ہے کہ انسان کے اندر اللہ سے اجر وثواب کا یقین پیدا ہو جائے ، یہ یقین جتنا مضبوط ہوگا ، خیر کے کاموں میں خرچ کرنا اتنا ہی آسان ہوگا اور یہ یقین جتنا کمزور ہوگا ، انسان کی طبیعت پر انفاق اتنا ہی بوجھ محسوس ہوگا ۔

اہل ثروت اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ اللہ کے راستے میں جو کچھ وہ خرچ کر رہے ہیں ، دراصل اپنی ہی آخرت کے لئے محفوظ کر رہے ہیں ، اس میں جہاں اخروی زندگی کا اجر وثواب ہے ، وہیں رسول اللہ ﷺ کے زبان حق ترجمان کے مطابق دنیا میں بھی منجانب اللہ ان کی حفاظت کا

سروسامان ہے، کتنی عجیب بات ہے کہ اگر انکم ٹیکس کا آفسر آپ کے گھر پہنچ جائے تو آپ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوں، رشوتیں دیں اور خوشامدیں کریں، اگر محلّہ کا کوئی پہلوان آپ کی دکان پر آدھمکے تو منت سماجت کر کے لوٹائیں، اگر وزراء اور سیاسی جماعتوں کے قائدین چندہ کے طلب گار ہوں تو لجاجت کے ساتھ بڑی بڑی رقمیں ادا کریں؛ لیکن اگر کچھ لوگ اللہ کا نام لے کر اپنی ضرورت آپ کے سامنے رکھیں، رسول اللہ ﷺ کا حوالہ دے کر آپ سے بات کریں تو آپ کی گردنیں اکڑ جائیں، آپ کا سینہ تن جائے، آپ کی آنکھیں چڑھ جائیں، آپ کی زبان بے قابو ہو جائے اور آپ ڈانٹ ڈپٹ کر ان کا استقبال کریں، کیا کسی مسلمان کو یہ بات زیب دیتی ہے؟ کیا اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا رشتہ سرکاری عہدہ داروں، پہلوانوں، سیاسی لیڈروں سے بھی گیا گزرا ہے، اگر قیامت میں رسول اللہ ﷺ دامن تھام لیں کہ تم میری محبت اور تعلق کے بارے میں شیخیاں بگھارتے تھے اور اپنے آپ کو سچا عاشق رسول کہتے تھے؛ لیکن تمہارے نزدیک اس تعلق کی اتنی وقعت بھی نہیں تھی، جو دنیا کے معمولی حکمرانوں کی ہوتی ہے تو اس وقت ہمارا کیا جواب ہوگا؟؟

۱۲/ستمبر ۲۰۰۸ء

افطار پارٹیاں اور ہمارا طرز عمل

جن پانچ اعمال کو اسلام میں خصوصی اہمیت حاصل ہے، ان میں ایک روزہ بھی ہے، نماز اگر خدا کی خشیت کا مظہر ہے تو روزہ اس سے محبت کا اظہار ہے، روزہ کے ذریعہ ایک صاحب ایمان ظاہر کرتا ہے کہ خدا کی محبت اور اس کی خوشنودی کی طلب نے اسے کھانے پینے جیسی بنیادی ضروریات سے بھی بے گانہ کر رکھا ہے، روزہ کی ابتداء طلوع صبح سے ہوتی ہے، اس سے پہلے سحری کھانا مسنون ہے؛ تاکہ روزہ رکھنا آسان ہو، روزہ کی انتہاء سورج کے ڈوبنے پر ہوتی ہے؛ اس لئے سورج کے ڈوبتے ہی افطار کرنا واجب ہے، افطار میں تاخیر کرنا مکروہ ہے اور افطار نہ کر کے دن کے ساتھ ساتھ رات کا بھی روزہ رکھنا ناجائز اور گناہ ہے، اگر دن بھر بھوکا پیاسا رہنا خدا کی بندگی ہے تو افطار میں عجلت کرنا بھی بندگی ہی کا اظہار ہے، دن بھر بھوکا رہنا اگر خدا کی خوشنودی کے سامنے اپنی خواہشات کو قربان کرنے سے عبارت ہے تو افطار میں جلدی کرنا اپنے عجز و درماندگی اور اپنے پروردگار کے سامنے فقر و احتیاج کا اظہار ہے، گویا انسان اپنے پروردگار سے کہتا ہے کہ ہم آپ کی رزق سے بے نیاز نہیں ہو سکتے، ہم تو کھانے کے ایک ایک دانہ اور پانی کے ایک ایک قطرہ کے محتاج ہیں، جب تک آپ نے روکا، رک گئے، پھر جونہی اجازت ملی، آپ کے دسترخوان نعمت پر ٹوٹ پڑے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: میرے بندوں میں مجھے سب سے زیادہ محبوب وہ ہے، جو افطار میں جلدی کرتا ہو: ''**أحب عبادی إليّ أعجلهم فطرًا** '' (سنن الترمذی، عن أبی هريرة ﷺ، باب ما جاء فی تعجيل الأفطار ،حدیث نمبر:۷۰۰)

چوں کہ افطار ہی سے روزہ کی تکمیل ہوتی ہے؛ اس لئے افطار بھی ایک عبادت ہے، جیسے سلام سے نماز کے اور بال مونڈانے سے حج وعمرہ کے افعال مکمل ہوتے ہیں؛ اس لئے سلام اور بال کا مونڈانا یا کٹانا بھی عبادت ہے، اسی طرح افطار بھی روزہ جیسی عبادت کا حصہ ہے؛ اسی لئے رسول

اللہ ﷺ نے افطار کا وقت متعین فرمایا، افطار کے آداب بتائے ؛ کہ افطار سے پہلے یہ دعاء پڑھی جائے:

" اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلیٰ رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ "(سنن أبو داؤد ، کتاب الصیام ، باب القول عند الإفطار ،حدیث نمبر:۲۳۵۸)

''بارالہا! میں نے آپ ہی کے لئے روزہ رکھا اور آپ ہی کی عطاء فرمائی ہوئی رزق پر افطار کررہا ہوں''

افطار کن چیزوں سے ہونا چاہئے ؟ —— آپ ﷺ نے اس کو بھی بیان فرمایا، چنانچہ ارشاد ہے کہ کھجور سے روزہ افطار کیا جائے ، اگر کھجور میسر نہ ہو تو پانی سے افطار کرے؛ کیوں کہ وہ پاک ہے:

" **إذا كان أحدكم صائما فليفطر على التمر فإن لم يجد التمر فعلى الماء فإن الماء طهور** " (أبو داؤد ، عن سلمان بن عامر ﷺ ، باب ما يفطر عليه ،حدیث نمبر:۲۳۵۵)

آپ ﷺ نے خود بھی اس پر عمل فرمایا؛ چنانچہ معمول مبارک تھا کہ اگر تازہ کھجوریں ہوتیں تو ان سے افطار کرتے ، ورنہ خشک کھجور (خرما) سے اور یہ بھی نہ ہوتا تو چند گھونٹ پانی نوش فرمالیتے:

" **كان رسول الله ﷺ يفطر على رطبات قبل أن يصلي ، فإن لم تكن رطبات فعلى تمرات ، فإن لم تكن حسا حسوات من ماء** " (أبوداؤد ، باب مايفطر عليه ،حدیث نمبر:۶۵۳۲)

چوں کہ عبادت میں معاون و مددگار بننا کارِثواب ہے اور مسلمانوں سے یہ مطلوب ہے؛ اس لئے آپ ﷺ نے افطار کرانے کی بھی فضیلت بیان فرمائی، آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو کسی روزہ دار کو افطار کرائے ، اس روزہ دار کے اجر میں کمی کے بغیر افطار کرانے والے کو بھی روزہ رکھنے والے کے برابر اجر حاصل ہوگا:

" **من فطر صائما كان له مثل أجره ، غير أنه لا ينقص من أجر الصائم شيئا** " (سنن أبو داؤد ، کتاب الصیام ، باب ما جاء فی

فضل من فطر صائما ،حدیث نمبر:۸۰۷)

اس لئے بحمد اللہ مسلمانوں میں دعوت افطار کا ایک عمومی ذوق پایا جاتا ہے اور لوگ اپنی اپنی صلاحیت اور استطاعت کے مطابق اس کا اہتمام بھی کرتے ہیں، مگر اس سلسلہ میں چند باتیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ دعوت افطار اصل میں مسلمانوں کے لئے ہے؛ کیوں کہ افطار روزہ کا اختتام ہے اور روزہ مسلمان رکھتے ہیں، نیز افطار ایک عبادت ہے اور عبادت مسلمانوں کی معتبر ہے، نہ کہ غیر مسلموں کی؛ کیوں کہ عبادت کی بنیاد اللہ تعالیٰ سے تعلق اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع پر ہے، اور ظاہر ہے کہ اللہ سے صحیح تعلق اور سنت کی اتباع کا اسلام کے بغیر تصور نہیں کیا جاسکتا؛ لہذا دعوت افطار کے مدعووین بھی اصل میں مسلمان ہونے چاہئیں، ہاں، اگر غیر مسلم بھائیوں کو بھی افطاری کھانے پر مدعو کرلیا جائے تو اس میں حرج نہیں؛ کیوں کہ غیر مسلموں کو مدعو کرنا اور ان کی مہمان نوازی نہ صرف جائز؛ بلکہ مستحب اور لائق اجر وثواب ہے، خاص کر اگر انہیں دعوتی مقصد کے تحت مدعو کیا جائے، اس موقع پر ان کے سامنے اسلام کا تعارف کرایا جائے، اسلامی تعلیمات پیش کی جائیں، روزہ کی حقیقت ان پر واضح کی جائے اور اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں دور کی جائیں تو انشاء اللہ اس میں دوہرا ثواب ہے، انفاق کا بھی اور دعوت دین کا بھی، رسول اللہ ﷺ کو ابتدائی مرحلہ میں جب اپنے خاندان کے سامنے دعوت اسلام پیش کرنے کا حکم دیا گیا تو آپ ﷺ نے دوبار بنی ہاشم کے لئے کھانے کا اہتمام فرمایا اور کھانا کھلانے کے بعد ان کے سامنے دین کی دعوت رکھی، پس دعوتی مقصد کے لئے کھانے پر مدعو کرنا عین سنت رسول ہے۔

افسوس کہ آج کل اکثر افطار پارٹیاں عبادت کی روح سے خالی ہوتی جارہی ہیں، خاص کر مسلمان اور غیر مسلم وزراء اور قائدین کی طرف سے دعوتوں کا جو اہتمام ہوتا ہے، ان کی نوعیت بھی سیاسی ہوتی جارہی ہے، ہر شخص کی توجہ تقریب کے مہمانان خصوصی کی طرف ہوتی ہے، بڑی تعداد ان کے حواشی کی ہوتی ہے، جن کی حرکتوں سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی خوشنودی کے بجائے کچھ شخصیتوں کی خوشنودی حاصل کرنے یہاں پہنچے ہیں، نہ ذکر نہ استغفار، نہ دعاء نہ اللہ کی طرف انابت، نہ اخلاص نہ خشیت، سب سے مضحکہ خیز کیفیت ان لوگوں کی ہوتی ہے، جو کیمرہ کی قید میں

آنے اور اخبار کی سرخی بننے کو بے قرار ہوتے ہیں، کاش، وہ دنیا کے اخبار میں چھپنے کے بجائے اللہ کے رجسٹر میں اپنا نام لکھالیں، لوگوں کو خوش کرنے کے بجائے اللہ کی خوشنودی کے لئے دعوت افطار کا اہتمام کریں اور کم سے کم روزہ جیسی عبادت کو دنیا طلبی اور غیر اللہ کی رضا جوئی کے ناپاک جذبہ سے آلودہ نہ ہونے دیں!

دوسری بات یہ ہے کہ اس دعوت میں غریب مسلمان نظر انداز نہ ہو جائیں، شریعت کا مزاج یہ ہے کہ ایسے مواقع پر غرباء ومساکین کو فراموش نہ کیا جائے؛ اسی لئے اسلام میں عیدالفطر کے ساتھ صدقۃ الفطر رکھا گیا؛ تاکہ خوشی کے اس موقع پر سماج کے غریب ونادار افراد کے گھروں میں بھی خوشی کے چراغ جل سکیں، عیدالاضحیٰ میں قربانی واجب قرار دی گئی اور قربانی کے تین حصوں میں ایک غرباء کے لئے مخصوص کیا گیا اور ایک رشتہ داروں کے لئے رکھا گیا، جن میں غرباء ومحتاج رشتہ دار بھی شامل ہیں، نیز ولیمہ میں غریبوں کو شریک رکھنے کی تلقین کی گئی اور جس میں غرباء کی شرکت نہ ہو، رسول اللہ ﷺ نے اسے بدترین ولیمہ قرار دیا:

" شر الطعام طعام الوليمة يدعى لها الأغنياء ويترك الفقراء ، إلخ "(صحيح البخاري ، كتاب النكاح ، باب من ترك الدعوة فقد عصى الله ورسوله ، حدیث نمبر: ۵۱۷۷، سنن الدارمي ، كتاب الأطعمة ، باب ما جاء في الوليمة ، حدیث نمبر: ۲۰٦٦)

عقیقہ بھی قربانی ہی کی ایک قسم ہے، یہ گویا اس بات کا اشارہ ہے کہ عقیقہ کے گوشت کی تقسیم یا دعوت میں بھی یہی تناسب ملحوظ ہونا چاہئے، افطار پارٹیوں میں اس وقت ایک رجحان صرف اہل ثروت اور سماج کے مشاہیر کو بلانے کا پیدا ہو رہا ہے، ایسے حضرات کو بلانا یقیناً ناجائز یا مکروہ نہیں ہے؛ لیکن صرف انہیں پر اکتفا کر لینا اور سماج کے محتاج ونادار حضرات کو نظر انداز کر دینا یقیناً اسلام کی بنیادی فکر کے مغائر ہے اور ایسی تقریبات دین کی روح کے خلاف ہیں؛ بلکہ قربانی کے گوشت کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کی ہدایت سے استفادہ کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ایسی تقریبات کے کم سے کم ایک تہائی مدعووین فقراء میں سے ہونے چاہئیں۔

تیسری اور سب سے زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ دعوت افطار میں بہرحال عبادت کا

رنگ باقی رہنا چاہئے ، افطار سے کچھ پہلے انفرادی طور پر لوگ ذکر و تسبیح میں مشغول رہیں ، درود شریف پڑھنے کا اہتمام کریں ،قرآن مجید کی تلاوت کریں ، یا دینی باتوں کا مذاکرہ ہو ، خاص کر دعاء کریں ؛ کیوں کہ یہ دعاء کی مقبولیت کے اوقات میں سے ہے ، دعاء کے ساتھ افطار کیا جائے ، توجہ اللہ کی طرف ہو نہ کہ خلق اللہ کی طرف ، توجہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھیرنے والا ماحول نہ بننے دیا جائے ۔

۲۶/ستمبر ۲۰۰۸ء

غزہ کا مقتل اور مسلمان

مجھے تاریخ دانی کا دعویٰ نہیں ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر میرا مطالعہ بہت حقیر اور معمولی ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص مجھ سے پوچھے کہ بیسویں صدی میں مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ نقصان دہ واقعات کیا پیش آئے، تو شاید میں دو واقعات کا ذکر کروں گا، ایک خلافت عثمانیہ کا سقوط، دوسرے عراق و کویت کی جنگ اور اس کے نتیجہ میں جزیرۃ العرب میں امریکی اور مغربی افواج کی آمد، —— خلافت عثمانیہ کا خاتمہ مغربی طاقتوں کی نہایت منصوبہ بند اور سوچی سمجھی سازش تھی، جس کا مقصد مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا، ان کے درمیان علاقائی اور نسلی بنیادوں پر نفرت پیدا کرنا اور عالمِ اسلام کو چھوٹی چھوٹی غیر مؤثر، اپنی مدافعت سے عاجز اور ایک دوسرے سے خلش اور کدورت رکھنے والی ٹکڑیوں میں بانٹ دینا تھا اور مغربی طاقتوں نے ان مقاصد کو بدرجۂ کمال وتمام حاصل کرلیا ہے، انہوں نے خلیج میں ایسے چھوٹے چھوٹے ملک بنائے، جن کی حیثیت حقیقت میں ایک بڑے شہر سے زیادہ نہیں اور استعماری طاقتوں نے اس بات کا بھی خاص اہتمام کیا کہ ان ملکوں کی تشکیل کرتے ہوئے ان کے درمیان سرحدی اختلافات کو برقرار رکھا جائے؛ چنانچہ اس کا نتیجہ ہے کہ آج عراق وکویت کے درمیان، کویت اور سعودی عرب کے درمیان، قطر اور سعودی عرب، نیز قطر اور بحرین کے درمیان، سعودی عرب اور یمن کے درمیان، مصر وشام اور مصر وسوڈان کے درمیان، اسی طرح اردن اور فلسطین کے درمیان باہمی کدورتیں موجود ہیں اور ان کے دل پارہ پارہ ہیں، عالم اسلام اور عالمِ عرب کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۹۴۸ء میں قطعاً غیر منصفانہ طریقہ پر ''اسرائیل'' کو وجود میں لایا گیا، عربوں نے خلافت عثمانیہ کو ختم کرنے میں جس جوش وخروش کا مظاہرہ کیا تھا، یہ ان کی پہلی سزا تھی، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ملی۔

رسول اللہ ﷺ نے ہدایت فرمادی تھی کہ جزیرۃ العرب میں دو قبیلوں یعنی دو مذاہب کا وجود

گوارہ نہیں کیا جاسکتا؛(مؤطأ مالك ، كتاب الجامع ، باب ما جاء في اجلاء اليهود من المدينة ، حدیث نمبر:۱۵۸۴) کیوں کہ یہ اسلام کا دار الخلافہ ہے اور اس کا تقاضہ ہے کہ یہاں توحید کے علاوہ کسی اور مذہبی تصور کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں عملی طور پر رسول اللہ ﷺ کی اس خواہش کو پورا فرمایا اور جزیرۃ العرب میں یہود ونصاریٰ اور مشرکین کی کوئی آبادی باقی نہیں رہی؛ البتہ انہیں دوسرے علاقوں میں تمام انسانی حقوق اور مذہبی آزادی کے ساتھ بسنے کی اجازت دی گئی، اس کے بعد غالباً کویت عراق جنگ کے موقعہ سے پہلی بار باضابطہ یہودی اور نصرانی فوجیں اس علاقہ میں اتریں اور جو علاقے پٹرول کی دولت سے مالا مال تھے، یعنی سعودی عرب کے مشرقی علاقہ سے لے کر کویت تک ، وہاں انہوں نے اپنا پڑاؤ ڈالا ، آج بھی قطر، کویت ، متحدہ عرب امارات میں معلنہ طور پر اور سعودی عرب میں غیر معلنہ طور پر امریکی فوجی تنصیبات موجود ہیں اور امریکہ کے بحری بیڑے اس کے علاوہ ہیں، اس واقعہ کا نقصان یہ ہوا کہ نہ صرف عالم اسلام کے بہترین قدرتی وسائل ؛ بلکہ ان کے مقدس مقامات کے قریب تک یہود ونصاریٰ کی رسائی ہوگئی ، اس واقعہ نے عربوں کو مجبور بلکہ اگر کہا جائے کہ اپاہج بنادیا، تو اس میں کوئی زیادتی نہیں ہوگی ، پہلے کم سے کم عرب ممالک اسلامی رشتہ سے کم اور عربیت کے رشتہ سے زیادہ کسی عرب ملک پر ہونے والی زیادتی کے خلاف زبان کھولنے اور ان کی مالی اعانت کرنے کی جرأت کرتے تھے، بعض دفعہ مغربی طاقتوں کو آنکھیں دکھانے کی بھی ہمت کر لیتے تھے، جیسا کہ شاہ فیصل شہیدؒ نے پٹرول روک کر کیا تھا؛ لیکن اب صورت حال یہ ہوگئی کہ وہ جو کچھ چاہیں ، بول بھی نہیں سکتے ، عرب لیگ کے اجلاس میں امریکہ کی اجازت کے بغیر شریک نہیں ہوسکتے ، او آئی سی (oic) کے اجلاس میں بھی بعض اوقات امریکی نمائندہ مدعو کیا جاتا ہے اور تجاویز منظور کرنے میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ مبادا کوئی ایسا لفظ زبان وقلم سے نہ نکل جائے ، جس سے جبینِ یار پر شکن آسکتی ہو، وہ کسی ادارہ، کسی تنظیم، کسی ملک کی اپنی مرضی سے مدد نہیں کرسکتے ہیں ، یہاں تک کہ اب تو ''قنوت نازلہ'' پڑھنے میں بھی احتیاط برتی جاتی ہے اور پڑھی جائے ، تو اس میں یہود ونصاریٰ اور امریکہ واسرائیل کا نام لینے سے ضرور ہی گریز کیا جاتا ہے، اب تو حرمین شریفین بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہا، گویا ہم اللہ سے مانگنے میں بھی مغرب کی اجازت کے محتاج ہیں۔

اس صورت حال نے اسرائیل کے حوصلے بڑھا دیئے ہیں، اب ان مالدار ترین علاقوں میں اسرائیلی اور یہودی کمپنیوں کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں رہی، اب وہ اسرائیل کے نیوکلیر پروگرام کے بارے میں کوئی سوال نہیں اٹھا سکتے، اب اسرائیل کسی ملک پر میزائیل پھینکے، تو عربوں کا فریضہ ہے کہ وہ اس کا ''استقبال'' کریں، اسی حوصلہ مندی کا اظہار پہلے ''حزب اللہ'' پر حملہ کے ذریعہ ہوا اور اس سلسلہ میں حزب اللہ کی تعریف کی جانی چاہئے کہ انہوں نے اسرائیل کو ناکوں چنے چبوا دیئے اور صہیونیوں کو کھلے طور پر اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑا، اب دوبارہ یہی تجربہ اسرائیل نے غزہ میں حماس کے ساتھ کیا، جس میں اب تک بارہ سو سے زیادہ مسلمان شہید ہو چکے ہیں، جن میں بڑی تعداد خواتین اور کم عمر بچوں کی ہے، بہت بڑی تعداد زخمیوں کی ہے، جو علاج کی سہولت سے بھی محروم ہیں اور جو مکانات منہدم ہوئے ہیں، وہ بے شمار ہیں، اس تباہی و بربادی کے باوجود ''سلامتی کونسل'' اسرائیل کے خلاف کوئی سخت تجویز منظور نہیں کر سکی اور امریکہ تو نہایت ڈھٹائی سے اس کو منصفانہ کاروائی قرار دیتا رہا، عرب ملکوں کو امریکہ کے اس بیان پر زبانی تنقید کرنے کا بھی حوصلہ نہیں ہوا، یہاں تک کہ عرب لیگ کے اجلاس میں بعض ممالک نے شرکت سے گریز گیا، نیز مصر اور محمود عباس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں حماس کو قصور وار بھی ٹھہرایا۔

واقعہ ہے کہ یہ مسلمانوں پر اللہ کے عذاب سے کم نہیں، جو بہترین قدرتی وسائل، دنیا میں سب سے زیادہ افرادی وسائل، نہایت اہم آبی گذرگاہوں پر کنٹرول کے باوجود اس طرح رہنے پر مجبور ہیں کہ مار کھائیں اور تڑپنے کی بھی کوشش نہ کریں، یہ دولت مند ممالک سونے کے پنجرے ہیں، جن میں انہیں بند کر دیا گیا ہے اور— ہزار بار خدانخواستہ — اپنی باریوں کے منتظر ہیں، ہائے یہ بزدلی! اور آہ یہ محرومی و بے بسی!! —— یہ دراصل ایمان کی طاقت سے محروم ہونے اور اسلامی اخوت کے جذبہ سے خالی و عاری ہونے کا نتیجہ ہے اور اس کا انجام ذلت و رسوائی کے ساتھ شکست کے علاوہ اور کچھ نہیں، افسوس ان آنکھوں پر ہے، جو نوشتۂ دیوار پڑھنے سے بھی عاجز ہیں اور جو ان حقیقتوں کو بھی دیکھنے سے عاجز ہیں، جنہیں شاید اندھے بھی دیکھنے سے محروم نہ ہوں اور جس کے انجام کی ہولناکی شاید بہروں کو بھی سماعت سے ہم کنار کر دے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس پوری امت کو ایک جسم بنا دیا تھا، ایسا جسد واحد، جو ایک دوسرے

کے بغیر نامکمل ہو، ایسے مربوط کہ ہاتھ کی انگلیاں ہی نہیں؛ بلکہ ناخنوں کے کاٹے جانے کی تکلیف بھی دوسرے حصہ کو بے چین کردے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان آپسی محبت، رحم دلی اور ایک دوسرے کا پاس ولحاظ رکھنے میں ایک جسم کی طرح ہیں کہ اگر ایک عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم تڑپ اٹھتا ہے اور وہ بے خوابی اور بخار سے دوچار ہو جاتا ہے، (بخاری عن نعمان بن بشیر ؓ، حدیث نمبر:۶۰۱۱) ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے مسلمانوں کی قوت وضعف کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ باہم ایک عمارت کی طرح ہیں، جیسے عمارت کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو طاقت پہونچاتا ہے، اسی طرح یہ ایک دوسرے کے لئے طاقت کا ذریعہ ہیں، پھر آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں میں ایک دوسرے کو داخل کرتے ہوئے مزید تاکید کے ساتھ اسے سمجھایا، (بخاری عن ابی موسی اشعری ؓ، حدیث نمبر:۶۰۲۶) —— اگر کسی جسم کا کوئی عضو مفلوج ہو جائے اور وہ دوسرے اعضاء کی تکلیف کو محسوس نہیں کرے، اگر کسی عمارت کا ایک حصہ پوری عمارت کا ساتھ چھوڑ دے، تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ جسم کتنا مجبور اور وہ عمارت کتنی کمزور ہوگی، یہی کمزوری ہے، جو آج اس امت کے وجود میں گھُن کی طرح لگ چکی ہے۔

مسلمانوں کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں یا کسی اور پر ظلم سے صرف اپنا دامن بچائے رکھیں ؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی طاقت بھر پر ظلم ہونے کو برداشت نہیں کریں اور مظلوموں کی مدد کریں؛ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے چھوڑ دیتا ہے، یعنی اگر کسی مسلمان پر ظلم ہوتا ہوا دیکھتا ہے، تو اس سے آنکھیں نہیں موند لیتا: ''**المسلم أخو المسلم ، لا یظلمه ولا یسلمه**'' (بخاری: عن عبداللہ بن عمر ؓ، حدیث نمبر:۲۴۴۲) —— حضرت سہل بن حنیف ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے سامنے کسی بندۂ مؤمن کو رسوا کیا جائے اور وہ مدد کرنے پر قادر ہونے کے باوجود اس کی کوئی مدد نہ کرے، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو تمام مخلوقات کے سامنے رسوا فرمائیں گے، (مسند احمد:۳/۴۸۷) —— یہ روایت یوں تو ہر مسلمان کے لئے تازیانۂ عبرت ہے؛ لیکن مسلمان حکمرانوں کو تو خاص طور پر اس کو اپنے لئے آئینہ بنانا چاہئے کہ دوسرے مسلمانوں کی مظلومیت پر خاموش رہنا دراصل اپنی باری کا انتظار کرنا اور خود اپنے لئے اسی انجام کی دعوت دینا ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو کسی مسلمان سے اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے، اللہ اس کی مصیبت کو دور فرماتے ہیں: ''**من أقال مسلما أقاله اللّٰه عثرته**'' (ابوداؤد، عن ابی ہریرہؓ، حدیث نمبر: ۳۴۶۰) —— یہ مضمون الفاظ کے فرق کے ساتھ کئی حدیثوں میں آیا ہے، (دیکھئے: بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۴۲، مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۰) —— ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کسی مسلمان کی ضرورت میں کام آنا مجھے اپنی اس مسجد — یعنی مسجد نبوی — میں اعتکاف کرنے سے زیادہ محبوب ہے، (طبرانی کبیر، عن ابن عمرؓ: ۱۲/۴۵۳) —— حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ کسی شخص کا کسی مسلمان کی ضرورت میں جانا اس کے لئے دس سال کے اعتکاف سے بڑھ کر ہے: ''**من مشى فى حاجة أخيه ، كان خيرا له من إعتكاف عشر سنين**'' (الترغيب والترهيب: ۳/۳۹۱)۔

افسوس کہ ہم رسول اللہ ﷺ سے محبت اور عشق کے نعرے تو خوب لگاتے ہیں؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کی یہ زریں نصیحتیں اور یہ دردمندانہ ارشادات ہمارے اسی دعویٔ محبت کے لئے امتحان ہیں، جنہیں ہم نے پس پشت ڈال رکھا ہے، ہم اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں، مسلم ملک میں ہوں یا غیر مسلم ملک میں، ہمارے دل آپس میں ٹوٹے ہوئے اور ہمارے سینے ایک دوسرے کے خلاف کدورتوں سے معمور ہیں، نسل ونسب کی بنیاد پر جھگڑے، علاقۂ ووطن کے نام پر تفریق، لسانی اختلاف کی بنیاد پر ایک دوسرے کی مخالفت، تنظیمی اور جماعتی وابستگیوں کی وجہ سے ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرائی ہمارا طرۂ امتیاز بنا ہوا ہے، یہاں تک کہ خالص دینی نسبتوں ---- جیسے کسی درسگاہ سے کسب فیض کا تعلق، کسی خانقاہ اور اس کے شیخ سے اصلاحی وابستگی ---- کو بھی ہم نے ایک دوسرے کی تحقیر، باہمی منافست اور بعض دفعہ اس سے آگے بڑھ کر توہین و بے توقیری کا ذریعہ بنالیا ہے۔

اگر مسلم ممالک اور خاص کر عرب ممالک کم سے کم اتنا ہی کرتے کہ تمام یہودی اور اسرائیلی کمپنیوں کا بائیکاٹ کردیتے، جن مسلم ملکوں کے اسرائیل سے سفارتی تعلقات ہیں، وہ اپنے تعلقات منقطع کرلیتے اور واضح طور پر امریکہ اور مغربی طاقتوں کے خلاف اپنا احتجاج نوٹ کراتے، تو اسرائیل اور اس کی پشت پناہی کرنے والوں کو فلسطینیوں پر ستم ڈھانے سے پہلے سو بار سوچنا پڑتا؛

لیکن ایسا نہیں ہوا، جب مسلم ممالک خود اپنے سفارتی تعلقات اسرائیل سے توڑنا نہیں چاہتے تو غیر مسلم ملکوں سے کیوں کر اس کی توقع کی جاسکتی ہے؟ کاش عالمِ اسلام کے سربراہان وینیز ولا سے عبرت حاصل کریں، جس نے محض انصاف اور انسانی کرامت کی بنیاد پر اسرائیل سے سفارتی تعلقات منقطع کر لئے۔

ہندوستان کے مسلمان یقیناً تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں کہ غزہ میں ہونے والی خون آشامی کے موقعہ پر انہوں نے پوری قوت کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کی اور بجا طور پر حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اسرائیل سے اپنے سفارتی تعلقات توڑ لے؛ کیوں کہ ہندوستان غیر جانب دار تحریک کے بانیوں میں سے ہے، اس کے معاشی اور عالمی سطح پر اخلاقی مفادات عربوں سے وابستہ ہیں، نہ کہ اسرائیل سے، مگر افسوس کہ ہماری موجودہ حکومت اسرائیل نوازی میں اتنی دور جا چکی ہے کہ فلسطینیوں کا خون اسے نظر نہیں آتا اور معصوم بچوں اور خواتین کی آہیں اس کے دل پر دستک دینے سے قاصر ہیں، مسلمانوں کو دوسرے انصاف پسند برادرانِ وطن کو ساتھ لے کر حکومت پر اپنا دباؤ قائم رکھنا چاہئے؛ کیوں کہ اسرائیل سے تعلق کا اثر براہ راست ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی پڑسکتا ہے؛ بلکہ پڑ رہا ہے، اور اس وقت ہندستان میں اقلیتوں کے خلاف جو ریاستی دہشت گردی ہو رہی ہے، اس میں اسرائیل کے دخیل ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مگر اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ہمارا اتحاد صرف کسی دشمن کے حملہ کے وقت سامنے نہ آئے؛ بلکہ ہم تمام مسائل میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر اور ایک دوسرے کے ساتھ قدم ملا کر آگے بڑھیں اور تفریق وانتشار کے لئے کی جانے والی ہر سازش کو ناکام و نامراد کر دیں، ایمان اور اتحاد ہی ہماری اصل طاقت ہے اور اس وقت ہمارے ملک کے حالات بھی اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہم اپنی صفوں میں وحدت کو باقی رکھیں، ورنہ گجرات کا قتل عام بھی، —— جس میں دو ہزار مسلمان شہید ہوئے، —— غزہ سے کچھ کم بڑی مصیبت نہیں تھی اور یہ مقتل بھی اسی ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ سجایا گیا تھا، جسے اسرائیل کر رہا ہے اور کرتا رہا ہے۔

۲۳/جنوری ۲۰۰۹ء

شمالی مشرقی ریاستوں کے حالات

عبرت وموعظت کے چند پہلو

ہندوستان کے شمالی مشرقی علاقہ میں مسلمانوں کی بہت بڑی آبادی ہے، ایک زمانہ میں بنگلہ دیش بھی اس میں شامل تھا اور مغلوں کے دور میں برما تک مسلم ریاست کا دائرہ وسیع تھا، وہاں بھی اراکان اور بعض دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے، جو اس وقت ناقابل بیان ظلم وجور سے گذر رہے ہیں، خود موجودہ ہندوستان میں سات ریاستیں —— آسام، منی پور، میزورم، ناگالینڈ، میگھالیہ، تریپورہ اور اروناچل پردیش —— سات ستارے کہلاتے ہیں، ان میں سے بعض ریاستوں میں قبائیلیوں کا غلبہ ہے، جو مورتی پوجا نہیں کرتے اور کسی خاص مذہب سے ان کا تعلق نہیں، ان میں سے متعدد ریاستیں عیسائی اکثریت ریاستیں بن گئی ہیں، یہ یقیناً عیسائی مشنریز کی تعلیمی کاوشوں اور خدمتِ خلق کے سلسلہ میں ان کی انتھک محنتوں کا ثمرہ ہے، یہ ریاستیں عام طور پر رقبہ اور اس سے بھی زیادہ آبادی کے لحاظ سے چھوٹی واقع ہوئی ہیں؛ چنانچہ کہیں ایک اور کہیں دو پارلیمانی نشستیں ہیں؛ البتہ ان میں آسام سب سے بڑا صوبہ ہے، جہاں سے سولہ ارکانِ پالیمنٹ منتخب ہوتے ہیں، مسلم آبادی کے لحاظ سے یہ علاقہ بڑی اہمیت کا حامل ہے؛ کیوں کہ یہاں گورنمنٹ کے اعداد وشمار کے مطابق بھی مسلم آبادی کا تناسب 31% ہے اور حقیقی تعداد 35 سے 40 فیصد تک بتائی جاتی ہے۔

راقم الحروف کو 'امارت شرعیہ شمالی مشرقی ہند' کی دعوت پر ۱۴-۱۵ فروری کو اس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کا موقع ملا اور اس طرح پہلی بار اپنے ان بہت سے مسلمان بھائیوں سے ملاقات کی صورت پیدا ہوئی، جن کو دیکھا تو بالکل نہیں تھا اور ان کے بارے میں سنا بھی بہت کم تھا؛ چنانچہ وہاں کے حالات کو دیکھ کر کئی ایسی باتیں سامنے آئیں، جو پورے ملک کے مسلمانوں کے لئے قابل

توجہ ہیں:

پہلی بات تو وہاں کا نظام امارت ہے، مسلمانوں میں اس نظام کے بارے میں بے حد عقیدت اور محبت کے جذبات ہیں، حضرت مولانا عبدالجلیل چودھریؒ نے وہاں ۱۹۷۶ء میں امارت شرعیہ کی بنیاد رکھی، مولانا چودھری اصل میں سلہٹ نامی شہر کے رہنے والے تھے، جو موجودہ بنگلہ دیش میں واقع ہے، مولانا مرحوم تقسیم ہند و پاک کے مخالف تھے؛ بلکہ اس کی مخالفت کرنے والوں میں پیش پیش تھے؛ مگر ۱۹۴۷ء کے ریفرنڈم میں ان لوگوں کو غلبہ حاصل ہو گیا، جو تقسیم کے حامی تھے، مولانا تقسیم کے بعد بھی وہاں رکے رہے؛ لیکن مسلم لیگی حضرات مولانا کے خلاف سخت انتقامی جذبات رکھتے تھے؛ یہاں تک کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے، ان حالات میں ۱۹۵۰ء میں انہوں نے ہندوستان کا رخت سفر باندھا اور مشرقی پاکستان کی سرحد پر واقع ہندوستان کے مسلم اکثریتی قصبہ ''بدر پور'' میں خیمہ زن ہوئے، یہ اب ضلع کریم گنج کا ایک اہم تعلقہ ہے، یہ پورا ضلع تقسیم ملک سے پہلے ضلع سلہٹ کا حصہ ہوا کرتا تھا۔

مولانا مرحوم نے ہندوستان آکر پوری قوت کے ساتھ ہمہ جہت کوششیں شروع کیں، دار الحدیث بدر پور میں استاذ ہوئے اور اسے دورۂ حدیث شریف تک پہونچایا، کچھ عرصہ جمعیت علماء آسام کے جنرل سکریٹری بھی رہے، تقریباً تیس سال عوامی انتخاب کے ذریعہ اسمبلی میں پہونچے اور باوجود حکومتوں کے اصرار کے کبھی وزارت قبول نہیں کی، یہ مدرسہ جو پہلے سے سرکار سے ملحق تھا، اس کے لئے یہ بات طے کرائی کہ گورنمنٹ کی ساری سہولتیں باقی رہیں گی، مگر نصاب تعلیم اور نظامِ تربیت آزاد مدارس کا ہوگا، ۱۹۶۳ء میں آسام کے علماء کو لے کر تعلیمی جماعت قائم کی، ۱۹۷۶ء میں امارت شرعیہ شمالی مشرقی ہند قائم فرمائی اور پچاس ہزار ارباب حل وعقد کے اتفاقِ رائے سے امیر شریعت اول منتخب ہوئے، پھر ان کی وفات کے بعد دسمبر ۱۹۸۹ء میں امیر شریعت دوم کی حیثیت سے ان کے معاونِ خاص اور ممتاز عالم وفقیہ مولانا محمد طیب الرحمٰن صاحب کا انتخاب عمل میں آیا، جو عالم بھی ہیں اور ایم اے بھی، بلکہ پوری ریاست کی سطح پر گولڈ مڈل حاصل کر چکے ہیں، اب اِسی اٹھتر سالہ پیر جوان ہمت کی قیادت میں مسلمانوں کا یہ کارواں آگے بڑھ رہا ہے، ان کا تواضع، ان کی سادگی، ان کا عالمانہ وقار اور داعیانہ کردار نیز مشرقی ہند کے مسلمانوں میں ان کی بے پناہ مقبولیت،

یہ ساری باتیں مذہبی قائدین کے لئے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تحریک امارت کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کے اس سالانہ اجلاس میں تقریباً ایک لاکھ شرکاء موجود تھے، جن میں بہت سے وفود چھ سو، سات سو کیلومیٹر سے آئے تھے، باوجودیکہ جلسہ کے پوسٹر اور پروگرام میں کسی وزیر یا سیاسی قائد کا باضابطہ نام نہیں رکھا گیا تھا؛ لیکن نصف درجن سے زیادہ ریاستی وزراء، ایم پی، ایم ایل اے کے علاوہ متعدد سابق وزراء نیز صوبہ کے بڑے سیاسی قائدین شرکت کے لئے آئے تھے، میں نے دیکھا کہ مولانا موصوف کسی وزیر کبیر کے احترام میں نہ کھڑے ہوئے، نہ استقبال کیا اور نہ باضابطہ رخصت کیا؛ بلکہ ہر آنے والا اپنے سر پر ان کا ہاتھ رکھتا اور بڑی عقیدت کے ساتھ بیٹھ جاتا، ان وزراء میں ایک وہ بھی تھے، جن کو موجودہ چیف منسٹر کا دست راست کہا جاتا ہے، ان میں سے ایک وزیر نے دارالحدیث بدر پور کے لئے چودہ لاکھ روپے کا، ایک نے امارت شرعیہ آسام کے لئے گوہاٹی میں دس ایکڑ زمین کا اور بدر پور میں مولانا عبدالجلیل چودھری ہاسپٹل کا نیز مسلمانانِ آسام کے لئے مختلف رعایتوں کا اعلان کیا؛ لیکن مولانا کمالِ استغناء کے ساتھ یہ اعلانات سنتے اور خاموش رہتے۔

ہم لوگ امارت شرعیہ کے دفتر سے ہزاروں افراد کی دورویہ لائن کے درمیان لے جائے گئے، جلسہ گاہ پہونچنے کے بعد امارت شرعیہ اور جامعہ کا جھنڈا لہرایا گیا اور دعاء اور نماز ظہر کے بعد پروگرام کا باضابطہ آغاز ہوگیا، جو اگلے دن صبح سات بجے تک بلا وقفہ جاری رہا، اس درمیان نصف شب پر ختم بخاری کے وقت جب مولانا محترم نے دعاء کے لئے ہاتھ اٹھایا اور رقت انگیز دعاء فرمائی، تو پورے مجمع پر آہ و بکا کا عجیب منظر تھا، شاید کوئی آنکھ ہو، جو اشک بار نہ ہوئی ہو، فجر کی نماز تک اور اس کے بعد بھی نصف کیلومیٹر سے زیادہ تک پھیلا ہوا پورا مجمع گوش برآواز تھا۔

اس سفر سے میں نے جو سبق حاصل کیا، ان میں پہلی بات وہ تھی، جس کا اوپر ذکر آیا کہ موجودہ حالات میں علماء کو سیاسی قوتوں پر اثر انداز بھی ہونا چاہئے اور اس سے استغناء اور بے نیازی کا رنگ بھی ہونا چاہئے؛ کیوں کہ بقول دمشق کے ایک محدث کے ''پاؤں وہی پھیلا سکتا ہے، جو ہاتھ پھیلانا نہ جانتا ہو''، یہ بے نیازی عوام میں علماء کے وقار و اعتبار کو بڑھاتی ہے اور جب عوام کسی عالم سے مربوط ہوتے ہیں تو ارباب اقتدار بھی اس کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس

طرح امت کے مسائل بھی حل ہوتے ہیں اور برادرانِ وطن پر مسلمان مذہبی شخصیوں کا اخلاقی وزن بھی باقی رہتا ہے۔

دوسری بات جو قابل توجہ نظر آئی، وہ یہ ہے کہ امارت شرعیہ ان صوبوں میں پانچ ہزار کے قریب دینی مکاتب چلاتی ہے، ان مکاتب کے سلسلہ میں عوام کا مزاج یہ بنایا گیا ہے کہ امارت معلم فراہم کرے گی اور مقامی لوگ معلم کے لئے مناسب تنخواہ کا انتظام کریں گے؛ چنانچہ عام طور پر طلبہ وطالبات ان مکاتب میں پڑھ کر اسکولوں میں جاتے ہیں، اس کی وجہ سے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر پہونچنے والے مسلمان سرکاری آفیسروں کے مزاج میں بھی تدین ہوتا ہے، خود اس اجلاس میں بھی جہاں کئی ہزار علماء شریک تھے، وہیں ایک اچھی خاصی تعداد جدید تعلیم یافتہ حضرات کی بھی تھی، جن کو دیکھ کر کسی دینی درس گاہ کے فاضل کا تصور ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ عیسائی مشنریز کی انتھک کوششوں کے باوجود اس علاقہ میں مسلمانوں میں ارتداد کا فتنہ پیدا نہیں ہوسکا، ضرورت ہے کہ آسام و گجرات کی طرح ملک کے تمام علاقوں میں مسلمان نہ صرف مکاتب کا نظام قائم کریں؛ بلکہ عام مسلمانوں میں بھی مزاج بنائیں کہ وہ خود اس کے اخراجات کو پورا کریں۔

تیسری قابلِ تقلید چیز وہاں کا نظام دارالقضاء ہے، ابھی ۲۰۰۳ء کی روداد میرے سامنے ہے، اُس وقت تک وہاں ایک سو پچاس دارالقضاء قائم تھے، جن میں دوسو پچاس قضاۃ اوران کے نائبین قضاء کی خدمت انجام دے رہے تھے، دارالقضاء کے نظام کو وسعت دینے کے لئے اب تک وہاں دس تربیتی پروگرام منعقد ہوچکے ہیں، چنانچہ آسام میں انہوں نے ہر تعلقہ اور ضلع کی سطح پر دارالقضاء کا نظام قائم کیا ہے، جس میں مسلمانوں کے مقدمات فیصل ہوتے ہیں، نیز ہر سطح پر اپیل کا بھی نظم کیا گیا ہے، اور آخری اپیل خود امیر شریعت کی عدالت میں ہوتی ہے، اگر پورے ملک میں اس طرح مسلمانوں کا اپنا عدالتی نظام قائم ہوجائے، تو یقیناً وہ سرکاری عدالتوں کی سرگرانی، پیسے کا ضیاع، نیز وہاں جاکر جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے دین ضائع کرنے سے بچ سکتے ہیں۔

چوتھی قابل توجہ چیز عوام میں دینی شعور کی بیداری کی منظّم کوشش ہے؛ چنانچہ امارت شرعیہ آسام کے تحت ایک سو اٹھانوے مقامات پر تفسیر قرآن کے حلقے منعقد ہوتے ہیں، جس میں علماء اور اساتذہ قرآن کا درس دیتے ہیں، اس کے علاوہ تعلیمی جماعتیں چوبیس گھنٹہ، تین دین اور دس دن

کے لئے نکلتی ہیں، یہ تبلیغی جماعتوں کے طرز پر مسجد کو بنیاد بنا کر محلے کے مسلمانوں کو جمع کرتے ہیں، انہیں نمازوں کے لئے ضروری حد تک قرآن مجید پڑھاتے ہیں اور وضوء، غسل، نماز اور معاملات کے ضروری احکام بیان کرتے ہیں، نیز لوگوں کے سوالات کے جوابات دیتے ہیں، ان کا دوسری جماعتوں اور تنظیموں سے کوئی ٹکراؤ بھی نہیں ہے، اس طرح علماء اور تبلیغی جماعت کے اشتراک سے بڑا اچھا کام ہو رہا ہے اور عام طور پر لوگوں میں تدین ہے۔

ان قابلِ تعریف باتوں کے ساتھ دو باتیں وہاں کے حالات کے پس منظر میں بڑی قابل توجہ بھی محسوس ہوئیں، جن کا وہاں اظہار بھی کیا گیا ایک یہ کہ قبائیلیوں اور آسام میں مورتی پوجا مخالف ہندوؤں کی موجودگی کی وجہ سے برادرانِ وطن میں دعوت دین کے وسیع مواقع موجود ہیں اور تھوڑی محنت سے بڑے نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں، جس کی مثال عیسائی مشنریز ہیں؛ لیکن اس طرف مسلمانوں کی توجہ نہ ہونے کے برابر ہے، اگر امارت شرعیہ آسام اور وہاں کی دوسری تنظیمیں اس کو اپنے ایجنڈے میں داخل کرلیں، تو یقیناً بڑا اہم کام انجام پاسکتا ہے اور مسلمان مستقبل قریب میں صوبہ میں اکثریتی موقف اختیار کر سکتے ہیں، مگر افسوس کہ یہ اصل کام ہی —— جس کے لئے اس امت کو ’’خیر امت‘‘ بنایا گیا، —— امت کی توجہ سے محروم ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان ریاستوں میں عیسائی مشنریز نے تعلیم گاہوں اور خدمت خلق کے اداروں کے جال بچھا رکھے ہیں، مسلمانوں کی آبادیوں کے درمیان بھی مشنریز اسکول اور بلند قامت چرچ کی عمارتیں کثرت سے نظر آتی ہیں اور ظاہر ہے کہ مسلمان طلبہ وطالبات بھی بڑی تعداد میں ان ہی اسکولوں میں داخلہ لیتے ہیں؛ اس لئے وہاں شدید ضرورت مسلمانوں کے انگلش میڈیم اسکولوں کی ہے، جس میں تعلیم مشنریز اسکولوں کے معیار کی ہو اور ماحول اسلامی ہو، اس سلسلہ میں جماعت اسلامی اور مولانا بدرالدین اجمل نے کچھ مفید اور ثمر آور کوششیں کی ہیں، جو یقیناً قابلِ تحسین ہیں؛ لیکن وہ ضرورت کے اعتبار سے آٹے میں نمک کے درجہ میں ہے، کم عمر بچوں کے ذہن کی مثال سادہ تختی کی ہوتی ہے اور اس پر جو کچھ لکھ دیا جائے، وہ اکثر اوقات پتھر کی لکیر بن جاتی ہے، اگر ہم اپنے بچوں کو ان اسکولوں کے حوالے کرتے رہیں اور ان کا ذہن صحیح راستے سے منحرف ہو جائے تو ہمیں شکایت نہیں ہونی چاہئے؛ کیوں کہ یہ ہماری اپنی بے عملی کا نتیجہ ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ غیر مسلموں میں دعوتِ دین کے کام سے غفلت اور نئی نسل کے لئے اسلامی ماحول کے ساتھ جدید تعلیم کی فراہمی کی طرف سے بے توجہی ہندوستان میں کسی ایک علاقہ کا مسئلہ نہیں ہے؛ بلکہ ہر جگہ ہم اسی صورت حال سے دو چار ہیں؛ حالاں کہ دعوتِ دین سے غفلت اپنے مقصدِ وجود سے انحراف اور نئی نسل کی دینی تربیت کی طرف سے بے اعتنائی ان کے ایمان کو خطرہ میں ڈالنے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش ہے، کاش! کہ ہم اس حقیقت کو سمجھ سکیں اور منظّم طور پر اس کا تدارک کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں!!

۲۷/فروری ۲۰۰۹ء

ہم مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں ہنود

اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے ملک دنیا کی سب سے بڑی اور مستحکم جمہوریت ہے، جو ملک جمہوری ہوتا ہے، وہاں کی عوام کے مزاج میں بھی جمہوری فکر پروان چڑھتی ہے، جمہوریت کا مزاج یہ ہے کہ عوامی انتخاب سے سرکاریں بنیں، اور عوام کے فیصلہ کے سامنے قائدین سر جھکائیں، اس سے انسان کے اندر مخالف نقطۂ نظر کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اگر حزب اقتدار کے مقابلہ میں کوئی حزب اختلاف نہ ہو تو وہ نام نہاد جمہوریت تو ہوسکتی ہے حقیقی جمہوریت نہیں ہوسکتی، ہندوستان میں شروع سے اسی مزاج کے مطابق جمہوریت نے ترقی کی ہے، ملک کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے سخت ناقدین میں جنوبی ہند کے ایک رکن پارلیمینٹ غالباً اچاریہ اکریلا جی ہوا کرتے تھے، ایک بار وہ الیکشن میں شکست کھا گئے، تو نہرو جی نے ایک کانگریس ممبر کو استعفیٰ دلا کر دوبارہ انہیں منتخب کرایا؛ کیوں کہ اپوزیشن کے بغیر جمہوریت ناتمام ہوتی ہے، ابھی کچھ عرصہ پہلے جب بارک حسین اوباما امریکی صدر منتخب ہوئے، تو اپنی پارٹی میں ہلاری کلنٹن سے ان کا سخت مقابلہ رہا؛ لیکن بالآخر جب اوباما صدر منتخب ہو گئے تو انہوں نے ہلاری ہی کو اپنی وزیر خارجہ منتخب کیا۔

جب اختلاف کو برداشت کرنے کا مزاج پیدا ہوتا ہے، تو انسان مخالف نقطۂ نظر کے قائدین کا احترام بھی باقی رکھتا ہے؛ اس لئے آج کل جمہوری حکومتیں اپوزیشن لیڈر کو کابینی وزیر کا درجہ دیتی ہیں، مجھے یاد ہے کہ جب ہم لوگ طالب علمی کے آخری مرحلہ میں تھے، تو محترمہ اندرا گاندھی نے ایمرجنسی نافذ کی، ایمرجنسی اٹھانے کے بعد جب انہوں نے الیکشن کا اعلان کیا تو جناب جگ جیون رام علیحدہ ہو گئے اور انہوں نے ایک مستقل علیحدہ پارٹی قائم کر لی، الیکشن ہوا اور پہلی بار اندرا جی شکست فاش سے دوچار ہوئیں، یہاں تک کہ وہ اپنی سیٹ بھی نہیں بچا سکیں، جگ جیون رام

سے ایک پریس کانفرنس میں صحافیوں نے کچھ ایسے سوالات کئے جس میں اندرا جی پر تیز ریمارک تھے، جگ جیون رام نے اس پر خوش ہونے کے بجائے کہا: ''اندرا جی بہر حال ملک کی اور ہماری ایک قابل احترام لیڈر ہیں، اور اس ملک کے لئے اس کی بیش بہا خدمات ہیں''، یہ رویہ اور یہ الفاظ ان لوگوں کے ہیں، جو ایمان سے محروم اور آخرت کے یقین سے عاری ہیں، مسلمان جو خیر امت ہیں، جو ایسے نبی کی امت ہیں، جو معلم اخلاق بنا کر بھیجے گئے، ان کا حال یہ ہے کہ گاؤں کے مکھیا سے لے کر ممبر پارلیمنٹ تک اگر دو مسلمانوں کا ایک دوسرے سے سامنا ہو جائے، تو اسٹیج پر سات پشتوں کا حساب چکایا جاتا ہے، اور ایک دوسرے کے خلاف، جھوٹ، بہتان تراشی اور اس کے لئے تلبیس، دھوکہ دہی غرض کہ سارے ناکردنی کئے جاتے ہیں، اور ہر ناگفتنی کہی جاتی ہے، مخالف امیدوار کے آباء واجداد کا ریکارڈ بھی تلاش کیا جاتا ہے، اور اس میں نمک مرچ ڈال کر نیز اسے چٹپٹا بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، بقول شاعر:

نہ کوئی شانہ بچا ہے نہ کوئی آئینہ
دراز گیسوئے یار دیکھو تو

اسٹیج پر ایسی بدزبانی اور فحش گوئی کی جاتی ہے کہ شریف اور غیرت مند لوگ اپنی خلوت میں بھی ایسی بات زبان پر لانے سے شرمائیں، مسلمانوں کی یہ حالت کسی ایک شہر اور ایک علاقہ میں نہیں ہے، بلکہ کم وبیش پورے ہندوستان میں ہے؛ اسی لئے روح اقبال سے معذرت کرتے ہوئے اقبال کے مصرع میں تھوڑی تبدیل کے ساتھ میں نے یہ عنوان قائم کیا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی قومیں کہتی ہیں کہ مسلمانوں میں جمہوریت اور اختلاف رائے کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، یہ قوم تشدد اور آمریت پر یقین رکھتی ہے، ہمیں سوچنا چاہئے کہ کہیں ہم اپنے عمل سے ایسے اعتراضات کی تصویریں تو نہیں کر رہے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے نفاق کی چار علامتیں بیان فرمائی ہیں: اول یہ کہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، دوسرے وعدہ کے بعد اس کی خلاف ورزی کرے، تیسرے باہمی معاہدات کو توڑ موڑ ڈالے''**إذا عاهد غدر**''، چوتھے: جب گفتگو کرے تو بدزبانی پر اتر آئے: ''**إذا خاصم فجر**'' (صحیح البخاری، عن عبد اللہ بن عمر ﷛، حدیث نمبر: ۳۱۷۸) آج ہماری انتخابی مہم نفاق کی ان تمام علامتوں کا مجموعہ ہوتی ہیں، الیکشن

مہم چلانے والے امیدوار جھوٹ اتنے بہتر طور پر بولتے ہیں کہ عام لوگ سچائی کو بھی اتنی طاقت سے بیان نہ کرسکیں، وعدہ خلافی اور معاہدہ شکنی سیاست میں کوئی چیز نہیں ہے، یہاں ایک اور معمولی عہدہ کے لئے سیکولر پارٹی کا نمائندہ بے تکلف فرقہ پرست تنظیم میں شامل ہوسکتا ہے، اور الیکشن کے وعدہ کو ہنسی مذاق سمجھتا ہے اور بدگوئی و بدزبانی اور دشنام طرازی تو گویا انتخابی تقریروں کا کمال ہے، عوام کا مزاج بھی کچھ اس طرح ناتربیت یافتہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ ناشائستہ باتوں کو روکنے کی کوشش کریں، اس سے لطف اٹھاتے ہیں اور جیسے شاعر کی داد سے خوشی دوبالا ہوجاتی ہے، اسی طرح سیاسی مقررین ایسی ناشائستہ باتوں پر عوام کے قہقہوں کو اپنے لئے تحسین وآفریں سمجھتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اللہ تعالی کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ شخص وہ ہے، جو جھگڑالو اور جدال پسند ہو: ''**وإن أبغض الرجال عند الله الألد الخصم**'' (بخاری، حدیث نمبر:۲۴۵۷)، اختلاف رائے ایک جمہوری سماج کا امتیاز ہے؛ لیکن یہ ضروری ہے کہ اختلاف کا اظہار اخلاقی حدود کے اندر ہو، اور انسان اپنی زبان پر قابو رکھے؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے زبان کی حفاظت کے سلسلہ میں صحابہ کو بار بار تلقین فرمائی ہے، حضرت اسود بن اصرم محاربی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے کچھ نصیحت فرمایئے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تم اپنے ہاتھ کے مالک ہو؟ انہوں نے عرض کیا: اگر میں اپنے ہاتھ کا بھی مالک نہ ہوں تو کس چیز کا مالک ہوں گا؟ آپ ﷺ نے پھر پوچھا: کیا تم اپنی زبان کے مالک ہو؟ انہوں نے عرض کیا: اگر میں اپنی زبان کا بھی مالک نہ ہوں تو پھر کس چیز کا مالک ہوں گا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنا ہاتھ جب بھی بڑھاؤ خیر کی طرف بڑھاؤ، اور اپنی زبان سے جب بھی کہو بھلی بات کہو: ''**لا تبسط یدک إلا إلي خیر ولا تقل بلسانک إلا معروفا**'' (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر: ۸۱۸) حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے پوچھا: مجھے سب سے زیادہ کس چیز سے ڈرنا چاہئے؟ آپ ﷺ نے اپنی زبان مبارک پکڑی اور فرمایا: اس سے'' (ترمذی، حدیث نمبر:۲۵۲۲)۔

بہتان اور الزام تراشی چاہے عام زندگی میں ہو یا سیاسی معرکہ آرائی کے درمیان، یہ بہرحال دین، اخلاق کے مغائر اور گناہ شدید ہے، رسول اللہ ﷺ نے جب ہجرت سے پہلے انصار مدینہ سے

بیعت لی ،تو جن بڑے گناہوں سے بچنے کا عہد لیا، ان میں ایک بہتان تراشی بھی ہے، (بخاری، حدیث نمبر:۱۱۸)خودقرآن مجید میں اللہ تعالی نے مسلمان خواتین سے جن امور پر بیعت لینے کا ذکرفرمایا ہے،ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ بہتان تراشی سے اجتناب کریں،(الممتحنہ :۱۲)بیعت اہم ترین فرائض اور محرمات کے سلسلہ میں لی جاتی ہے،اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کسی مسلمان کے خلاف بہتان تراشی کس قدر ناپسندیدہ اور قابل مذمت عمل ہے،مگرافسوس کہ اس گناہ کو غیرمسلموں کے علاوہ مسلمانوں نے بھی الیکشن کی مہم میں اپنے لئے جائز کرلیا ہے،اسلام میں تنقید کا راستہ بندنہیں کیا گیا ہے،منکر سے روکنے کواس امت کا فریضہ منصبی ؛ بلکہ اس کا مقصد بعثت قرار دیا گیا ہے، یہ تنقید ہی تو ہے،خلفاءراشدین پر بعض دفعہ عام مسلمانوں نے برسرعام تنقیدیں کی ہیں،انہوں نے نہ یہ کہ صرف اس کا برانہیں مانا، بلکہ تنقید کرنے والوں کو مطمئن کیا،سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا کہ عین خطبہ کے دوران برسرمنبران پرنقد کیا گیا،اورکہا گیا کہ جب تک آپ ہمیں اس بارے میں مطمئن نہیں کردیں ہم آپ کی فرماں برداری نہیں کریں گے؛لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا ذرا بھی برانہیں مانااوراسی وقت اس کی غلط فہمی دورکردی۔

لیکن تنقید اورتحقیر وتنقیص دوالگ چیزیں ہیں،تنقید اخلاق وشائستگی کے دائرہ میں ہوتی ہے، اوراس کاتعلق مسائل وافکار سے ہوتا ہے،اورتنقیص یہ ہے کہ کسی کی ذاتی زندگی کو ہدف بنایا جائے، یااس کی فکراوراس کے رویہ سے اختلاف کرتے ہوئے ناشائستہ الفاظ کہے جائیں اورتمسخرآمیزلب ولہجہ اختیار کیا جائے،تعمیری تنقید جتنی ضروری چیز ہے،ایک دوسرے کی تحقیر اتنی ہی ناپسندیدہ اوراسی قدر مذموم ہے،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ کسی آدمی کے برے ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر پراتر آئے ؛ حالاں کہ ایک مسلمان کا خون اس کا مال اوراس کی عزت وآبرودوسرے پرحرام ہے:'' **بحسب امرئ من الشر أن يحقر أخاه المسلم**'' (مسلم،حدیث نمبر:۲۵۶۴) —— حضرت جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا،تو عرض کیا کہ مجھ سے کسی خاص بات کا عہد لے لیجئے ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:'' **لا تسبن أحدا** ''(کسی کو برا بھلا نہ کہو) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے انسان تو کیا کسی جانور کو بھی برا بھلا نہیں کیا(أبوداؤد،حدیث نمبر:۴۰۸۴)۔

ہم مسلمانوں کی بیماری یہ ہے کہ اولاتو ہم کسی کی جائز تنقید بھی سننے کے روادار نہیں ہوتے ؛ بلکہ ہمارے اداروں اور تنظیموں میں یہ حال ہوگیا ہے کہ جس شخص کے مخلصانہ رویوں کا برسوں تجربہ ہو چکا ہوا گر اس نے کوئی مشورہ مزاج کے خلاف دے دیا تو یہ اس بات کے لئے کافی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کو ذلیل ورسوا کر کے یہاں سے نکال باہر کیا جائے ، نیز گروہ بندی اور مفاد پرستی کچھ اس طرح ہم پر غالب آ گئی ہے کہ اگر ذمہ دار کا موقف مضبوط ہو یا اس سے کوئی ذاتی مفاد وابستہ ہو تو چاہے اس کا طرز عمل کتنا ہی ناروا، خلاف شریعت اور ملی مفاد کے مغائر ہو، ہم مہر بلب رہتے ہیں اور کم سے کم فریضۂ اظہار حق کے طور پر بھی اپنی بات نہیں پیش کرتے ، اور اگر اختلاف پر آئے تو اس طرح کمر کس کر میدان میں اترتے ہیں کہ اختلاف سے بڑھ کر افتراق اور جدال تک پہونچ جاتے ہیں ، اور بہتان تراشی سے بھی گریز نہیں کرتے ، اس افراط و تفریط نے مسلمانوں کے اداروں، تنظیموں اور اجتماعی کاموں کو بے اثر بنا دیا ہے اور اجتماعیت کی جگہ شخصیت پرستی نے لے لی ہے۔

ان حالات میں ضرورت ہے کہ ہم بہ حیثیت امت اپنے دامن عمل کو دیکھیں، خود احتسابی سے کام لیتے ہوئے اپنی کمزوریوں کا جائزہ لیں ، اگر ہم ابنائے وطن کے لئے اخلاق وکردار کا نمونہ نہیں بن سکتے تو کم سے کم اسلام کے لئے شرمندگی کا باعث بھی تو نہ بنیں ، اسلام صرف عبادت کا مذہب نہیں ہے وہ زندگی کے تمام شعبوں میں ہماری رہنمائی کرتا ہے، اور اس کے دائرہ ہدایت سے سیاست بھی باہر نہیں ہے ، یہ سمجھنا کہ ہم اس ملک میں اقلیت ہیں ؛ اس لئے ہمارے لئے سب کچھ جائز ہے ، ہم شریعت و اخلاق کے حدود سے آزاد ہیں اور قانون کی بندشیں توڑنا ہمارے لئے ایک اچھا عمل ہے اور اس طرح ہم اپنے دین اور اپنی امت کی خدمت کر رہے ہیں ، نہایت غلط اور غیر اسلامی سوچ ہے ، ہم تکلیف کی حالت میں ہوں یا آرام کی، تختۂ اقتدار پر ہوں یا تختۂ دار پر، ہمیں ہر وقت اور ہر جگہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ہم دین حق کے ترجمانی اور ایک ایسی امت کا حصہ ہیں جس کو اللہ تعالی نے پوری انسانیت پر گواہ بنا کر بھیجا ہے اور جسے پیدا ہی اسی لئے کیا گیا ہے کہ وہ انسانیت کو خیر کی طرف بلائے اور برائیوں سے روکے، اور اس کا مقصد اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی ہے ، کاش ! سیاست کے میدان میں روز بروز جو پستی پیدا ہوتی

جارہی ہے، ہم اس کے لئے ایک بہتر نمونہ پیش کریں، نہ یہ کہ ہمارے کردار کو دیکھ کر وہ قومیں بھی شرمائیں، جو ہدایت ربانی سے محروم ہیں اور ہم قانون شکنی، شدت پسندی اور بدزبانی کے لئے ضرب مثل بن جائیں۔

۲۴/اپریل ۲۰۰۹ء

جاہلیت کی واپسی

انسان کو اپنی جان کے بعد جو چیز سب سے زیادہ محبوب ہوتی ہے، وہ اس کی اولاد ہے؛ بلکہ بہت سی دفعہ اولاد کی محبت اپنے وجود سے بھی بڑھ جاتی ہے، ایک بوڑھا شخص ——— زندگی بھر کی تگ ودو نے جس کی ہڈیوں کو گھلا کر رکھ دیا ہو، ——— اگر اس کا جواں سال بیٹا بستر مرگ پر پڑا ہو، تو اس بوڑھے باپ کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ کاش کاتب تقدیر اس کا عرصۂ حیات بھی اس کے بیٹے کو دے دے؛ تاکہ وہ زندگی کی کچھ اور بہاریں دیکھ لے، یہ اتھاہ محبت، یہ بے غرض تعلق، یہ دل کی گہرائیوں میں رچا اور بسا ہوا بے پناہ جذبۂ محبت خدا کا عطیہ اور فطرت انسانی کا حصہ ہے، لیکن جب انسان کا رشتہ خدا سے ٹوٹ جاتا ہے، وہ اپنے خالق و مالک سے منہ موڑ لیتا ہے، اس میں خدا کے سامنے جواب دہی کا احساس باقی نہیں رہتا، تو وہ فطرت سے بغاوت پر اتر آتا ہے، فطرت اسے آواز دیتی رہتی ہے کہ وہ اسے سنے؛ لیکن اس کے کان بہرے ہو جاتے ہیں، فطرت کے تقاضے مجسم ہو کر اس کے سامنے آتے ہیں کہ وہ اسے دیکھے؛ لیکن دل کی آنکھیں بے نور ہو چکی ہوتی ہیں:

﴿ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا
وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ﴾ (الاعراف :۱۷۹)

پھر تو یہ باغی انسان ایسے ایسے افعال کا ارتکاب کر گزرتا ہے کہ دماغ کے لیے اس کا تصور بھی دشوار ہے۔

ایسی ہی باتوں میں ایک اولاد کا قتل ہے، بھلا یہ بات سوچی جا سکتی ہے کہ جن ہاتھوں نے سنبھال سنبھال کر اور اپنا خونِ جگر پلا پلا کر کلیوں کو غنچہ اور غنچہ کو پھول بنایا ہو، وہی اسے بے دردی سے مسل کر رکھ دے گا؟ لیکن جب انسان خدا سے بے خوف ہو جاتا ہے، تو وہ اس حرکت کا بھی مرتکب ہوتا ہے، مختلف علاقوں اور مختلف مذاہب کے نام لیواؤں میں اولاد کی قربانی کا تصور رہا ہے، اس

ترقی یافتہ دور میں بھی گاہے گاہے دیوتاؤں اور دیویوں کی خوشنودی کے لیے جگر کے ٹکڑوں کو قربان کرنے کی خبریں پڑھنے کو ملتی رہتی ہیں، روم جس کو قانون سازی کے باب میں مغرب قبلہ وکعبہ سمجھتا رہا ہے، وہاں قانونی طور پر باپ کے لیے اپنی اولاد کو قتل کی اجازت تھی، رسول اللہ ﷺ جب حجاز میں تشریف لائے، تو جہاں صحرائے عرب کا دامن طرح طرح کے مظالم سے آلودہ تھا، وہیں اولاد کشی کی رسم بھی اس خطہ میں موجود تھی، بیٹوں کو بھی قتل کردیا جاتا تھا، زیادہ تر اس کا محرک معاشی بدحالی ہوتی تھی؛ اسی لیے قرآن مجید میں دو موقعوں پر بہت ہی وضاحت کے ساتھ حکم دیا گیا کہ فاقہ کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، (الانعام:۱۵۲،۳۱) جو خدا تمہاری روزی روٹی کا سامان مہیا کرتا ہے وہی ان کے لیے بھی نظم کرے گا: ﴿ **نحن نرزقكم و إياهم** ﴾ (الأنعام :۱۵۱)

لیکن خاص طور پر لڑکیاں اس کا نشانہ بنتی تھیں اور زندہ درگور کی جاتی تھیں، اس کا ایک سبب معاشی بدحالی بھی تھا؛ لیکن دوسرا سبب غیرت وحمیت تھا، اسلام سے پہلے جنگ کا کوئی باضابطہ قانون نہیں تھا، جب کوئی قوم شکست کھاتی تو اس قوم کی لڑکیاں اور خواتین دشمن کے مال کی طرح لوٹ لی جاتیں، بعض دفعہ تو ایسا ہوتا کہ عین میدانِ جنگ میں ان کے عزیزوں کے سامنے ان کی آبروریزی کی جاتی؛ تاکہ دشمنوں کی نخوت کو مجروح کیا جائے، وہ زیادہ سے زیادہ ذلیل ورسوا ہوں، شعراء ایسے واقعات کو بطور فخر کے اشعار میں کہتے اور اس کو اپنی بہادری کی ایک مثال کے طور پر پیش کرتے، بعض عرب رؤساء کا حال یہ تھا کہ جب ان کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی تو انھوں نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا، گویا کسی کے گھر میں بیٹی کا پیدا ہونا ایک ایسی شرم وعار کی بات تھی جو اسے عرق ندامت میں ڈوبا کر رکھ دیتی تھی، قرآن مجید نے بڑی خوبصورتی سے اس کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے:

> ''جب ان میں کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی خوش خبری دی جاتی ہے، تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، وہ اس بری خبر کے رنج سے قوم سے چھپتا پھرتا ہے کہ وہ ذلت کے ساتھ اُسے قبول کرلے، یا اسے مٹی میں چھپادے'' (النحل :۷)

عرب کا ایک قبیلہ بنوتمیم اس بیماری میں زیادہ مبتلا تھا، اس کے سردار قیس بن عاصم نے خود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی بارہ یا تیرہ لڑکیوں کو دفن کرنے کا اعتراف کیا، آپ ﷺ

نے ان کے بدلے اتنے ہی جانور صدقہ کرنے کا حکم فرمایا، (دیکھئے: تفسیر ابن کثیر: ۴/ ۴۷۸، سورۂ تکویر) ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے خدمت اقدس میں آکر اپنی ایک لڑکی کو زندہ دفن کرنے کا واقعہ ذکر کیا، یہ ایسا دردناک واقعہ تھا کہ ریش مبارک تر ہوگئی، پھر ارشاد فرمایا کہ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے زمانۂ جاہلیت کے گناہ معاف ہوگئے، اب نئے سرے سے اچھے عمل کرو، (سیرۃ النبی: ۴/ ۳۹۹) حیرت کی بات یہ ہے کہ مائیں جن کی ممتا مشہور ہے، وہ بھی بعض اوقات اس بے رحمی میں شریک ہوتی تھیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ بعض عورتیں حمل ظاہر ہونے کے بعد ہی ایک گڑھا کھود لیتی تھیں اور جب ولادت کا وقت ہوتا، تو اسی گڑھے کے پاس آجاتیں، اگر لڑکی پیدا ہوئی تو گڑھے میں ڈال دیتیں اور اس کو مٹی سے برابر کردیتیں، اور لڑکا پیدا ہوتا تو اسے باقی رکھتیں، (الجامع لأحکام القرآن :۱۹/ ۲۳۳) قرآن مجید میں ایسے ظالم ماں باپ کا قیامت میں جو حال ہوگا، اس کا بڑا ہی مؤثر نقشہ کھینچا گیا ہے، خدا کی عدالت لگی ہوئی ہے، فرشتے امر خداوندی کی تعمیل کے لیے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں، انسانوں کا انبوہ اپنے نیک و بدعمل کے انجام کو سننے کے لیے خوف و ہراس کی حالت میں ہے، کہ کچھ معصوم کلیاں عدالتِ خداوندی میں پہنچتی ہیں، انھوں نے جوانی کی بہار تک نہیں دیکھی ہے، گناہ کرنا تو کیا معنی، گناہوں کی حسرت سے بھی نابلد ہیں؛ لیکن انہیں خود ان کے ماں باپ نے زندہ دفن کردیا تھا، خدا ان کے والدین کی طرف نظر بھی نہیں اٹھائے گا کہ یہ نگاہ لطف و رحمت کے تو کیا مستحق ہوں گے، نگاہ غیظ وغضب کی توجہ سے بھی فروتر ہیں، اس لیے اِنہیں بچیوں سے سوال ہوگا، اے معصوم کلیو! تمہیں کس جرم میں دفن کردیا گیا تھا؟ (سورۂ تکویر: ۸) قرآن مجید نے اس جرم کی پاداش کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ پتھر کے دل بھی پگھل جائیں۔

گو عرب میں اکثر شریف لوگ ایسی حرکت نہیں کرتے تھے اور بعض ایسے نیک دل بھی تھے جو والدین سے ان کی لڑکیوں کو خرید لیتے اور محبت کے ساتھ ان کی پرورش کرتے تھے، جیسے مشہور شاعر فرزدق کے چچا صعصعہ بن ناجیہ، (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۱۱۷) اور زید بن عمرو بن نفیل، (بخاری، حدیث زید بن عمرو بن نفیل، حدیث نمبر: ۳۸۲۸) لیکن یہ معمولی کوششیں اس ظلم و زیادتی کو روکنے کے لیے ناکافی تھیں، رسول اللہ ﷺ نے بار بار اپنے خطبات میں اس بے رحمانہ فعل کی مذمت فرمائی، عورتوں سے بیعت لیتے ہوئے اس گناہ سے توبہ کرایا اور لڑکیوں کی پرورش کی فضیلت بیان فرمائی اور اسے لوگوں

کے ذہن میں بٹھایا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس نے دولڑکیوں کی ان کے بالغ ہونے تک پرورش کی، وہ اور میں قیامت کے دن اس طرح قریب ہوں گے، جیسے یہ دونوں انگلیاں، آپ ﷺ نے انگلیوں کو ملا کر اشارہ سے سمجھایا'' (مسلم، حدیث نمبر: ۲۶۳۱)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ

''جس کو اللہ نے لڑکی دی، اس نے اسے نہ دفن کیا، نہ ذلیل سمجھا اور نہ اپنے بیٹوں کو اس پر ترجیح دی تو اللہ اسے جنت میں داخل فرمائیں گے''

(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۵۱۴۶)

ان تعلیمات کا اثر تھا کہ یا تو لوگ خود اپنی جگر گوشہ کو دفن کر دیتے تھے یا یتیم لڑکیوں کی پرورش کے لیے ایسی مسابقت پیدا ہونے لگی کہ حضور ﷺ کو حضرت امامہ بنت حمزہ کے حقِ پرورش کے سلسلہ میں فیصلہ کرنا پڑا۔

آپ ﷺ نے اس جاہلیت کو ختم فرمایا اور بیٹیوں سے محبت کرنا سکھایا، مگر افسوس کہ جاہلیت دبے پاؤں نہیں ؛ بلکہ بہ بانگ دہل واپس ہو رہی ہے، ابھی دو ہفتہ پہلے حیدرآباد کے قریبی شہر محبوب نگر میں ایک مسلمان خاتون نے اپنے والد اور شوہر کی مدد سے اپنی نومولود لڑکی کو دفن کرنے کی کوشش کی ؛ بلکہ اپنی دانست میں دفن کر دیا ؛ لیکن ''جسے خدا رکھے اسے کون چکھے'' کے مصداق مدفون لڑکی کے حرکت کرتے ہوئے ہاتھ پر بعض گذرنے والے کی نظر پڑ گئی اور وہ بچالی گئی، غور کیجئے ! کیسا مقام افسوس ہے کہ جس نبی نے دفن ہونے والی بچیوں کی جانیں بچائیں، اسی سے غلامی کی نسبت رکھنے والے اس جاہلیت کو زندہ کر رہے ہیں اور صرف اسی واقعہ پر نہ جایئے، پوری دنیا میں مردوں اور عورتوں کے تناسب کا جائزہ لیجئے، قدرتی طور پر لڑکیوں کی پیدائش تقریباً لڑکوں کے برابر ہوتی ہے، اگر اس عددی تناسب میں فرق ہوتا ہے تو وہ بہت معمولی ہوتا ہے ؛ لیکن ادھر یہ تفاوت افسوس ناک حد تک بڑھتا جا رہا ہے، مغربی ممالک میں بھی اور مشرقی ملکوں میں بھی، چین میں تو یہ صورت حال ہے کہ بعض علاقوں میں عورتوں کی تعداد مردوں سے ایک تہائی سے بھی زیادہ کم ہوگئی ہے، ہندوستان میں بھی اس رجحان میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، پنجاب میں ایک ہزار

لڑکوں پر تقریباً آٹھ سے کچھ زیادہ لڑکیاں ہیں، یہ کسی بھی انسانی معاشرہ کے لیے انتہائی نقصان دہ اور افسوس ناک ہے اور اس سے جو اخلاقی بگاڑ پیدا ہوگا، وہ ظاہر ہے، جب سے قبل از وقت ولادت زیر حمل بچہ کی جنس سے واقف ہوجانے کے ذرائع پیدا ہوگئے ہیں، ماں کے پیٹ ہی میں لڑکیوں کو موت کی نیند سلا دینے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے۔

اس کے دو بنیادی محرکات ہیں، ایک تو نکاح کے بڑھتے ہوئے اخراجات، جس کی وجہ سے لڑکیاں غریب والدین کے لیے بوجھ بن گئی ہیں، ہندوستان میں اس ظلم کا محرک زیادہ تر یہی ہے، دوسرے فیملی پلاننگ، بعض ملکوں میں قانونی طور پر ایک یا دو سے زیادہ بچے پیدا نہیں کیے جاسکتے، بہت سے ملکوں میں اس طرح کا قانون تو نہیں ہے؛ لیکن ترغیب وتحریص اور ذرائع ابلاغ کی تشہیری مہم کے ذریعہ لوگوں کو اس کا قائل کردیا گیا ہے، جو لوگ صرف ایک یا دو بچے چاہتے ہیں، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں بیٹا ہو؛ تاکہ اس کے ذریعہ اس کے خاندان کا سلسلہ جاری رہے، اس لیے جہیز کی وبا، شادی میں ہونے والی فضول خرچی اور فیملی پلاننگ کا بڑھتا ہوا رجحان دنیا کو پھر جاہلیت کی طرف لے جارہا ہے، مسلمان جو ایک داعی امت ہیں، سوچیں کہ ان حالات میں ان کی کیا ذمہ داری ہے؟

۲۷/ جولائی ۲۰۰۷ء

غیرمسلموں سے نکاح —— اسباب اور تدارک

رشتۂ ازدواج میں دوام اور استحکام کے لئے فکری ہم آہنگی ضروری ہے؛ اسی لئے اسلام نے نکاح کے رشتہ میں مذہبی تعلق کو خصوصی اہمیت دی ہے، چنانچہ اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ کوئی مسلمان عورت کسی غیر مسلم مرد کے نکاح میں جائے، خواہ وہ مشرک ہو، یہودی ہو یا عیسائی: ﴿ وَلاَ تُنْکِحُوْا الْمُشْرِکِیْنَ حَتّٰی یُؤْمِنُوْا ﴾ (البقرۃ :۲۲۱) غیر مسلم عورت سے کوئی مسلمان نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں غیر مسلموں کے دو درجات کئے گئے ہیں، یہودی اور عیسائی عورتوں سے نکاح کی گنجائش ہے؛ بشرطیکہ وہ واقعی یہودی یا عیسائی ہوں، یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود پر، آخرت کی جزاء وسزا پر اور وحی کے نظام پر ان کا ایمان ہو، اگر چہ وہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی قائل نہ ہوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتی ہوں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے یہود ونصاریٰ تھے، ان کو ''کتابی'' کہا جاتا ہے، مسلم ملک میں تو کتابی عورتوں سے نکاح کرنا معمولی کراہت کے ساتھ درست ہے؛ لیکن غیر مسلم ممالک میں کتابیہ عورت سے نکاح کرنے میں زیادہ کراہت ہے، فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے —— یہودی وعیسائی مرد وعورت میں فرق اس لئے کیا گیا ہے کہ مرد اپنی بیوی اور اولاد پر زیادہ اثر انداز ہوسکتا ہے، اور مسلم اور غیر مسلم ملک میں یہ فرق ہے کہ مسلم سماج کا مذہبی ماحول مرد کو دین پر ثابت قدم رکھے گا اور عورت کے اسلام کی طرف آنے میں معاون ہوگا، غیر مسلم سماج میں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہوگی۔

دوسرا درجہ یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ دوسرے مشرکین اور غیر مسلموں کا ہے، جس میں ہندو، سکھ، بودھ اور جین وغیرہ شامل ہیں، ان کی عورتوں سے بھی نکاح کرنا حرام ہے: ﴿ وَلاَ تُنْکِحُوا لْمُشْرِکَاتِ حَتّٰی یُؤْمِنَّ ﴾ (البقرۃ :۲۲۱) غرض کہ مسلمان لڑکی کا نکاح تو کسی بھی غیر مسلم سے نہیں ہوسکتا ہے؛ البتہ مسلمان لڑکے کا نکاح یہودی یا عیسائی لڑکی سے ہوسکتا ہے؛ بشرطیکہ

وہ واقعی یہودی یا عیسائی ہو اور بچوں کے ان سے مذہبی اعتبار سے متاثر ہونے کا اندیشہ نہیں ہو۔

نکاح میں مذہبی افکار سے وابستگی کو اہمیت دینا تعصب اور تنگ نظری نہیں ہے؛ بلکہ حقیقت پسندی اور مقاصد نکاح کی حفاظت اور ان کے استحکام کی کوشش ہے؛ کیوں کہ ایک ہی گھر میں زوجین میں سے ایک سمجھتا ہو کہ خدا ایک ہے، اس کی پیشانی خدا کے سوا کسی اور کے سامنے نہیں جھک سکتی، دنیا کی تمام مخلوقات اس کی خادم ہیں، نہ کہ اس کی معبود، دوسری طرف اسی گھر میں مورتی کی پوجا بھی ہو رہی ہو، ایک فریق اپنی اولاد کو مسجد بھیجنے کی ترغیب دے رہا ہو اور دوسرے فریق کی طرف سے اس کو مندر میں جانے کی دعوت دی جارہی ہو، تو کس طرح آپس میں ہم آہنگی اور محبت کی فضا قائم ہوسکتی ہے اور کیوں کر باہمی تصادم، ٹکراؤ اور بے اعتمادی کو روکا جاسکتا ہے؟ اور ماں باپ کی اس کشاکش کے درمیان بچے جس ذہنی تناؤ میں رہیں گے اور ان کی تعلیم وتربیت پر اس کا جو اثر پڑے گا، وہ بھی ظاہر ہے، چنانچہ یہ بات دیکھی گئی ہے کہ بعض دفعہ وقتی جذبات کے تحت دو مختلف مذاہب کے ماننے والے لڑکے اور لڑکی نکاح کر لیتے ہیں؛ لیکن یا تو ایک فریق دوسرے فریق کے مذہب کو قبول کر لیتا ہے اور رشتہ قائم رہتا ہے، یا پھر آپسی تناؤ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ تشدد اور طلاق پر رشتہ ختم ہوتا ہے اور اس وقت بچے باپ کی نگہداشت یا ماں کی محبت میں سے کسی ایک چیز سے محروم ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان کے ماحول میں اس کے ساتھ ایک اور صورتِ حال یہ پیدا ہوتی ہے کہ یہاں کا سماج بین مذہبی شادی کو قبول نہیں کرتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں فریق اپنے خاندان سے کٹ جاتے ہیں اور آئندہ پیدا ہونے والے بچے بھی اپنے دادیہال اور نانیہال سے محروم رہتے ہیں؛ حالاں کہ انسان کے لئے خاندان کی بڑی اہمیت ہے، وہ خاندان کے سہارے کے بغیر ایک پُرسکون زندگی گذار نہیں سکتا اور اس کے بغیر اس کی زندگی میں ایک ایسا خلاء اور تنہائی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے، جو اس کے لئے سوہانِ روح بنا رہتا ہے اور بچے ہمیشہ احساسِ محرومی کا شکار رہتے ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات اگر پورا خاندان موجود ہو؛ لیکن صرف بھائی بہن نہ ہوں، تب بھی انسان اپنے آپ میں کمی محسوس کرتا ہے؛ چہ جائیکہ پورا خاندان موجود ہو اور آدمی اس کی محبت اور توجہ سے محروم رہے، پھر ایک مسئلہ آئندہ ان بچوں کے شادی بیاہ کا بھی ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ عام طور پر جب

کسی خاندان میں بین مذہبی شادی کا واقعہ پیش آتا ہے، تو ان کے بچوں کی شادی دشوار ہوجاتی ہے؛ بلکہ ان کے بھائی بہن سے بھی لوگ شادی کے روادار نہیں ہوتے اور مستقبل میں ان کو بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے مسلمانوں کے غیر مسلموں سے نکاح کے واقعات شاذ ونادر ہی پیش آتے تھے، پھر اس میں اضافہ ہونے لگا؛ لیکن زیادہ تر واقعات مسلمان لڑکوں کے غیر مسلم لڑکیوں سے نکاح کے پیش آتے تھے، اکثر اس طرح کی شادی دامِ محبت میں پھنس کر یا پھنسا کر ہوا کرتی تھی اور عام طور پر لڑکیاں یا تو نکاح سے پہلے ہی مسلمان ہوجاتی تھیں یا بعد میں اسلام لے آتی تھیں، پھر تجدید نکاح کر دیا جاتا تھا اور بتدریج وہ مسلم سماج کا حصہ بن جاتی تھیں، بعض ایسی نومسلم لڑکیاں بھی ہیں، جو اپنے سسرالی خاندان میں دوسروں کے مقابلہ زیادہ بہتر ثابت ہوئیں؛ کیوں کہ اپنے والدین سے کٹ جانے اور اپنے خاندان سے ٹوٹ جانے کے بعد انھوں نے اپنے سسرال ہی کو اپنا خاندان تصور کیا اور ساس سسر کو ماں باپ کی حیثیت دی؛ لیکن اب نئی صورتِ حال یہ پیدا ہورہی ہے کہ مسلمان لڑکیاں غیر مسلموں سے نکاح کی طرف مائل ہورہی ہیں، جو ایک زمانہ میں ناقابل تصور بات تھی، اس سلسلہ میں بہت سے واقعات اخبارات کی زینت بھی بن چکے ہیں، مسلمانوں کے لئے یہ صورتِ حال نہایت قابل توجہ، افسوسناک؛ بلکہ شرمناک ہے اور ضروری ہے کہ ہم اس کے اسباب اور اس کے تدارک کی تدابیر پر غور کریں۔

جہاں تک میں نے غور کیا، اس سلسلے میں تین باتیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں: اول بچوں کی تربیت کی طرف سے غفلت، دوسرے مخلوط تعلیم، تیسرے شادیوں میں بڑھتے ہوئے اخراجات ---آج کل والدین کسبِ معاش میں اس قدر مشغول ہوگئے ہیں کہ ان کے پاس اپنے بچوں کے لئے کوئی وقت نہیں ہے، نہ وہ خود اپنے بچوں کی دینی واخلاقی تربیت کرتے ہیں اور نہ کسی اور کے ذریعے اس کا اہتمام کراتے ہیں، لڑکے اور لڑکیاں گھر سے باہر نکلنے کے بعد کہاں وقت گذارتے ہیں، کالجوں، اسکولوں میں یا پارکوں، ہوٹلوں اور ریسٹورنٹوں میں؟ اس پر ان کی نظر نہیں ہوتی، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض لڑکے اور لڑکیاں اپنے گھر والوں کو بے خبر رکھ کر اپنے وقت کا بے جا اور ناروا استعمال کرتے ہیں، اسی طرح موبائل فون اور انٹرنیٹ کا غلط استعمال بھی بہت بڑا فتنہ ہے، والدین

کو چاہئے کہ لڑکوں اور خاص کر لڑکیوں کو موبائل دینے سے گریز کریں اور اگر بہ تقاضۂ ضرورت موبائل دیں، تب بھی آنے والے فون نمبرات اور پیغامات کو چیک کرتے رہیں، اسی طرح تنہائی میں انٹرنیٹ دیکھنے سے منع کریں اور وقتاً فوقتاً چیک بھی کرتے رہیں کہ بچے کن پروگراموں سے استفادہ کر رہے ہیں اور نیٹ کے ذریعے کن لوگوں سے اور کیا مراسلت کرتے ہیں؟ ان چیزوں سے بے توجہی اور اس کے ساتھ ساتھ گھریلو تربیت کا فقدان بچوں کو غلط راستہ پر ڈال دیتا ہے۔

مخلوط تعلیم کا مسئلہ بھی بڑا اہم ہے، یہ ناروا تعلقات کے لئے بڑا اہم رول ادا کرتا ہے، اس لئے کوشش کرنی چاہئے کہ بچوں کو ایسے اسکول میں داخل کیا جائے، جہاں لڑکے اور لڑکیوں کے لئے تعلیم کا جداگانہ نظم ہے اور اسکول کی انتظامیہ سے اس کا مطالبہ بھی کرنا چاہئے، اگر پورا مسلم سماج طے کر لے کہ ہم اپنے بچوں کو مخلوط تعلیم سے بچائیں گے، تو اسکولوں اور کالجوں کی انتظامیہ بھی مجبور ہوگی کہ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے علاحدہ بلڈنگوں اور علاحدہ کلاس روم کا انتظام کرے، افسوس کہ مسلم انتظامیہ بھی اس کا انتظام نہیں کرتی؛ بلکہ 'مخلوط تعلیم' کا اشتہار میں خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے، گویا یہ بھی کوئی قابل فخر چیز ہو اور قابل ترجیح اُمور میں داخل ہو، کم سے کم مسلمان انتظامیہ کو تو اس کو ملحوظ رکھنا چاہئے، اعلیٰ تعلیمی اداروں میں جب تک یہ ممکن نہ ہو، تب تک ایسا تو کیا جاسکتا ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی نشستیں الگ الگ ہوں اور درمیان میں پانچ چھ فٹ اونچی لکڑی کی دیوار رکھی جائے؛ تاکہ جس حد تک احتیاط ممکن ہو، اس کو برتا جائے، مخلوط نظامِ تعلیم نہ صرف اخلاق کے لئے نقصاندہ ہے؛ بلکہ تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی مفید نہیں، اس سے لڑکوں کی توجہ بٹتی ہے اور لڑکیاں سبق کے دوران مسلسل پریشر میں رہتی ہیں اور عدم تحفظ کے احساس سے دوچار رہتی ہیں؛ اس لئے مسلمانوں کو اپنے زیر انتظام اداروں میں غیر مخلوط تعلیم کا نظم کرنا چاہئے اور غیر مسلم بھائیوں سے بھی اس کی خواہش کرنی چاہئے، چنانچہ بعض ادارے ایسے موجود ہیں، جو غیر مسلموں کے زیر انتظام ہیں؛ لیکن انھوں نے طلبہ و طالبات کے لئے الگ الگ بلڈنگیں رکھی ہیں، اگر اس سلسلے میں کوششیں کی جائیں تو انشاء اللہ اس کا مثبت اثر پڑے گا؛ کیوں کہ لڑکیوں میں تعلیمی رجحان کے اضافہ کی وجہ سے اب طالبات کی بھی اتنی زیادہ تعداد ہوتی ہے کہ ان کے لئے جداگانہ نظم مالی اعتبار سے بھی اسکولوں کے لئے نقصاندہ نہیں۔

سب سے بڑا مسئلہ شادی میں بڑھتے ہوئے اسراف اور فضول خرچی کا ہے، افسوس کہ اس حمام میں سب بے لباس ہیں، سوائے ان کے، جن کو اللہ تعالیٰ کی توفیقِ خاص حاصل ہو، یہاں تک کہ مذہبی قائدین کے یہاں ہونے والی شادیاں بھی پرانے نوابوں اور رئیسوں کی یاد دلاتی ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سوچ کا انداز ہی بدل گیا ہے، فضول خرچ اور ظاہری تزک واحتشام کا اہتمام کرنے والوں کو سماج میں حقیر اور کم تر نہیں سمجھا جاتا؛ بلکہ ان کو عزت دی جاتی ہے اور تو اور، علماء اور مشائخ کا بھی حال یہ ہے کہ اگر ان کا کوئی غریب نیاز مند ان کو مدعو کرے یا ان کا غریب پڑوسی بلائے، تب تو وہ بمشکل ہی تقریب میں شریک ہوں گے؛ لیکن اگر شہر کے کسی بھی کونے کا کوئی صاحبِ ثروت شخص یا زور زبردستی سے پیسے حاصل کرنے والا پہلوان اور لینڈ گرابر اپنے یہاں مدعو کرے، تو سر کے بل چل کر جائیں گے، اس طرز عمل نے لوگوں کی سوچ ہی کو بدل ڈالا ہے اور لوگ اب اس غیر اسلامی رویہ کو شان وآن اور عزت وافتخار کی بات سمجھنے لگے ہیں، ولاحول ولاقوۃ الا باللہ، اس فضول خرچی کا نتیجہ یہ ہے کہ لڑکیوں کی عمر تیس پینتیس سال کی ہو جاتی ہے اور شادی کی نوبت نہیں آتی، والدین کی کروٹیں بے سکون اور ان کی آنکھیں نیند سے محروم ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ ان حالات میں لڑکیاں غلط قدم اُٹھانے پر تُل جاتی ہیں، ایسی صورتِ حال کی وجہ سے جو لڑکیاں غلط راستہ پر پڑ جائیں، پورا سماج ان کے گناہ میں شریک ہے اور سبھوں کی عنداللہ جواب دہی ہے۔

اس لئے پوری سنجیدگی کے ساتھ مسلمان تعلیمی اداروں، سماجی اور مذہبی تنظیموں، علماء ومشائخ، مذہبی وسیاسی قائدین، اُردو اخبارات ورسائل اور دینی تحریکوں اور جماعتوں کو اس مسئلہ پر غور کرنے، مہم چلانے اور فکر وشعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ یہ بیماری بڑھتی ہی جائے گی اور جب بیماریاں ایک حد سے تجاوز کر جاتی ہیں تو ان کا علاج ممکن نہیں رہتا۔

۱۷/ جولائی ۲۰۰۹

مسلمان اقلیتیں: مسائل اور حل

رابطہ عالمِ اسلامی کانفرنس کے فیصلے

گذشتہ ادوار میں مملکت کا ایک متعین مذہب ہوا کرتا تھا، تمام لوگ اسی مذہب کے پابند ہوتے تھے، بادشاہ بھی اسی مذہب کا نمائندہ ہوتا تھا، سرکاری طور پر دوسرے مذاہب تسلیم نہیں کئے جاتے تھے؛ اس لئے دوسرے مذاہب کے لوگ یا تو اس ملک میں قیام ہی نہیں کرتے تھے یا اس طرح رہتے تھے کہ اُن کو مذہبی آزادی حاصل نہیں ہوتی تھی، وہ اپنے مذہبی تشخصات اور علامات کے ساتھ زندگی نہیں گذار سکتے تھے، یورپ میں اس کی وجہ سے لاکھوں انسان کا قتل ہوا، خود کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائی فرقوں کے اختلاف میں مغربی مؤرخین کے بیان کے مطابق ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ زندہ جلا دئے گئے؛ کیوں کہ مرتد ہونے والوں کو خاص طور پر زندہ جلانے کی سزا دی جاتی تھی، رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ باسعادت کے وقت دنیا میں دو بڑی طاقتیں تھیں، ایک ایران جو مشرک اور بت پرست قوموں کی نمائندہ تھی، جب یہ عیسائی علاقوں پر قابض ہوتی تو اُن کی عبادت گاہوں کی اینٹ سے اینٹ بجادیتی، دوسری طاقت رومن امپائر کی تھی، جس کا مذہب عیسائی تھا، وہ بھی جب غالب آتے تو ایرانیوں کو تکلیف پہنچانے اور بے آبرو کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے تھے، یہودیوں پر اس قدر مظالم ڈھائے جاتے کہ انہیں اچھوت سمجھا جاتا، ان کی الگ کالونی ہوتی اور اسی لئے یہودی فلسطین سے نکل کر مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے، مدینہ میں جو یہودی آباد تھے وہ بھی اسی طرح فلسطین سے کوچ کر کے آئے تھے۔

اس لئے اس زمانہ میں مذہبی اقلیتوں کا تصور نہیں تھا اور نہ جمہوری اور ہمہ مذہبی سلطنتیں پائی جاتی تھیں، غالبًا پہلی بار ہجرت کے بعد پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسی مملکت کی بنیاد رکھی، جس میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو ایک ساتھ رہنے کی گنجائش فراہم کی گئی اور اقلیتوں کے

مذہبی حقوق کوتسلیم کیا گیا،ہجرت کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کی اکثریت قائم ہوچکی تھی ، یہود اور مشرکین اقلیت میں تھے،رسول اللہ ﷺ نے تمام اہل مدینہ کے لئے معاہدہ کی دستاویز تیار کی ،جس میں دو نکتے بنیادی اوراہمیت کے حامل تھے،ایک یہ کہ سب لوگ اپنے اپنے مذہب پرعمل کرنے میں آزاد ہوں گے اورایک دوسرے کی جان و مال اورعزت وآبرو کا احترام کریں گے، دوسرے یہ کہ اگر مدینہ پر بیرونی دشمنوں نے حملہ کیا تو سب مل کرمشترکہ طور پر دفاع کریں گے،آپ ﷺ کواس معاہدہ کا اس قدر پاس ولحاظ تھا کہ جب یہودیوں کا ایک معاملہ آپ ﷺ کی عدالت میں آیا تو آپ ﷺ نے انہیں تلقین فرمائی کہ تورات کے مطابق اس کا فیصلہ کرلیں۔

امت محمدیہ کا آغاز مکہ مکرمہ کی سرزمین پر ایک ایسی اقلیت سے ہوا،جنہیں انگلیوں پر شمار کیا جاسکتا تھا،لوگوں نے بہت کوشش کی کہ اس درخت کو اکھاڑ پھینکا جائے؛لیکن اسے جس قدر دبانے کی کوشش کی گئی ، یہ اسی قدر اونچا اور سر بلند ہوتا گیا ، یہاں تک کہ تیرہ سال کی مدت میں سینکڑوں افراد دامنِ اسلام میں آگئے ،مگر مکہ کے لوگوں کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ یہاں ایک ایسے دین کی نشو ونما ہو جو توحید کا داعی اور بت پرستی کا مخالف ہو، چنانچہ اپنے دین پر استقامت اوراس کی دعوت کی راہ میں مسلمانوں نے ناقابل برداشت تکلیفیں اٹھائیں اورانہیں ایذا پہنچانے میں اہلِ مکہ نے اپنی بعض قدیم روایات کا بھی پاس نہیں رکھا،ان حالات میں مسلمانوں نے پہلے حبش پھر مدینہ منورہ کو ہجرت کی۔

چوں کہ مدینہ میں مسلمانوں کوامن وامان نصیب ہوا؛اس لئے مسلمانوں کوعمومی طور پرحکم دے دیا گیا کہ وہ جہاں کہیں ہوں وہاں سے مدینہ منتقل ہو جائیں؛البتہ جب مکہ فتح ہوگیا اور پورے جزیرۃ العرب نے اسلام کے سامنے سرتسلیم خم کرنا شروع کردیا،تب وہاں کے لوگوں سے یہ حکم واپس لے لیا گیا اورآپ ﷺ نے ارشادفرمایا:''**لا هجرة بعد الفتح** ... ''(صحیح البخاری ، کتاب الجهاد ، باب فضل الجهاد والسير ،حدیث نمبر:۲۷۸۳) کہ فتحِ مکہ کے بعد اب ہجرت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

چنانچہ مختلف علاقوں میں اسی پرعمل رہا کہ جب کوئی علاقہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوجاتا تو مسلمان وہاں بڑی تعداد میں آباد ہونے کی کوشش کرتے اور جب کوئی علاقہ مسلمانوں کے ہاتھوں

سے نکل جاتا تو مسلمان وہاں سے ہجرت کر جاتے ،فقہاء نے بھی ایسے لوگوں پر ہجرت کو واجب قرار دیا ہے ؛ کیوں کہ ان کیلئے غیر مسلم حکومتوں کے تحت اپنے مذہب پر چلنا دشوار ہوجاتا ، فقہ کی کتابوں میں غالبًا سب سے پہلے اندلس کا ذکر ملتا ہے، جہاں مسلمانوں کی پسپائی کے بعد بھی مسلم آبادی کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں باقی رہ گئیں ،مشہور محقق علامہ کمال الدین بن ہمام (المتوفی:۸۶۱ھ) نے پہلی بار اپنی کتاب فتح القدیر میں اُن مسلمانوں کے مسائل پر گفتگو کی ہے،اورانہیں اپنے طور پر نظام قضا قائم کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

لیکن سترہویں صدی سے صورت حال میں نمایاں تبدیلی آ گئی اورایسی جمہوری حکومتیں قائم ہوئیں ،جس میں مملکت کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوتا اورمختلف مذہبی اکائیوں کواپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے کی اجات ہوتی ، اس کی وجہ سے یہ بات ممکن ہوئی کہ ایک مذہبی اکثریت والے ملک میں مختلف مذہبی اقلیتیں بود و باش اختیار کرسکیں ، اس صورت حال کی وجہ سے بہت سے ملکوں نے اقلیتوں کے حقوق سے متعلق قانون بھی بنائے اورخوداقوام متحدہ نے بھی اس کوخصوصی اہمیت دی اور بنیادی حقوق کا چارٹ تیار کیا،جس پر دنیا کے بیشتر ممالک دستخط کر چکے ہیں۔

بدلتے ہوئے حالات میں مسلمان بھی ایشیا ، یورپ ، امریکہ اور افریقہ کے مختلف ایسے خطوں میں خیمہ زن ہوئے جہاں انہیں دوسرے مذاہب پر یقین رکھنے والی اکثریتوں سے سابقہ تھا ،بیسویں صدی کے نصف کے بعد مسلمان اقلیتوں کے تعداد میں مزید اضافہ ہوگیا ؛ کیوں کہ جب مغربی استعماری قوتیں ہٹیں تو بعض ممالک جن پر پہلے مسلمانوں کی حکومت تھی ،اب وہ حکومت سے محروم ہوگئے ،بعض مسلمان ملکوں سے فوجیوں اور مزدوروں کی شکل میں بڑی تعداد میں استعماری طاقتوں نے مسلمانوں کواپنے اپنے ملکوں میں منتقل کیا تھا ،انہوں نے وہاں مستقل طور پر اقامت اختیار کر لی ، افسوس کہ استعماریت سے آزاد ہونے کے بعد بیشتر مسلمان ملکوں میں بادشاہت یا آمریت کا دور دورہ قائم ہوگیا ، جمہوریت پنپ نہیں سکی اوران حکومتوں نے اپنے ہی شہریوں کے خلاف سیاسی اختلافات کی بناء پر ایسے جوروستم ڈھائے کہ شاید مسلمانوں کوان کے کھلے دشمنوں نے بھی ایسی تکلیفیں نہیں پہنچائی ہوں گی ، اس صورت حال میں مسلمان ملکوں سے بڑی تعداد میں مسلمانوں نے مغربی ملکوں کی پناہ لی اور اِن ملکوں نے بھی فراخدلی کے ساتھ انہیں پناہ دی ؛ تاکہ

ایک طرف اُن کی انسانیت دوستی کا چرچا ہواور دوسری طرف وہ بوقت ضرورت ان پناہ گزینوں کو اُن کے اپنے ممالک کی حکومتوں کے خلاف استعمال کرسکیں، اس کے علاوہ معاشی اسباب کے تحت بھی غریب مسلم ممالک سے بڑی تعداد میں لوگوں نے نقلِ مکان کیا، اس طرح اب صورت حال یہ ہے کہ پوری دنیا کی تقریباً نصف مسلم آبادی عالمِ اسلام سے باہر ہے اور اقلیت کی حیثیت سے زندگی گذار رہی ہے اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ مسلمان علمی اور معاشی اعتبار سے عام طور پر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں سے فائق اور برتر حالت میں ہیں، اور اس کی وجہ سے دعوت دین کے لئے بھی وسیع امکانات پیدا ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اب یورپ کے متعدد ملکوں میں اسلام دوسرا بڑا مذہب بن چکا ہے، اور شاید امریکہ میں بھی۔

ان حالات کے پس منظر میں مسلمان اقلیتیں تعلیمی، تہذیبی، معاشی اور سیاسی پہلوؤں سے ایسے مسائل سے دوچار ہیں، جن کا سرِ رشتہ شریعت اسلامی سے جڑا ہوا ہے اور اب عالمی سطح پر نہ صرف ان مسائل پر غور کیا جا رہا ہے ؛ بلکہ فقہ الاقلیات ایک مستقل عنوان بن چکا ہے ، ان موضوعات پر عالمِ اسلام کی فقہ اکیڈمیوں کے علاوہ غیر مسلم ممالک میں قائم فقہی اداروں —— اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا، یورپی افتا کونسل اور مجمع فقہاء الشریعۃ امریکہ —— نے بھی بڑی علمی اور تحقیقی کاوشیں کی ہیں؛ لیکن مسلمان اقلیتوں کے بہت سے مسائل ہیں، جو ابھی بھی تشنۂ تحقیق ہیں اور جن مسائل پر غور کیا گیا ہے، ان میں بھی اتفاق رائے قائم کرنے کی ضرورت باقی ہے، اسی پس منظر میں ۲۱ تا ۲۳ ذوقعدہ ۱۴۳۰ھ بمطابق ۹ تا ۱۱ نومبر ۲۰۰۹ء کو رابطہ عالمِ اسلامی نے ''**المعهد العالي للفكر والحضارة الإسلامية**'' اور بین الأقوامی اسلامک یونیورسٹی ملیشیا کے شعبۂ فقہ اور اور اصولِ فقہ کے تعاون سے ملیشیا کی راجدھانی کوالالمپور میں ایک عالمی کانفرنس منعقد کی تھی، جس کا عنوان تھا: ''**فقه الأقليات في ضوء مقاصد الشريعة : تمييز واندماج**'' (مسلمان اقلیت کے شرعی مسائل، مقاصد شریعت کی روشنی میں، تشخص کی حفاظت اور تہذیبی انضمام کے پسِ منظر میں)۔

یہ کانفرنس اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کی حامل تھی کہ اس میں پوری دنیا میں موجود غیر مسلم اکثریت ممالک کے مسائل پر بحث کی گئی اور اگرچہ بعض شخصیتیں عالم اسلام سے بھی شریک ہوئیں؛

لیکن زیادہ تر نمائندے انہی ملکوں سے تعلق رکھتے تھے، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں؛ چنانچہ امریکہ، شمالی امریکہ، برطانیہ، فرانس، ارجنٹائنا، ایشیائی ملکوں میں چین، ہندوستان، تھائی لینڈ، سنگاپور، کوریا اور سری لنکا کے علاوہ کئی افریقی ممالک اور ملیشیا میں منعقد ہونے کی وجہ سے ملیشیا اور انڈونیشیا کے متعدد اہل علم اجلاس میں شریک تھے، ہندوستان کی نمائندگی اسلامک فقہ اکیڈمی کے نائب صدر مولانا بدر الحسن قاسمی اور جنرل سکریٹری (راقم الحروف) نے کی۔

۱۰/ نومبر کو بعد نماز ظہر چھٹی نشست میں اس حقیر کا مقالہ تھا، مجھے مسلمان اقلیتوں کے سیاسی مسائل ''**الأقليات المسلمة وقضاياها السياسية**'' کا عنوان دیا گیا تھا، میرا مقالہ تقریباً ۶۰/ صفحات پر مشتمل تھا، اور ہر مقالہ نگار کو ۲۰/ منٹ کا وقت دیا گیا تھا، اتنے کم وقت میں پورے مقالہ کو پیش کرنا تو ممکن نہیں تھا؛ اس لئے اس کا ملخص؛ بلکہ اس کے اقتباسات پیش کئے گئے، اس مقالہ میں مسلمانوں کے الیکشن میں حصہ لینے، ملک کے دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانے، غیر مسلم جج کے فیصلوں کے معتبر ہونے اور نہ ہونے، مسلمانوں کے اسلامی شعار کے تحفظ اور ملکی قوانین کے سلسلہ میں مسلمانوں کے رویہ جیسے موضوعات پر گفتگو کی گئی تھی، سیمینار کے عمومی رجحان کے پس منظر میں اس حقیر نے دو بنیادی نکات پر زور دیا تھا، جن کی طرف اشارہ کرنا مناسب محسوس ہوتا ہے۔

پہلی بات یہ کہ اسلام میں بعض قوانین حالات کی تبدیلی کے لحاظ سے تغیر پذیر رکھے گئے ہیں، وہ کسی خاص علاقہ اور کسی خاص عہد کی مصالح سے مربوط ہیں، اگر احوال کے بدل جانے کے باوجود ان کو جوں کی توں حالت میں رکھنے پر اصرار کیا جائے تو اس سے شریعت اسلامی کی بنیادی روح — یعنی عدل وانصاف کو قائم رکھنا اور لوگوں کو ظلم وحرج سے بچانا — متاثر ہو کر رہ جائے گی؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ شریعت کے بہت سے احکام وہ ہیں جو دائمی حیثیت کے حامل ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، یہ وہ احکام ہیں جن کی قرآن مجید اور معتبر احادیث میں صراحت آئی ہے، یا جن پر امت کا اجماع واتفاق ہے، اکثریت اور اقلیت کے لئے یہ احکام یکساں طور پر واجب العمل ہیں۔

دوسری بات یہ عرض کی گئی کہ مسلمان اقلیتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ غیر مسلم ممالک میں دو باتوں کو ملحوظ رکھیں، اول: یہ کہ ملکی قوانین کے احترام، ہم وطنوں کے ساتھ ہمدردانہ وخیر خواہانہ تعلق، سماج کی تعمیر اور ملک کی خدمت کے لئے جد وجہد اور داعیانہ کردار کے ساتھ ایسے ملکوں میں

رہیں اور دوسری طرف اپنی شناخت کی حفاظت ، اپنے دینی و مذہبی تشخص کو برقرار رکھنا اور اپنے آپ کو اکثریتی تہذیب میں ضم ہوجانے یا اکثریتی فکر سے بچانے کی کوشش بھی ان کے لئے ضروری ہے ، اگر ان کے تعلقات ہم وطنوں سے بہتر نہ ہوں تو اس سے اسلام اور مسلمانوں کی غلط تصویر ابھرے گی اور اس دینِ حق کے مزاج کے بھی خلاف ہوگا ، جس کی بنیاد عدل و رحمت پر ہے ، اور اگر انہوں نے اپنی شناخت کی حفاظت نہیں کی تو یہ چیز بتدریج ان کو دین و ایمان سے محرومی تک پہنچا سکتی ہے ۔

اس بات کو دیکھ کر افسوس ہوا کہ جو مسلمان مغربی ممالک میں آباد ہیں ، اور خاص کر عرب تارکین وطن ، ان میں رخصتوں پر عمل کرنے کی سوچ اس طرح مسلط ہے کہ بعض متفق علیہ احکام میں بھی وہ تبدیلی چاہتے ہیں اور اس کے لئے فقہاء کے شاذ اقوال کو اپنے لئے ڈھال بناتے ہیں ، یہ ایک خطرناک رجحان ہے ، جو اکثر مفتوح اور شکست خوردہ قوموں میں پیدا ہوجاتا ہے ، ان کے دل میں اسلام کی محبت بھی ہوتی ہے ، دین سے ان کو تعلق بھی عزیز ہوتا ہے ؛ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کا ذہن شکست خوردہ ہوتا ہے اور وہ غیر شعوری طور پر فاتح قوم کے بعض افکار کو قبول کر لینا چاہتے ہیں ، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود اسلام کے نام پر اسلام کی تراش خراش کی جاتی ہے ، اور دین کے نام پر دین کے بخئے ادھیڑے جاتے ہیں ، میرا خیال ہے کہ ایک مسلمان کا کسی گناہ یا غلطی کا اس کو غلطی اور گناہ سمجھتے ہوئے مرتکب ہونا اس سے کمتر ہے کہ وہ اس گناہ کو صحیح ثابت کرنے اور ایک ناروا عمل کو روا و درست قرار دینے کی کوشش کرے ، اس کی کئی مثالیں کانفرنس میں سامنے آئیں ، جیسے یورپی افتاء کونسل کے نمائندہ کی رائے تھی کہ اگر کوئی غیر مسلم جوڑا ہو اور عورت اسلام قبول کرلے تو اس کا نکاح باقی رہے گا اور وہ اپنے شوہر کو اسلام کی طرف دعوت دیتی رہے گی ، نیز اس کے لئے کوئی مدت بھی متعین نہیں ہے ، اسی طرح ایک رجحان یہ تھا کہ غیر مسلم عدلیہ کا فیصلہ فسخ نکاح وغیرہ کے باب میں بھی شرعاً معتبر سمجھا جائے گا ، اسی طرح کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ ایشیا میں جو مشرک قومیں پائی جاتی ہیں ، ان کو بھی اہل کتاب کے زمرہ میں رکھا جائے ، زکوۃ کے استعمال کے سلسلہ میں بعض حضرات نے یہ تصور پیش کیا کہ اس کو عام کار خیر اور خدمت خلق کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے ، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ایسی آراء پر فیصلہ نہیں ہوا ؛ لیکن بہر حال اس سے مفتوحانہ فکر کی غمازی ہوتی

ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس عہد کے فقہاء میں اعتدال کی ضرورت ہے، اتنی شدت بھی درست نہیں کہ کسی خاص دبستان فقہ کی آراء کو قرآن وحدیث کی نصوص کا درجہ دے دیا جائے، جیسا کہ اس وقت پڑوسی ملک میں اسلامک بینکنگ کے سلسلہ میں علماء کے ایک بڑے گروہ کی طرف سے ہورہا ہے، اور نہ اتنی نرمی ہو کہ شریعت کی حدود داربعہ ہی متاثر ہوجائیں اور جن نکات پر سلف صالحین کا اتفاق ہے اور ان کا ثبوت کتاب وسنت کی تصریحات اور امت کے اجماع سے ہے، ان پر بھی خط نسخ پھیرنے کی جسارت کی جائے۔

کانفرنس ۲۳/ ذوقعدہ مطابق ۱۱/نومبر ۲۰۰۹ء کو ختم ہوئی اور ایک مفصل اور بصیرت افروز اعلامیہ جاری ہوا، اس اعلامیہ میں امت اسلامیہ سے بھی خطاب ہے، فقہ اکیڈمیوں سے بھی گذارشات کی گئی ہیں، نیز مسلم ممالک، مسلمان تنظیموں اور غیر مسلم ممالک کے حکمرانوں کو بھی متوجہ کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں کچھ اہم نکات قابل ذکر ہیں:

- مسلمانوں سے خواہش کی گئی ہے کہ وہ دین پر استقامت اختیار کریں؛ لیکن میانہ روی اور اعتدال کا خیال رکھیں، نیز غیر مسلموں کے درمیان اسلام کا تعارف اور اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرنے پر خصوصی توجہ دیں، اس بات پر خصوصی توجہ دیں کہ غیر مسلموں سے ان کے تعلقات بہتر ہوں اور مسلمانوں کے لئے تعلیم وتربیت کا ایسا نظام بھی قائم کیا جائے کہ ان کی اپنی شناخت بھی متاثر نہ ہو۔
- فقہ اکیڈمیوں سے خواہش کی گئی ہے کہ چونکہ دنیا میں مسلمان اقلیتوں کا تناسب اچھا خاصا ہے؛ اس لئے ان کے مسائل کو خاص طور پر توجہ کا مرکز بنائیں اور فقہی نقطۂ نظر سے ان کی مشکلات اور دشواریوں کا حل تلاش کریں۔
- غیر مسلم اکثریت حکومتوں سے خواہش کی گئی ہے کہ وہ بین الاقوامی قانون کے مطابق مسلمانوں کو ان کے دینی شعائر کے اظہار نیز تعلیمی اور اجتماعی اداروں کے قیام کا موقع فراہم کرے، انہیں مذہبی، سیاسی اور سماجی آزادی دیں اور عالم اسلام کو مسلمان اقلیتوں کے تعاون کا موقع فراہم کریں۔

- مسلمان حکومتوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ مسلمان اقلیتوں کی مادی و دینی ضرورتوں کا خصوصی لحاظ رکھیں، مقامی زبانوں میں قرآن مجید اور دینی لٹریچر کو منتقل کریں، مسلمان اقلیتوں کو اپنے یہاں کی یونیورسیٹیوں میں تعلیم کی سہولت فراہم کریں اور خواتین و بچوں کے لئے خصوصی تربیتی پروگرام چلائیں۔
- فقہ کانفرنس نے اسلامی تنظیموں سے خواہش کی ہے کہ وہ مسلمان اقلیتوں کے پرسنل لاء کو قانون شریعت کے مطابق نافذ کرنے کے لئے ایک ادارہ تشکیل دے ، جو غیر مسلم حکومتوں سے اس سلسلہ میں گفتگو کرے، نیز بعض ملکوں میں جو مسجدیں اور اوقاف مسلمانوں سے چھین لئے گئے ہیں، ان سے کہا جائے کہ وہ اسے واپس کردیں۔
- اخیر میں ایک تجویز بیت المقدس اور مسجد اقصی سے متعلق منظور کی گئی ، جس میں اسرائیل کے ظلم و جور اور مسجد کے سلسلہ میں اس کے ناپاک عزائم کا ذکر ہے۔

ان تمام تجاویز کو عملی طور پر نافذ کرنے اور مؤثر بنانے کے لئے رابطہ عالم اسلامی سے خواہش کی گئی کہ وہ ایک منتظم اور رابطہ کار کے فرائض انجام دے، واقعہ ہے کہ یہ کانفرنس اقلیتوں کے شرعی، سیاسی اور سماجی مسائل کو ابھارنے میں ایک بہتر اجتماع ثابت ہوا، اگر چہ کہ اس کا حق یہ تھا کہ کسی ایسے ملک میں اس کا انعقاد عمل میں آتا ، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ، کانفرنس میں ان مسائل کی بھی گونج رہی جو بعض مغربی ملکوں میں خود مسلمانوں کے درمیان شدید اختلاف و انتشار کا سبب بنے ہوئے ہیں، ان میں سرفہرست ''رؤیت ہلال'' کا مسئلہ ہے، چنانچہ امریکہ و برطانیہ وغیرہ میں صورت حال یہ ہے کہ بعض اوقات ایک ہی گھر میں دو اور تین دن عید ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ اس کے لئے امت اور بالخصوص علماء کے مزاج میں بتدیلی کی ضرورت ہے، شریعت میں بوقت ضرورت تیسرے دن تک بھی عید اور بقرعید کی نماز پڑھنے کی گنجائش رکھی گئی ہے؛ لیکن انتشار اور دوسری اقوام کے سامنے مسلمانوں کی غلط تصویر پیش کرنے کی اجازت ہرگز نہیں، اگر اس بات کو ملحوظ رکھ کر لوگ فیصلے کریں اور اپنی رائے پر اصرار کرنے سے بچیں تو بہت سارے اختلافات سے بچا جا سکتا ہے اور دین و شریعت کو دشمنان اسلام کی تضحیک اور جگ ہنسائی سے بچایا جا سکتا ہے، کاش، امت کے عوام و

خواص اس حقیقت پر غور کریں۔

کانفرنس کے اگلے دن اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا دو رکنی وفد ایک دوسری یونیورسیٹی ''جامعۃ العلوم الإسلامیۃ ، ملیشیا'' میں مدعو تھا، مہاتر محمد نے اپنے اخیر دور میں ملک بھر میں ۱۸ نئی یونیوسیٹیوں کے قیام کا فیصلہ کیا تھا، یہ ان ہی میں سے ایک ہے، اوراس میں اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ تمام سائنسی علوم کے شعبے بھی موجود ہیں، غرض کہ یہ ایک مکمل یونیورسیٹی ہے، اس کا احاطہ بہت وسیع اور عمارتیں نہایت دیدہ زیب ہیں اور لائبریری تو اس قدر وسیع وعریض اور عصری سہولتوں سے آراستہ ہے کہ شاید ''برس لائبریری، لندن'' کے علاوہ اتنی بڑی لائبریری دیکھنے کا مجھے موقع نہیں ملا۔

البتہ کتابیں ابھی کم ہیں، یہاں ایک شعبہ ''مجمع الفتاوی العالمیۃ'' (عالمی فتاوی اکیڈمی) ہے، جہاں سے فتوے دیئے نہیں جاتے ؛ بلکہ فتاوی کی جمع وترتیب کا کام کیا جاتا ہے، یہیں مجمع الفتاوی اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے درمیان باہمی تعاون کے معاہدہ پر دستخط ہوئے ، اس تقریب میں یونیورسیٹی کے وائس چانسلر نے عربی زبان میں بڑی اچھی تقریر کی اور یہ بات محسوس کی گئی کہ وہاں جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی عربی زبان کا اچھا ذوق پایا جاتا ہے۔

ان یونیورسٹیوں کو دیکھ کر ملیشیا کی ترقی کا راز بھی معلوم ہوا کہ مہاتر محمد نے جب اقتدار کی زمام اپنے ہاتھ میں لی تو ان کی اولین ترجیح ملک میں تعلیم کو عام کرنا تھا، انہوں نے پوری دنیا سے مسلمان اور غیر مسلم ماہرین کو بلایا، بڑے بڑے تعلیمی ادارے قائم کئے اور اس طرح ملک کو ترقی کے راستہ پر ڈالا کہ کہا جاسکتا ہے کہ آج یہ ملک مسلمان ملکوں کے لئے ایک نمونہ اور آئیڈیل کا درجہ رکھتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں، ان کی ترقی کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں : ایک دین پر استقامت اور عمل ، دوسرے : تعلیم میں محنت اور آگے بڑھنے کی کوشش ، جس روز امت اس راز کو سمجھ لے گی ، اسی دن اس کی ترقی اور سرفرازی کا سفر شروع ہوجائے گا اور جب تک وہ اس حقیقت سے نا آشنا اور اس پر عمل سے غافل اور بے توجہ رہے گی ، تعداد کتنی ہی ہوجائے وہ ذلت ورسوائی کے گڑھے سے باہر نہیں آسکے گی ؛ کیوں کہ سونے کا ایک ذرہ بھی مٹی کے ڈھیر سے اور ہیرے کا ایک ٹکڑا بھی پتھروں کے پہاڑ سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے!!

۴،۱۱/ دسمبر ۲۰۰۹ء